اصول تعلیم

مصنفہ

خواجہ غلام السیدین بی۔ اے۔ ایم۔ ایڈ

مشیر تعلیمات حکومت بمبئی

سابق پروفیسر تعلیمات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ و ناظم تعلیمات

(ریاست کشمیر)

مع مقدمہ

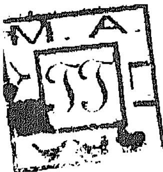
از

ڈاکٹر سر سید راس مسعود، ایل۔ ایل۔ ڈی، ڈی۔ لٹ

الہ آباد:

ہندستانی اکیڈیمی یو۔ پی

۱۹۴۹ء



Published by
THE HINDUSTANI ACADEMY, U.P.
ALLAHABAD.



THIRD EDITION :
Price Rs. 6



Printed at
THE MODERN PRINTING WORKS,
ALLAHABAD.

انتساب

میں اپنی اِس تصنیف کو اپنے والد ماجد
آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم

نام نامی سے معنون کرتا ہوں جنھوں نے اپنی تمام عمر اُن
ے خیالات اور قدروں کی اشاعت میں صرف کی جن پر
، زندگی کی صحت اور بقا کا انحصار ہے اور جن کی
تبلیغ، تعلیم کا مقدس فرض ہے -

نہاں در سینۂ ما عالمے ہست
بخاک ما دلے، در دل غمے ہست
ازاں صہبا کہ جان ما برافروخت
ہنوز اندر سبوے ما نمے ہست

غلام السیدین

فہرست مضامین

صفحہ

مقدمہ

(از جناب نواب مسعود جنگ بہادر ڈاکٹر سر راس مسعود صاحب
ایل - ایل - ڈی - ڈی لٹ؛ بیرسٹر ایٹ لا - سابق وائس چانسلر
علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

اس کتاب کے فاضل مصنف کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس نے ہمیشہ ادب کی اور بالخصوص اردو ادب کی عظیم خدمت کی ہے - خواجہ غلام السیدین صاحب کی رگوں میں الطاف حسین حالی مرحوم کا خون ہے اور یہ اسی کا فیض ہے کہ اِن کی تحریر میں وہی سادگی اور صداقت پائی جاتی ہے جس نے حالی کی بیش بہا تصانیف کو اردو کے آئندہ ادیبوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بنا دیا ہے -

یہ ایک نہایت دل خوش کن شگون ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے ہونہار نوجوانوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے جنہوں نے مغرب میں تعلیم پانے کے بعد اُردو زبان کی کم مائگی کو دور کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور جن کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ اب اردو میں بھی اِس قسم کی کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں جن پر ہر ملک فخر کر سکتا ہے - میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ تعلیم اور اصول تعلیم پر خواجہ غلام السیدین صاحب کی اس کتاب سے بہتر آج تک کوئی کتاب اُردو زبان میں نہیں لکھی گئی - یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو ہم فخریہ ان مستند کتابوں کے مقابلے میں

پیش کر سکتے ہیں جو دوسرے ممالک کی زبانوں میں اس مضمون پر لکھی جا رہی ہیں - جہاں تک تعلیم کے اصولی مباحث کا تعلق ہے مصنف نے ہر پیچیدہ مسئلے کو نہایت قابلیت کے ساتھ ایک سلیس زبان میں عام فہم بنا کر ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ہے - اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ اِس زمانے میں جب کہ ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے تعلیم و تربیت اور تعلیم و تمدن کا گہرا باہمی تعلق از سر نو سمجھا جائے اور یہ بتایا جائے کہ تعلیم بغیر تربیت کے ملک کے لیے مفید نہیں ہو سکتی - مجھے لائق مصنف کی اس رائے سے بھی پورا اتفاق ہے کہ کوئی نظام تعلیم صحیح معنوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا جس نے اپنے تمدنی ماحول اور تاریخی روایات کو نظرانداز کر دیا ہو -

میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا عقیدہ ہے کہ ہمارے ملک میں صحیح تعلیم اُس وقت تک نہیں پھیل سکتی جب تک کہ ہم اپنی مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم نہ بنائیں - موجودہ نقالی سے جو نقصان ہو رہا ہے وہ اظہرمن‌الشمس ہے اور اسی کا ایک بڑی حد تک یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے مدرسوں کے پڑھے لکھوں میں غور و فکر کا مادہ کم ہوتا جاتا ہے - ان کی زیادہ‌تر قوت نقال بننے میں صرف ہوتی ہے اور بجاے اس کے کہ ہماری قومی زندگی کی جڑیں زیادہ مضبوط ہوں اور سچی خودداری میں اضافہ ہو' دونوں میں کمزوری بڑھتی جاتی ہے - موجودہ غلط طرز تعلیم نے ایک ایسا فرقہ ہمارے ملک میں پیدا کرنا شروع کر دیا تھا جس کو نہ اپنی قومی روایات سے کوئی دلچسپی تھی' نہ ملک کے عام باشندوں کے ساتھ ہمدردی اور

تعلق - مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک
کثیر تعداد اپنی مادری زبان کو بگاڑ کر بولنا اپنے لئے باعث
فخر سمجھتی تھی - شکر ہے خدا کا کہ وہ زمانہ اب ختم ہوتا
جا رہا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جو خود اپنی
تہذیب اور روایات کی عزت نہیں کرتے ' ان کی عزت غیر قومیں
بھی نہیں کرتیں -

اس کتاب کا وہ حصہ جس کا تعلق فن معلمی سے ہے
ہمارے ملک کے اساتذہ کے لئے بےحد مفید ثابت ہوگا - اس
کے پڑھنے سے اُن کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ آج کل
دنیا میں مختلف ممالک کس قسم کی تعلیمی جد و جہد
میں مشغول ہیں اور مختلف قوموں نے اپنا تعلیمی
نصب‌العین کیا قرار دیا ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے کیا
کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں - یہ کتاب ایک ایسے
وقت میں شائع ہو رہی ہے جب ہمارے ملک کے سیاسی
ماحول کے بدلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں - مجھے یقین
ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے ہر شخص کی معلومات میں
اضافہ ہوگا ' چاہے اس کا تعلق تعلیم سے ہو یا سیاست سے - اگر
ان اصولوں پر عمل کیا گیا جن کو اس کتاب میں سمجھانے
کی کوشش کی گئی ہے تو یہ ہمارے ملک کے لئے ایک نیک
فال ہوگی' اور وہ زمانہ جلد آجائے گا جب ہم یہ کہہ سکیں گے
کہ تعلیمی دنیا میں ہمارا ملک بھی کوئی وقعت رکھتا ہے -

بھوپال — سید راس مسعود
جنوری سنہ ۱۹۳۵ع

اصول تعلیم

دیباچۂ طبع اول

اُردو زبان میں فن تعلیم پر کتاب لکھنے کے لیے کسی معذرت کی ضرورت نہیں - یہ اُن علوم میں سے ہے جن پر ہماری زبان میں بہت ہی کم کتابیں لکھی گئی ہیں حالانکہ نظری اور عملی اہمیت کے اعتبار سے اس کو انسانی علوم کی صف اول میں جگہ دینی چاہیے - شاید فی الحال ہمارے پاس چند ترجموں ' چند مختصر تالیفوں اور نارمل اسکولوں کی درسی کتابوں کے سوا تعلیمی لٹریچر میں کچھ بھی نہیں - ترجموں میں سب سے مقتدر اور مستند کتاب ہربرٹ اسپنسر کی " فلسفۂ تعلیم " ہے - کچھ رسالے اخلاقی تعلیم اور تعلیم کے بعض اور خاص مباحث پر لکھے گئے ہیں - کچھ مفید اور قابل قدر مواد اخباروں اور رسالوں وغیرہ کے متفرق مضامین میں ملتا ہے مثلاً سر سید احمد خاں کے مضامین تہذیب الاخلاق کی جلدوں میں یا اُن خطبوں میں جو وقتاً فوقتاً ملک کی تعلیمی انجمنوں کے اجلاسوں میں دیے گئے ہیں - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے گزشتہ چالیس سالانہ جلسوں کے خطبات صدارت کو " خطبات عالیہ "

کے نام سے دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے جن سے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور اہم تعلیمی مسائل پر روشنی پڑتی ہے - نارمل اسکولوں کی درسی کتب عامی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں - بس یہ ہے ہمارا کل تعلیمی سرمایہ ! لہذا جہاں اِس کتاب کی تصنیف کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی اکیڈیمی نے مجھے اِس کو لکھنے کی دعوت دی وہاں دوسری وجہ یہ احساس ہے کہ موجودہ زمانے میں ہر تعلیمی تصنیف ایک نہایت شدید ضرورت کو پورا کرتی ہے اور شعبۂ تعلیم سے دل‌چسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان میں تعلیمی تصانیف کا اضافہ کر کے اِس کی موجودہ کم‌مائگی کو دور کریں -

اِس کتاب کا مقصد اور نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اِس کے مضامین کی تقسیم کا اصول بیان کر دیا جائے - کتاب کے پہلے حصے میں میں نے تعلیم اور تمدن کے باہمی تعلق سے بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ تعلیم کا رشتہ تمدن کے مختلف شعبوں سے کیا ہے اور وہ کس طرح اُس پر اثرانداز ہوتے ہیں - فن تعلیم کے بہترین ارباب فکر کا نظریہ یہی ہے اور یہی رہا ہے کہ ہم تعلیم کے کسی مسئلے کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک اُس کا مطالعہ اُس کے تمدنی ماحول میں نہ کیا جائے - لہذا اِس حصے میں میں نے اُن تعلیمی مسائل سے بحث کی ہے جو موجودہ تمدنی اداروں کے مطالبات اور خصوصیات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ خانگی زندگی اور درسی زندگی کا کیا تعلق ہے - افراد کی سیرت اور شخصیت پر اجتماعی زندگی

کیا اثر ڈالتی ہے - ہمارے نظام معاشی نے ماہرین تعلیم اور تعلیم گاہوں کے لیے کیا جدید اور اہم مسائل پیدا کر دیے ہیں - حکومت کا تعلق تعلیم کی نوعیت اور اُس کے نظم و نسق سے کیا ہے اور ملک کی موجودہ سیاسی حالت میں کس قسم کی تعلیم درکار ہے؟ مختصر یہ کہ اِس حصے میں تعلیم کے وسیع تر علائق اور نتائج سے بحث کی گئی ہے تاکہ بالخصوص معلموں کو یہ محسوس ہو جائے کہ ان کے کام کی اہمیت اور حیثیت محض ایک اصطلاحی فن کی نہیں بلکہ اُس کے اثرات بہت دور رس ہیں اور اُس پر تمدنی زندگی کے تمام شعبوں کا رد عمل ہوتا رہتا ہے -

دوسرے حصے میں "درسی تعلیم" کے عنوان کے ماتحت اُن مباحث کو پیش کیا گیا ہے جو بالعموم رسمی طور پر عقلی اور دماغی تربیت کے سلسلے میں اٹھائے جاتے ہیں مثلاً ذہنی تربیت، تدوین نصاب، جسمانی تربیت وغیرہ - لیکن ان ابواب کے ذیل میں "درسی تعلیم" کا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ اُستادوں کے عام نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہے کیونکہ برخلاف اِس مفہوم کے جو مدرسے کے متعلق اُن کے ذہن میں ہے اِس میں "مدرسۂ عمل" کے اصولوں کی تشریح کی گئی ہے اور علم اور زندگی، علم اور عمل، رسمی مضامین اور عملی مشاغل اور دستکاریوں اور ذہنی اور جسمانی تربیت کے تعلق اور وحدت کو ظاہر کیا گیا ہے اور تعلیم کے مختلف شعبوں کے درمیان جو فصل اور تناقض قائم ہو گیا ہے اُس کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے - یعنی جام کہن میں مے نو پیش کی گئی ہے کہ وہ مے کہن سے بہتر ہے -

دوسرے حصے کا تعلق اخلاقی اور معاشری تربیت کے اصولوں سے ہے لیکن ابتدا ہی میں یہ بات ظاہر کر دی گئی ہے کہ عقلی اور اخلاقی تربیت کے اصولوں میں کوئی نقیض یا مستقل فصل نہیں ہے بلکہ یہ تقسیم محض اظہار خیال کی سہولت کی خاطر کی گئی ہے - کیونکہ دراصل تعلیم کا موضوع ' خواہ تعلیم دماغی ہو یا جسمانی ہو ' اخلاقی ہو یا معاشری ' بچے کی ذات ہے جو ایک سالم اور واحد ہستی ہے اور تمام اثرات جو اُس پر ڈالے جاتے ہیں اُس کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں - اِس لیے اِس حصے میں پہلے اخلاق کا حقیقی مفہوم واضح کیا گیا ہے تاکہ اُس کی پوری وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ ہو جائے اور اُس کا کوئی تنگ اور یکطرفہ مفہوم نہ لیا جائے - اس کے بعد یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ اخلاق کا تعلق عمل سے اور عقلی تربیت سے کیا ہے اور مدرسے کے مجموعی نظام کا ہر جزو کس طرح اخلاقی تربیت میں معین یا خارج ہوتا ہے - اِس سلسلے میں نصاب' طریقۂ تعلیم ' نظام ضبط و تادیب ' انعام اور سزا اور معلم کی شخصیت کے اثرات کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جس وقت تک ان تمام عناصر کی تنظیم بعض خاص اصولوں کے تحت میں نہ کی جائے تاکہ اُس کا مجموعی اثر طلبہ پر ہم آہنگ ہو کر پڑے ' مدرسہ موثر طریقے پر اخلاقی اور معاشری تربیت کا مرکز نہیں بن سکتا - آخری باب میں اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ طلبہ کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کس طرح کرنی چاہیے تاکہ ہمارے مدرسوں سے جو نوجوان تعلیم پا کر

نکلیں وہ اپنی ذات میں اہم ترین اور مفید ترین اخلاقی صفات اور اقدار کے حامل ہوں -

میں نے اِس کتاب میں بالعموم تمام تعلیمی بحثوں کو مدرسے کی تعلیم تک محدود رکھا ہے ۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی مسائل کو اِس میں شامل نہیں کیا - کیونکہ اول تو اِس ایک کتاب میں وہ تمام مسائل سما نہیں سکتے - دوسرے تعلیمی اصولوں کے تعین اور توضیح کے لئے سب سے زیادہ موزوں میدان مدرسے کی تعلیم کا ہے جہاں طلبہ کی جبلتوں اور نشو و نما کا مطالعہ زیادہ مکمل اور واضح طریقے پر کیا جا سکتا ہے اور اُن کی تربیت پر فیصلہ‌کن اثر ڈالا جا سکتا ہے - کالج اور یونیورسٹی میں پہنچ کر مرکز ثقل تبدیل ہو جاتا ہے - تربیت کی ذمہ‌داری بہت زیادہ حد تک خود طالب علم کے اوپر عائد ہو جاتی ہے اور تعلیم اور تعلیم‌گاہ کی زیادہ توجہ عقلی اور ذہنی تربیت پر صرف ہوتی ہے - لیکن وہاں بھی ہم کوئی دیرپا کامیابی حاصل نہیں کر سکتے جب تک مدرسے کی تعلیم کو صحیح اصولوں پر قائم نہ کریں - اِس کتاب کا مقصد اِنہیں صحیح اصولوں کی تشریح اور توضیح ہے -

میں نے اِس کتاب کی تصنیف میں مغرب کے بہترین ماہرین تعلیم کے خیالات اور تحریری تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے - اُن کے ناموں کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ اُن کے حوالے جابجا کتاب میں موجود ہیں البتہ میں خاص طور پر امریکا کے جدید فلسفی اور تعلیم جدید کے سرگروہ پروفیسر جان ڈیوئی کا مرہون منت ہوں جن کے

تعلیمی خیالات نے مجھ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور جن کے تعلیمی نقطۂ نظر سے بڑی حد تک مجھے اتفاق ہے - لیکن میں نے اِس کتاب میں خود کو کسی خاص مصنف یا ماہر تعلیم کے خیالات کا پابند نہیں بنایا بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ جدید تعلیمی خیالات پر ہندوستان کی مخصوص ضروریات اور حالات کے نقطۂ نظر سے تنقید کروں اور انہیں پیش نظر رکھکر اُن سے استفادہ کروں - کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی مخصوص روایات، اپنی تہذیب و تمدن کے مطالبات، اپنی نفسی زندگی اور اپنے فلسفے کو پس پشت ڈال کر اندھادھند کسی دوسرے ملک کی تقلید کریں گے تو ہرگز منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتے - تعلیم کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائیوں میں پنہاں ہیں اور قومی زندگی عبارت ہے ان تمام اثرات اور عناصر سے جن کا تدریجی ارتقا ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے - اِس لیے ہم کسی نظام تعلیم کو نہ پرانے لباس کی طرح بےپروائی سے اُتار کر پھینک سکتے ہیں نہ نئے لباس کی طرح بےتکلفی سے پہن سکتے ہیں - وہ ایک نفسی اور روحانی نظام ہے جو ایک پودے کی طرح آہستہ آہستہ قومی زندگی کی سر زمین سے اُگتا ہے اور اُس کی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے -

آخر میں مجھے اپنے فاضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (ناظم اُردو اکیڈمی جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی) کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اِس کتاب کے مسودے کو تمام و کمال پڑھا اور اُس کی زبان میں جابجا اصلاح اور ترمیم کی - اگر وہ اِس ذمہ‌داری کو اپنے سر نہ لیتے تو مجھے کتاب کی اشاعت

میں بہت تامل ہوتا - علاوہ اُن کے مجھے کتاب کی ترتیب اور مسودے کی صفائی میں اپنی بیوی اور اپنی بہن (بیگم عابد حسین) سے بھی بہت مدد ملی جن کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے -

خواجہ غلام السیدین

دیباچۂ طبع ثالث

اس کتاب کو شائع ہوئے تیرہ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں - اس عرصے میں ہندوستان اس قدر زبردست سیاسی اور سماجی انقلاب میں سے گزرا ہے کہ اس کی وجہ سے تعلیم کے میدان میں بھی بہت سے نئے اور شدید مسائل پیدا ہوگئے ہیں - تعلیم کی بنیادی قدریں اور اصول تو آسانی سے نہیں بدلتے لیکن ان کے اطلاق کے طریقوں، ان کی اضافی اہمیت، ان کی تفسیر اور تعبیر میں حالات کے بدل جانے کی وجہ سے ضرور تبدیلی ہو جاتی ہے - اس کتاب میں تعلیم اور تمدن کے باہمی تعلق، درسی تعلیم کے طریقوں اور اخلاقی اور معاشری تربیت کے اصولوں کے متعلق میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی صحت میں فرق نہیں آیا - لیکن ہر سمجھدار اور فرض شناس معلم کا فرض ہے کہ وہ ان کو برتنے میں ان جدید تقاضوں اور تحریکوں کو پیش نظر رکھے جو گزشتہ بیس سال میں پیدا ہوئی ہیں - ۱۹۳۵ء میں ہم آزادی کا خواب دیکھتے تھے، اس کے لیے جد و جہد کرتے تھے لیکن وہ ایک امکان بعید معلوم ہوتی تھی - آج ہم سیاسی آزادی حاصل کر چکے ہیں اور وہ ایک موجود حقیقت ہے - اُسے

وقت ہمارے سماجی نظام کی بنیاد زیادہ تر روایت پر اور سیاسی نظام کی بنیاد شخصی اور غیر ملکی اقتدار پر تھی۔ آج ہم ملک میں جمہوریت کی بنیادیں ڈالنے اور ایک بہتر اور عادلانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت ہم اپنی بدحالی اور مصیبتوں کے لیے ایک غیر ملکی حکومت کو ذمہ دار قرار دیتے تھے، اب ہمیں خود اپنی کوششوں سے اپنی تقدیر کو بنانا ہے اور اگر اس میں ہمیں کامیابی نہ ہوگی تو ہم خود ہی مورد الزام ہوں گے۔ مختصراً یہ سمجھ لیجیے کہ اب ہمیں آزادی کی ساری مبارک لیکن کٹھن ذمہ داریوں کو اٹھانا ہے۔ ان ذمہ داریوں کا اٹھانا بہر حال بہت مشکل ہے لیکن جب اس کے ساتھ وہ تمام اسباب اور واقعات بھی شامل ہوجائیں جو گزشتہ چند سال سے پیش آتے رہے ہیں اور جن کی وجہ سے ملک کا سماجی، اقتصادی اور اخلاقی نظام بڑی حد تک متزلزل ہو چکا ہے تو تعلیم اور معلموں کی ذمہ داری بےحد بڑھ جاتی ہے اور انھیں پورے خلوص اور انہماک کے ساتھ ان تمام تدبیروں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن کے ذریعے وہ نئی نسل میں انسانیت، رواداری، باہمی میل جول، امن پسندی، جرأت اور خودداری کی وہ صفات پیدا کرسکیں جن پر اس کتاب میں بار بار زور دیا گیا ہے اور جن کے بغیر ایک آزاد جمہوری ریاست کا قیام ہی ناممکن ہے۔ مہاتما گاندھی کی روشن ضمیری نے اس صورت حال کو سمجھ کر بنیادی تعلیم کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن اب ہمیں اس کے اصولوں اور زمانے کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر پورے تعلیمی نظام کو، ابتدائی مدرسے سے

یونیورسٹی تک ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے - آج اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ملک میں بہت سی تحریکیں اور کوششیں جاری ہیں - مگر یہ مسئلہ اس قدر شدید اور فوری اہمیت رکھتا ہے کہ اس کو دراصل تمام دوسری تعمیری تحریکوں پر مقدم سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تک بہتر تعلیم کے ذریعے ایک بہتر نسل کی تربیت نہ ہوگی ' ان تمام تحریکوں کی کامیابی ناممکن ہے - زندگی کے ہر شعبے میں انسان ہی کی ذات ترازو کا کام کرسکتی ہے -

بمبئی

دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء خواجہ غلام السیدین

باب اول

تعلیم، تمدن اور مدرسہ

موضوع کا تعین

ہمارا مقصد اس کتاب میں یہ ہے کہ تعلیم کے بنیادی اُصولوں اور نظریوں پر بحث کریں اور اِس بحث کے ضمن میں اپنے ملک کے موجودہ نظام تعلیم کے نقائص کو ظاہر کرکے اِس کی اصلاح کی تجاویز پیش کریں - یہ کام بہت مشکل اور بہت وسیع ہے اور ہم اس کے تمام پہلوؤں پر اس کتاب کے محدود دائرے میں نظر نہیں ڈال سکتے - موجودہ نظام تعلیم کی تنقید بجائے خود ایک مستقل بحث ہے جس کے لیے کئی جلدیں درکار ہیں کیوں کہ اس فرض کو انجام دینے کے لیے ہمیں اس نظام کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ کرنا ہوگا تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ اس کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور کس طرح اس میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں ہوتی رہیں جن کے مجموعی اثر سے اس نے موجودہ شکل اختیار کی - اس کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو پرکھنے کے لیے ہمیں اپنے ملکی تمدن کا مطالعہ کرکے ایک معیار قائم کرنا پڑے گا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ہماری تعلیم کس حد تک ہماری قومی ضرورتوں اور آرزوؤں کے ساتھ ہم‌آہنگ ہے

اور کہاں تک ان کے لیے نامناسب ہے - اسی طرح تعلیمی اصلاح کا مسئلہ بھی اتنا سہل اور سادہ نہیں کہ اس کا حل کوئی شخص وثوق کے ساتھ پیش کرسکے - اگر خرابیوں کو سمجھنے کے لیے دقت نظری ' وسعت خیال ' تاریخی واقفیت اور تمدن کا مطالعہ درکار ہے تو اصلاحی تجاویز پیش کرنے کے لیے علاوہ ان تمام چیزوں کے ایک ایسے تخیل کی ضرورت ہے جو ایک آنکھ سے ماضی اور حال کے گوناگوں مناظر کا جائزہ لے سکے اور دوسری سے مستقبل کے دھندھلکے کی سیر کرسکے - یعنی دوش و امروز کے آئینے میں فردا کو دیکھ سکے - اس کتاب کے محدود دائرے میں ہمارا مقصد نہ تو موجودہ نظام تعلیم کا مفصل تنقیدی تجزیہ ہے نہ کوئی مکمل اصلاحی پروگرام پیش کرنا جس پر فوراً عمل کیا جا سکے - ہم زیادہ تر ان مستقل اور ہمہ گیر اصولوں سے بحث کریں گے جن کے مطابق ہر نظام تعلیم کی تشکیل ہونی چاہیے اور یہ دکھائیں گے کہ اس عمل تشکیل میں ہر ہر قدم پر تعلیم کو تمدن اور انسانی زندگی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور تعلیم کا نصاب ' اس کے طریقے اور عام نظم و نسق یہ سب چیزیں اسی حالت میں درست ہو سکتی ہیں جب وہ تمدن و معاشرت کی کسوٹی پر کسی جائیں - جہاں تعلیم و تمدن کا یہ رشتہ ٹوٹا تعلیم کا اثر بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے اور تمدنی ترقی کے راستے میں بےشمار رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں - ان امور پر غور کرنے کے دوران میں توضیح اور مثال کے طور پر ہم اپنے موجودہ نظام کا ذکر کریں گے اور ضمناً یہ بھی بتائیں گے کہ وہ کس لحاظ سے ناقص ہے اور کس طرح اس کے نقائص دور کیے جاسکتے ہیں -

لیکن ظاہر ھے کہ اس قسم کی بحثوں میں جو زیادہ‌تر نظری اور اصولی ھیں ھمیں مخصوص اور معین تعلیمی طریقوں سے سروکار نہیں ھوگا بےشک جو طریقے دوسرے ملکوں میں یا کہیں کہیں ھمارے ملک میں کامیاب ثابت ھوئے ھیں ان کا ھم ذکر کریں گے لیکن یہ یاد رکھنا چاھیے کہ تعلیم میں جو ایک زندہ فن ھے اور جس کا موضوع ذی روح اور نمو پزیر افراد ھیں، کوئی خاص طریقہ ایسا نہیں جو ھر حالت میں کام آسکے - اس میدان میں کامیاب ھونے کے لیے عام اصول تعلیم سے واقفیت اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ھے تاکہ معلم اپنے گرد و پیش کے خاص حالات کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں تعلیم اور نظام تعلیم کے مناسب طریقے اختیار کرسکے -

فرد اور معاشرے کا تعلق

چونکہ تعلیم کا موضوع انسان کی سیرت اور اس کی زندگی کی تشکیل ھے اس لیے اس کے مطالعے کے لیے وسعت نظر کی خاص طور پر ضرورت ھے - انسان کی زندگی کی مثال سمندر کی سی ھے جس کو لکیریں کھینچ کر یا لکڑی کے تختے لگا کر مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم نہیں کیا جا سکتا کہ ایک حصے کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ھو - جس طرح سمندر کی ھر موج اُٹھتی ھے اور روانی کے ساتھ پانی کی سطح پر پھیلتی ھوئی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ھے، کہیں دوسری موجوں کے ساتھ مل کر طوفان بپا کردیتی ھے اور کہیں ھلکے سے تھپیڑے سے کشتی کو آگے بڑھا دیتی ھے، اسی طرح جو اثر انسان کی شخصیت یا سیرت پر ڈالا جاتا ھے اس کے حدود متعین نہیں کیے جا سکتے - اول تو خود انسان کی شخصیت میں جسم

اور دماغ ' عقل و روح اور حیوانی جبلتیں وغیرہ سب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ھیں اور گرد و پیش کے حالات سے ایک ساتھ متاثر ھوتی ھیں - دوسرے انسان تنہا بطور ایک فرد واحد کے زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ اور افراد کے ساتھ مل جل کر رھتا ھے اور معاشری کار و بار اور مشاغل میں حصہ لیتا ھے - معاشرت کا تعلق ھماری زندگی سے اس قدر گہرا اور لازمی ھے کہ انسانوں کی وہ حالت جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ معاشرے کی شکل میں وابستہ نہ ھوں ھمارے تصور سے باھر ھے - سچ پوچھیے تو معاشرے کا رکن ھونا ھی انسان کو انسان بناتا ھے - اس کے بغیر اس کی ذھنی اور روحانی قوتوں کی پوری نشو و نما ھو ھی نہیں سکتی - اگر ھم اپنے مشاغل کا تجزیہ کریں تو ھمیں معلوم ھوگا کہ ان کا مقصد اور معنی سمجھنے کے لئے ھمیں ھر قدم پر معاشرے کو پیش نظر رکھنا ضروری ھے - ھماری تجارت ' ھماری صنعت و حرفت ' ھمارا نقل و حمل ' غرض وہ تمام کام جن کے ذریعے ھم اپنی زندگی کی ضروریات بہم پہنچاتے ھیں افراد کے اشتراک عمل پر منحصر ھیں - اگر لوگ مل جل کر ان کاموں کو انجام نہ دیں تو ایک دن میں معاشرے کا بنا بنایا نظام درھم برھم ھو جائے - کارخانے کے مزدوروں کی ایک معمولی سی ھڑتال اس حقیقت کو نہایت موثر انداز میں ھم پر واضح کردیتی ھے - لیکن فرد اور جماعت کا تعلق اس سے بھی زیادہ گہرا ھے - انسان کی ذھنی اور روحانی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی ھے جس کے لحاظ سے بہ ظاھر وہ بالکل تنہا ھوتا ھے اور صرف اپنے ذاتی خیالات ' جذبات اور عقائد کی دنیا میں رھتا ھے جہاں کسی دوسرے شخص کا گزر نہیں -

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو "روح کی اس خوفناک تنہائی" میں بھی ہم حقیقت میں تنہا نہیں ہوتے - ہماری اندرونی زندگی بھی اپنی تشکیل کے لیے دوسرے لوگوں کے خیالات جذبات اور معاشری تعلقات کی محتاج ہے اور ہمارے دل کے پوشیدہ‌ترین خیالات کا نظام بھی محسوس یا غیر محسوس طریقے پر ان تجربات اور احساسات سے وابستہ ہے جن کو ہم بغیر دوسرے لوگوں کی مدد کے حاصل نہیں کر سکتے - اسی وجہ سے شاعر نے کہا ہے کہ :—

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں!

معاشری زندگی کا مفہوم

ہم نے مندرجۂ بالا عبارت میں "افراد کی زندگی اور معاشرے کی زندگی" کے الفاظ استعمال کیے ہیں - یہ الفاظ کسی قدر تشریح‌طلب ہیں - زندگی سے یہاں ہماری مراد صرف وہ جسمانی زندگی نہیں جس کا مدار سانس کی آمد و رفت پر ہے جو ہم میں اور تمام حیوانوں میں مشترک ہے - یہاں ان الفاظ کے مفہوم میں افراد اور جماعتوں کے وہ تمام تجربات ' کارنامے ' ذہنی اور علمی کمالات اور سیرت کی خصوصیات شامل ہیں جو ہر فرد اور ہر جماعت کو باقی تمام افراد اور جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں - اس لیے جب ہم کسی خاص معاشرے یا کسی جماعت کی زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو اُس سے ہماری مراد ہوتی ہے اس کا رسم و رواج ' مذہب ' علوم و فنون ' اقتصادی اور سیاسی مشاغل ' خانگی زندگی کے اصول اور قاعدے جن پر نہ صرف اس کی حیات محض کا دار و مدار ہے بلکہ

وسیع‌تر معنی میں اس کی زندگی کی تکمیل اور ترقی کا بھی انحصار ہے - ہر جماعت باوجود افراد کے فنا ہو جانے کے اس طرح قائم رہتی ہے کہ معینہ تدبیروں کے ذریعے سے اپنے سارے ذہنی اور تمدنی سرمائے کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی رہے - اس کی روز افزوں ترقی کا راز یہی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے تمام علمی اور غیرعلمی مشاغل میں پوری جد و جہد سے کام لے اور دوسری طرف ایسے ادارے ترتیب دے جن کے ذریعے سے ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسلوں کے خزانوں پر قابض ہو کر اُن کی مدد سے ترقی کے میدان میں اور آگے قدم بڑھا سکے -

غرض معاشرے کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے قیام اور اپنی بقا کے لیے ایسی تدابیر عمل میں لائے جن سے افراد سہولت اور کامیابی کے ساتھ اتفاق و اتحاد کی زندگی بسر کر سکیں - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے چاروں طرف ایسے نظام اور ادارے قائم ہیں جن میں شریک ہو کر ہم اپنی قوتوں کو مناسب اور موثر طریقے پر استعمال کرتے ہیں اور اپنی محنت اور جد و جہد کے نتائج کو مستقل شکلوں میں محفوظ رکھتے ہیں - یہ ادارے کسی عارضی مقصد یا مصلحت کی خاطر قائم نہیں ہوئے بلکہ انسان کی فطری ضرورتوں پر مبنی ہیں - اس میں شک نہیں کہ بہت سی مصلحتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کی اہمیت کو اور نمایاں کر دیتی ہیں - لیکن بغیر فطرت انسانی کے تقاضے کے یہ انتظامات، اگر کیے بھی جاتے، تو قائم نہ رہتے - مثال کے طور پر خاندان کو لیجیے جو تمام عمرانی جماعتوں میں سب سے

قدیم اور سب سے زیادہ پائدار جماعت ھے، اس کی ابتدا یوں نہیں ھوئی کہ افراد نے تجربے سے معلوم کیا ھو کہ خاندان کی زندگی بسر کرنے میں خاص فوائد اور آسائشیں ھیں جو تنہائی کی زندگی میں ممکن نہیں اور اس تجربے کی بنا پر انھوں نے اپنی تنظیم، خاندانوں کی شکل میں کر لی ھو - بلکہ واقعہ یہ ھے کہ خاندان کی بنیاد اس فطری محبت پر قائم ھے جو قدرتاً والدین کو اپنی اولاد سے ھوتی ھے اور جس کا اظہار حیوانوں کی زندگی میں بھی ھوتا ھے - ھر بچہ جب پیدا ھوتا ھے تو بالکل بےکس اور بےبس ھوتا ھے - اس کی زندگی ھر قدم پر والدین کی خبرگیری اور نگہداشت کی محتاج ھے - اس خبرگیری کا مستقل انتظام کرنے کے لیے قدرت نے والدین میں محبت کا جذبہ ودیعت کیا ھے - جو ان کو اس بات پر مجبور کرتا ھے کہ وہ بچے کو ھر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں اور خود تکلیفیں جھیل کر اُس کو آرام پہنچائیں - بنی نوع انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے قدرت کا یہ انتظام لازم تھا - اُس کے بغیر انسانی زندگی اور تمدن کی موجودہ تشکیل ممکن ھی نہیں تھی - لیکن خاندانی زندگی کا محض یہی فائدہ نہیں کہ بچوں کی پرورش کی جائے اور ایک نسل دوسری نسل کو زندہ رکھنے کا انتظام کرے - عمرانی زندگی کا ایک عام قاعدہ یہ ھے کہ جب کوئی ادارہ کسی خاص مقصد کے لیے قائم ھوتا ھے تو اس کی جد و جہد کے دوران میں بہت سے نئے اور ضمنی لیکن نہایت اھم نتائج پیدا ھو جاتے ھیں - یہی خاندان جو ابتدا میں محض بچوں کی جسمانی خبرگیری کا کام کرتا تھا رفتہ رفتہ ان کی تمدنی، اخلاقی اور

اقتصادی تربیت کا گہوارہ بن جاتا ھے - اس کے مقاصد زیادہ وسیع ، اس کے باھمی روابط زیادہ مستحکم اور اس کے فرائض زیادہ متنوع ھو جاتے ھیں - اس کا کام محض یہی نہیں رھتا کہ حیات موجودہ کو قائم رکھا جائے - بلکہ اسے یہ آرزو پیدا ھوتی ھے کہ حیات برتر کی بنیاد ڈالی جائے - خاندان کے افراد آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرتے ھیں اور کاموں کو تقسیم کرکے اپنی کارکردگی کو بڑھاتے ھیں - وہ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لیتے ھیں اور ان کو نہ صرف وہ کام اور وہ عادتیں سکھاتے ھیں جن کی مدد سے انہیں آئندہ چل کر اپنی روزی کمانی ھوگی - بلکہ عملی مثال اور زبانی تعلیم کے ذریعے ان اصول اور اخلاق سے بھی آگاہ کرتےھیں جو اس خاندان میں چلے آتے ھیں اور کوشش کرتے ھیں کہ ان کی عمدہ رسوم و روایات اور پسندیدہ اصول زندگی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ھو کر مستقل صورت اختیار کر لیں - اسی وجہ سے خاندان تعلیم و تربیت کا سب سے قدیم اور غالباً سب سے زیادہ اثرآفریں مرکز ھے اور تعلیمی مسائل کو سمجھنے کے لیے اس کی اھمیت کو اچھی طرح ذھن نشین کرنا ضروری ھے - ھم اس مسئلے پر زیادہ تفصیل کے ساتھ ایک آئندہ باب میں بحث کریں گے - یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ھے کہ کس طرح ایک معاشری ادارے کا ، جو کسی محدود اور مخصوص مقصد کے لیے قائم ھوتا ھے ، حلقۂ عمل وسیع ھو جاتا ھے - بعض لوگوں نے اس خیال سے اختلاف کیا ھے کہ انسان بالطبع معاشرت پسند ھے اور دوسرے افراد کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنا اس کی فطرت کا اٹل قانون ھے - ان کا خیال ھے کہ ابتداً

میں انسان بھی بعض جانوروں کی طرح تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے - لیکن رفتہ رفتہ ان کو عقل اور تجربے کی مدد سے معاشری زندگی کے فوائد کا احساس ہوا ، اور انھوں نے مختلف معاشرتی ادارے قائم کیے - اس نقطۂ نظر کو امریکا کے دو مفکرین ڈیلے (Dealey) اور وارڈ (Word) نے اپنی کتاب " درس عمرانیات " (Text Book of Sociology) میں پیش کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" انسان بالطبع معاشرت پسند نہیں ہے - معاشرہ اُس کی عقل کی جد و جہد کا نتیجہ ہے اور رفتہ رفتہ اس کے دماغی ارتقا کے ساتھ صورت پذیر ہوا ہے - بہ الفاظ دیگر ، معاشرے کی بنیاد اِس طرح پڑی کہ انسان نے اس کے فوائد کو محسوس کیا اور جوں جوں یہ فوائد عقل پر ظاہر ہوتے گئے (عقل ہی ایک ایسی قوت ہے جو ان کو سمجھ سکتی ہے) معاشرے کا نظام ظہور میں آتا گیا "

اگر ہم اس خیال کو صحیح مانیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرہ ایک عارضی گروہ بندی کا نام ہے جو چند مخصوص فوائد کے حصول کے لیے قائم ہے اگر ان فوائد کا حاصل کرنا انسانوں کے لیے ضروری نہ رہے تو اس کا شیرازہ بکھر جائے گا اور انسان پھر اسی اِنفرادی زندگی کی طرف رجوع کریں گے جو اس خیال کے مطابق شروع میں تھی - اس نقطۂ نظر میں بڑی غلطی یہ ہے کہ اس میں عمرانی زندگی کے اصل اصول اور اُس کی تشکیل کے مختلف طریقوں میں تمیز نہیں کی گئی - ان دونوں مصنفوں نے یہ نہیں سمجھا کہ عمرانی زندگی کی بنیاد انسانی فطرت کے اس جذبے پر قائم ہے

جس کے اظہار کی سب سے زیادہ پائدار اور سادہ شکل ماں اور بچے کی محبت ہے اور جو وسیع ہو کر تمام عالم کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ مخصوص طرز جو عمرانی زندگی اختیار کرتی ہے مختلف حالات کا نتیجہ اور مختلف فوائد کے حصول کا ذریعہ ہیں -

معاشری ماحول میں تربیت نفس

بہر حال خواہ سوسائٹی کی ابتدا کسی طرح بھی ہوئی ہو اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی بنیاد نہایت مضبوطی کے ساتھ عمرانی زندگی پر قائم ہے - اور انسان بچپن ہی سے مختلف تمدنی اداروں اور نظاموں کا رکن بن جاتا ہے - کامیاب زندگی کا بڑا معیار یہی ہے کہ انسان پر ان تمام اداروں کی رکنیت کی وجہ سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کو عمدگی کے ساتھ ادا کرے اور جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان سے پورا فائدہ اُٹھائے - ان اداروں میں شرکت کر کے اپنی قوتوں کے اظہار اور نشو و نما کا موقع ملتا ہے اور وہ حقیقی معنی میں انسان بن جاتا ہے - پیدائش کے وقت آدمی محض جسمانی شکل و صورت اور جبلتوں کے اعتبار سے انسان ہوتا ہے - عمرانی اور اخلاقی اعتبار سے انسانیت کے مرتبے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص ایک مسلسل اور منظم جد و جہد کے ذریعے اپنی شخصیت کی تشکیل و تربیت کرے - اس جد و جہد کی نگرانی بچپن اور نوجوانی میں والدین اور استاد اور معاشرے کے مختلف ادارے کرتے ہیں اور بلوغ کے بعد خود انسان اپنا رہنما اور محتسب بن جاتا ہے - انسانی شخصیت کوئی بنی

بنائی چیز نہیں جو قدرت کی طرف سے ہر شخص کو ملتی ہو بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا تخلیقی کارنامہ ہے جس کو انجام دینے کے لیے فرد اور جماعت کی قوتوں میں اشتراک عمل کی ضرورت ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) جو امریکا کے سب سے بڑے تعلیمی مفکر ہیں ' اپنی کتاب '' فلسفے کی تعمیر نو '' (Reconstruction in Philosophy) میں لکھتے ہیں کہ :

'' انفرادی سیرت سے مراد ہے جدت ' ایجاد ' تدبیر کا مادہ اور اعمال و عقائد کے معاملے میں ذاتی انتخاب کی ذمہ‌داری اور یہ سب چیزیں فطرت کا عطیہ نہیں ہیں - انہیں حاصل کرنا پڑتا ہے '' ۱

اس کا آخری جملہ قابل غور ہے - شخصیت کے حصول کے لیے پیہم اور مستقل کوشش کی ضرورت ہے اور یہ اسی حد تک حاصل ہوتی جاتی ہے جس حد تک انسان کوشش کر کے اپنی جبلتوں اور صلاحیتوں کو تربیت دیتا ہے اور ان کو ہم آہنگ کر کے اپنی ذات میں قوت اور سکون اور توازن پیدا کرتا ہے - لیکن ظاہر ہے کہ انسان یہ کوشش تنہائی میں رہ کر نہیں کر سکتا - اس کی کوششوں کی جولاں گاہ بننے اور ان میں معنی اور مقصد پیدا کرنے کے لیے عمرانی زندگی کی ضرورت ہے کیونکہ اسی میں وہ مختلف قسم کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں - جو افراد کی قوتوں کو ابھارتے ہیں اور ان کو دعوت عمل دیتے ہیں - بچے کی جبلتوں کی ابتدائی شکل بالکل غیر معین ہوتی ہے - ان کو اظہار کی خواہش

۱ـــ صفحہ 9 -

ہوتی ہے لیکن فطرت کی طرف سے ان کے لیے کوئی خاص طریقے اظہار کے معین نہیں ہوتے۔ یہ بچے کے ماحول اور مشاغل پر منحصر ہے کہ وہ اپنی کسی خاص جبلت، مثلاً تجسس یا ملکیت کو کسی طریقے پر ظاہر کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بڑا ہو کر تجسس کا اظہار اس طرح کرے کہ دوسرے لوگوں کے بھید معلوم کرنے کی فکر میں رہے اور غیر متعلق اور فضول افواہوں سے دلچسپی لے۔ یا عمدہ نگرانی اور ہدایت کے ذریعے اس قوت کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ بڑا ہو کر علمی تحقیق و تفتیش اور مظاہر فطرت کے مشاہدے سے اپنی اس جبلت کو تسکین دے۔ اس کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہے کہ گھر اور مدرسے میں بچے کو ایسے مشاغل میسر آتے ہیں یا نہیں جن کے ذریعے وہ ان جبلتوں سے عمدہ اور معاشرتی نقطۂ نظر سے مفید طریقے پر کام لے سکے۔ برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی کتاب "تعلیم" میں بچوں کی جبلت کی تربیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"غرض تعلیم کا گر جہاں تک اس کا تعلق سیرت کی تشکیل سے ہے یہی ہے کہ طلبہ کو ایسے کام اور ہنر سکھائے جائیں جن کے ذریعے سے وہ اپنی جبلتوں کو بطریق احسن استعمال کر سکیں۔ اظہار قوت کی جبلت جس کو بچہ نوعمری میں بھونڈے طریقے سے نیل ریش [1] کی نقل اتار کر ظاہر کرتا ہے بڑی عمر میں زیادہ موزوں اور معقول صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے مثلاً سائنس کی

---

[1] Bluebeard — ایک فرضی شخص جس کی کہانی مشہور ہے کہ وہ بہت سی عورتوں سے شادی کرتا تھا اور انھیں قتل کر دیتا تھا۔

تحقیقات میں ' آرٹ کی تخلیق میں یا بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت میں یا اسی قسم کے اور ہزاروں مشغلوں میں سے کسی ایک میں - اگر کسی شخص کو لڑنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں آتا تو اس کے عزم للقوۃ کی تسکین صرف جنگ و جدال ہی کے ذریعے ہوسکتی ہے - برخلاف اس کے اگر اس کو اور بھی بہت سے کام آتے ہیں تو اسے ان میں اظہار خودی کر کے مسرت حاصل ہوگی ...... اگر موقع ملے تو میں مدرسے کے لڑکوں اور لڑکیوں کو طوفانی سمندروں میں جہاز چلانا ' بلندی سے پانی میں غوطہ لگانا ' موٹر اور ہوائی جہاز چلانا سکھاؤں - میں انہیں اونڈل کے پبلک اسکول کے ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کی طرح مشینیں بنانا اور سائنس کے تجربات کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالنا سکھاؤں اور جہاں تک ممکن ہو فطرت کی قوتوں کو ان کے سامنے حریف مقابل بنا کر پیش کروں " ۱

اس مقولے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ افراد کی نشو و نما میں جماعت کا حصہ کس قدر زیادہ ہے اور وہ اپنی قوتوں کو مناسب شکل اسی وقت دے سکتے ہیں جب یہ قوتیں عمرانی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر استعمال کی جائیں - نظریۂ تعلیم میں اس اصول کی بڑی اہمیت ہے اور ہم کسی آئندہ موقع پر اس کے نتائج سے بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے مدرسے کی

---

۱ - صفحہ ۱۰۵ -

عملی تعلیم میں کیسی انقلاب‌انگیز تبدیلیاں لازم آتی ہیں
اور نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں کن بنیادی تغیرات
کی ضرورت پڑتی ہے - یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اگر
کسی جماعت کو مختلف قسم کے مشاغل کے مواقع حاصل نہ
ہوں گے تو اس کی عمرانی زندگی کا دائرہ بہت تنگ ہوگا اور
اس کے افراد کی نشو و نما بھی محدود رہے گی - انسانوں کا
باہمی تعلق اور ان کی جماعت‌بندی خواہ کسی مقصد سے
اور کسی شکل میں ہو ان کے ارتقا پر اثر ڈالے بغیر نہیں
رہتی - جس حد تک ہم ان تعلقات کو جو کسی جماعت کی
رکنیت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں منظم کریں گے یہ اثر زیادہ
نتیجہ خیز اور بہتر ہوگا اور جس قدر ان کے افراد میں باہمی
اشتراک عمل ہوگا اتنی ہی ان کی زندگی میں خیال اور عمل
کی آزادی زیادہ ہوگی -

نتیجہ یہ نکلا کہ تمام عمرانی اداروں کا مقصد اعلیٰ یہ ہے
کہ وہ افراد کو وسیع‌ترین معنوں میں تعلیم دیں اور ان کی
شخصیت کی تشکیل کریں تاکہ وہ اپنی مختلف فطری قوتوں
کو اس طرح استعمال کرسکیں کہ خود ان کو بھی فائدہ پہنچے
اور معاشرے کو بھی - لیکن یہ ان اداروں کا "مقصد اعلیٰ" ہے
جس کا ہمیشہ ان کے اراکین کے پیش نظر رہنا ضروری نہیں -
ان کے فوری مقاصد جو ان کے عمل پر زیادہ موثر ہوتے ہیں
بالعموم دوسرے ہوا کرتے ہیں - مثلاً انسان جو پیشہ اختیار کرتا
ہے اس سے اس کی طبیعت اور مزاج پر اثر پڑتا ہے اور اس کی
شخصیت پر ایک خاص رنگ چڑھ جاتا ہے - یہ بھی وسیع
معنوں میں تربیت کا ایک جزو ہے لیکن یہ اثر بالعموم ان

مشاغل کا ایک ضمنی نتیجہ ہوتا ہے - ممکن ہے اس اثر کا عام رجحان یہ ہو کہ وہ شخصیت کو زیادہ مکمل اور موثر بنائے - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی امکان ہے کہ اس سے پیشہور کی دلچسپیاں زیادہ تنگ اور محدود ہو کر رہ جائیں - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اکثر صنعت و حرفت کے کاموں میں تقسیم عمل اتنی زیادہ ہوگئی ہے اور مشینوں کو اس قدر غلبہ حاصل ہو گیا ہے کہ کارخانوں کے مزدوروں میں تنگ نظری، اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہو جاتی ہے - پیشے کی طرح مذہب بھی وسیع معنی میں تربیت انسانی کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس کا اصلی مقصد اس تعلق کو جو خدا کے اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے واضح اور مستحکم کرنا ہے - غرض ان تمام اداروں میں تعلیم کا نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جو بلاواسطہ اور بالقصد اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی نشو و نما اور ان کی اخلاقی اور معاشرتی رجحانات کی تشکیل کا انتظام کرے - اور اس کی صورت یہ قرار دی گئی ہے کہ ان کو بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے ماحول میں رکھا جائے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو فعل میں لاکر دنیا کی زندگی میں کامیابی اور عمدگی کے ساتھ حصہ لے سکیں اور اسی نظام تعلیم کی مدد سے ہر نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو اپنے گوناگوں تجربات اور معلومات میں شریک کرتی رہے اور اسے آئندہ فرائض کی ادائگی کے قابل بنائے -

ماحول کی تخلیق میں انسان کا حصہ

ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کی زندگی کی طرح جماعتوں

کی زندگی میں بھی ایک تسلسل قائم ھے - جس طرح حیات حیوانی کا سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعے سے جاری رھتا ھے اسی طرح معاشرے کی زندگی کا تسلسل اس پیچیدہ نظام کے ذریعے قائم رھتا ھے جس کی طرف ھم نے اوپر اشارہ کیا ھے اور جس سے ایک نسل اپنے تمام عملی اور اخلاقی کمالات اور فنون لطیفہ کے خزانوں کو دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی ھے - ھم اپنے چاروں طرف جو ماحول دیکھتے ھیں وہ ھمارا عمرانی ورثہ ھے اور ھمیں اپنی پیشرو نسلوں سے ملا ھے - اس ماحول کے بہت سے ادارے اور عناصر تو صریحاً ایسے ھیں جو انسانی صناعی اور خلاقی کا نتیجہ ھیں - مثلاً علم و ادب کے شاھکار' فنون لطیفہ کے نمونے' عمارتیں' کارخانے اور اسی قسم کی تمام چیزیں جو انسان نے اپنی دماغی کاوش سے ترتیب دی ھیں یا ایجاد کی ھیں - لیکن وہ چیزیں بھی جو بظاھر فطرت کا عطیہ ھیں ایک حد تک انہیں انسانی کوششوں کی مرھون منت ھیں اور ان کو بھی اسی عمرانی ورثے میں شمار کرنا چاھیے - ھم اپنے گرد و پیش جو دریا اور پہاڑ' کھیت اور سڑکیں وغیرہ دیکھتے ھیں یہ سب بھی اپنی ابتدائی فطری حالت میں نہیں ھیں بلکہ انسان کی قوت تخلیق و تسخیر کے کارنامے ھیں' جس نے زمین کی شکل و صورت تک کو بدل دیا ھے اور اس کی تمام پوشیدہ اور زبردست قوتوں کو' جو ایک زمانے میں ضعیف انسان سے نبرد آزما رھتی تھیں' قابو میں لاکر انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ھے -

اقبال نے انسان اور خدا کے درمیان مکالمے کی شکل میں انسانی کوششوں کے اس اعجاز کو نہایت خوبی سے بیان کیا ھے -

انسان خدا کو مخاطب کرکے کہتا ھے -

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم　　سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کوھسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　من آنم کہ از زھر نوشینہ سازم

غرض اس ماحول سے جو ھمیں گویا ورثے میں ملا ھے، ھماری مراد ایک طرف تو مظاھر فطرت کی وہ جامد دنیا ھے جسے ھم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ھیں اور دوسری طرف علوم و فنون، اخلاق و سیاست کی نموپذیر دنیا جو گذشتہ نسلوں کی دماغی جد و جہد اور تخلیقی کوششوں کا نتیجہ ھے اور جس کی ترقی ھماری اپنی مسلسل کاوشوں پر منحصر ھے - ھماری موجودہ زندگی کا ھر پہلو خواہ وہ عملی ھو یا نظری تمام تر اسی معاشرتی ورثے کا مرھون منت ھے جو ھم نے اپنے پیش رووں سے پایا ھے - ھمارے علوم اور ادب، ھماری موسیقی اور مصوری، ھمارا قانون اور سیاست، ھمارے مدرسے، ھماری صنعت و حرفت، غرض ھر چیز اس منتظم اور تدریجی ارتقا کا نتیجہ ھے جس میں بےشمار افراد اور جماعتیں گزشتہ زمانوں میں حصہ لے چکی ھیں، جن میں سے بعض کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ھے اور اکثر کی کوششیں گمنامی کے پردے میں پوشیدہ ھیں - اس لحاظ سے یقیناً ھماری موجودہ نسل ان تمام نسلوں کے ترکے کی حامل ھے جو ھم سے پہلے گذر چکی ھیں اور ھم تہذیب و تمدن کے ارتقاے پیھم میں اپنی کوششیں اس منزل سے شروع کرتے ھیں جہاں سے گزشتہ نسل نے اس کو چھوڑا ھے - اسی معنی میں کہا گیا ھے کہ ھر بچہ تمام گزشتہ زمانوں کا وارث ھوتا ھے اور اسی وجہ سے ھم

یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کبھی معدوم نہیں ہوتا بلکہ حال کا ایک جزو لازم بن کر مستقبل کی تعمیر میں نہایت اہم حصہ لیتا ہے۔ ہم ماضی کے بوجھ کو اپنے شانوں سے اٹھا کر اس طرح نہیں پھینک سکتے جس طرح ایک مزدور اپنے بوجھ کو پھینک دیتا ہے کیوں کہ اس کا اثر ہمارے رگ و ریشے میں، ہمارے قلب و دماغ میں خون کی طرح سرایت کرچکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم گزشتہ زمانے کے خیالات یا رسم و رواج کی مخالفت کریں، اس کی برائیوں کے خلاف جنگ کریں اور اپنے لیے نئی شاہراہ عمل کی بنیاد ڈالنا چاہیں۔ لیکن اس جنگ میں ہم جس قدر ذہنی اور مادی آلات اور وسائل کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی تمام‌تر اسی زمانۂ ماضی کا عطیہ ہوتے ہیں! قدامت پسندی اور جدت پسندی میں یہ فرق نہیں کہ قدامت‌پسند ماضی کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور جدت‌پسند اس سے آزاد۔ وابستہ دونوں ہوتے ہیں اور اس سے مدد لیے اور فائدہ اٹھائے بغیر دونوں کو چارہ نہیں۔ فرق صرف نقطۂ نظر کا ہوتا ہے کہ اس معاشرتی ورثے کو جو انہیں ملا ہے کس طرح استعمال کریں۔ آیا اپنی علمی اور عملی قوتوں کو محض اپنے بزرگوں کے کارناموں کی تشریح اور تفسیر اور حفاظت میں صرف کریں۔ یا ان کارناموں پر خود اپنے ارتقاپذیر تجربے کی بنیاد رکھیں اور ان میں اپنی عقل سے اپنے زمانے کی روزافزوں ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی عمل میں لائیں۔ بڑے سے بڑا سائنس‌داں اور فلسفی اور موجد بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا کہ دنیا کی پچھلی معلومات اور واقفیت سے فائدہ اٹھا کر مادی یا ذہنی مظاہر میں سے بعض

کو لے کر انھیں ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کر دے یا ان کے مشاھدے سے ایسے قانون دریافت کرے جن کے سمجھنے سے اس سے پہلے کے صاحبان فکر قاصر رھے ھوں - اس لیے گو اس کی ایجاد یا دریافت کی قدر کتنی ھی زیادہ ھو لیکن وہ اپنی کامیابی کے لیے سراسر متقدمین کا محتاج ھوتا ھے - ایک انگریز مصنف اپنی کتاب ۱ میں لکھتا ھے کہ

" اگر ھم کسی قابل ترین شخص کے کارناموں کا مقابلہ اس علمی دولت سے کریں جو اس کو ماضی سے وراثتاً ملی ھے اور جس کی وجہ سے وہ اپنا کام کر پایا تو اس کے کارنامے مقابلتاً بالکل ھیچ معلوم ھوتے ھیں - "

تعلیم و تہذیب کے نقطۂ نظر سے یہ تمدنی ورثہ بھی ھمارے لیے اتنا ھی اھم ھے جتنا وہ جسمانی اور نفسی ورثہ جو ھم اپنے آبا و اجداد سے براہ راست حاصل کرتے ھیں - ھماری دماغی نشو و نما کے لیے یہ ماضی کا عطیہ اسی قدر ضروری ھے جس قدر جسمانی صحت کے لیے تازہ ھوا اور صاف پانی - بالڈون (Baldwin) اس مسئلے پر بحث کرتے ھوئے لکھتا ھے :—

" بچہ بالکل اسی طرح معاشرتی تعلقات کے نظام کے اندر پیدا ھوتا ھے جس طرح وہ کرۂ ھوا کے اندر پیدا ھوتا ھے - جس طرح ھوا میں سانس لے کر اس کا جسم بڑھتا ھے اسی طرح اس عمرانی ورثے کو جذب کرنے سے اس کی دماغی نشو و نما ھوتی ھے ۲ - "

۱— Brown: Underlying Principles of Modern legislation صفحہ ۱۱۲ -

۲— ملاحظہ ھو : Social and Ethical Interpretations

معاشرتی ورثے سے مستفید ہونے کے لیے تعلیم کی ضرورت

لیکن انفرادی جسمانی اور اجتماعی تمدنی ورثے میں ایک نہایت اہم فرق ہے جس کو ذہن نشین کرنا فلسفۂ تعلیم کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے - جسمانی ورثہ بھی تمدنی ورثے کی طرح ہر انسان کو ملتا ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے یا اس پر قابو پانے کے لیے کسی خاص جد و جہد کی ضرورت نہیں - وہ خصوصیتیں اور جبلتیں جو بچے کو اپنے آبا و اجداد کی طرف سے وراثتاً ملتی ہیں رفتہ رفتہ طبعی حالات میں ' خود بخود ظاہر اور پختہ ہوتی جاتی ہیں - یہ سچ ہے کہ جبلت کے اظہار کے لیے کسی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس قسم کی مناسب تحریکیں ہر حیوان کے ماحول میں موجود ہوتی ہیں - بچے میں غذا حاصل کرنے کی جبلت ہوتی ہے چنانچہ وہ بغیر کسی دقت اور پس و پیش کے ماں کا دودھ پینے لگتا ہے - اس کو نقل و حرکت کرنے ' کھیلنے ' چیزیں بنانے اور بگاڑنے ' انہیں اپنی ملک بنانے کی جبلی خواہش ہوتی ہے اور وہ اُن خواہشوں کو مناسب وقت پر اپنے ماحول کی اشیا کے ذریعے پورا کرتا ہے - لیکن تمدنی ورثے کا معاملہ زیادہ نازک ہے - یہاں محض قبضے کا نام ملکیت نہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتی ہے - کوئی کتاب اس وقت تک واقعی طور پر ہماری نہیں ہو سکتی جب تک ہم دماغی کاوش سے اس کا مطالعہ کر کے اس کے مضمون پر عبور حاصل نہ کرلیں - محض قیمت ادا کرنے سے وہ ہماری حقیقی ملک نہیں بن سکتی - وہ ایک خارجی چیز رہتی ہے اور صرف اسی معنی میں ہماری ملکیت ہے جس معنی میں

مثلاً کوئی میز یا کرسی ہماری ملکیت ہوتی ہے - بلکہ میز کرسی پر بھی صحیح طور پر ملکیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا مناسب استعمال جانتے ہوں اور کرتے ہوں - جب معمولی مادی اشیا پر تصرف کے لیے خاص قسم کی اہلیت درکار ہے تو ظاہر ہے کہ وہ قیمتی اور گوناگوں ورثہ حاصل کرنے کے لیے، جس کا تعلق مادی اور ذہنی دنیا دونوں سے ہے، ہم پر اور زیادہ سخت شرائط عائد ہوتے ہیں - ایک لحاظ سے یہہ ورثہ ہر وقت ہمارے پاس ہے، ہمارے چاروں طرف موجود ہے، ہم ہر قدم پر اس کے اثرات دیکھتے ہیں - سائنس نے فطرت کی بیشتر قوتوں کو مسخر کر کے اُنہیں ہمارا غلام بنا دیا ہے، ادب، فلسفہ اور تاریخ نے ماضی، حال اور مستقبل کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں، فنون لطیفہ کے شاہکار ہر طرف نظر کو کھینچتے ہیں - معاشرتی زندگی کا وسیع اور پیچیدہ نظام ہمیں اس طرح گھیرے ہوئے ہے جیسے کرۂ ہوا - لیکن یہہ تمام چیزیں ہمارے لیے ایک مضمون سربستہ کے مانند ہیں جب تک ہم اس کو پڑھنے اور سمجھنے اور اس سے لطف‌اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا نہ کریں - دنیا میں بہت سے آدمی ایسے ہیں جن کی آنکھیں ہیں مگر اندھے ہیں - یعنی بہت سی چیزوں پر ان کی نظر پڑتی ہے - لیکن نہ وہ انہیں دیکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اُن سے کام لے سکتے ہیں - عالم رنگ اُن کے لیے کوئی وجود نہیں رکھتا - اسی طرح بہت سے آدمی ہوتے ہیں جن کے کان موسیقی سے بالکل بےبہرہ ہوتے ہیں - اُن کے لیے بہترین نغمہ بھی خواہ وہ عالم فطرت میں پایا جائے یا انسانی تخلیق کا نتیجہ ہو، بالکل بے معنی

ھے - اسی طرح جس شخص کے ذوق حسن کی تربیت نہیں ھوئی وہ نہ مناظر فطرت کی خوبصورتی سے لطف اُٹھا سکتا ھے نہ مصوری اور فن تعمیر کے شاھکاروں سے محظوظ ھو سکتا ھے - یہی حال عمرانی زندگی کے نظام کا ھے جو صدیوں کی کوششوں اور تجربے سے وجود میں آیا ھے - اُس کے حقوق و فرائض سے آگاھی کے بغیر کوئی شخص اس سے پوری طرح مستفید نہیں ھو سکتا - مثلاً نظام بلدیہ کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے ھر شہری اپنی زندگی کو بہت آرام دہ اور مفید بنا سکتا ھے - لیکن ھندوستان میں کتنے فیصدی لوگ ایسے ھیں جو اُس سے فائدہ اُٹھاتے ھیں یا اُٹھا سکتے ھیں ؟ ان کے لیے اُس کا ھونا نہ ھونا برابر ھے - متمدن ممالک میں جا بجا کتب خانے ' عجائب خانے ' مختلف قسم کے علمی جلسے اور نمائشیں منعقد ھوتی ھیں لیکن بہت کم لوگ وھاں جاکر اپنے علم ' ذوق اور تجربے میں اضافہ کرتے ھیں - لہذا اُن کے لیے یہ تمام چیزیں کوئی معنی نہیں رکھتی ھیں - یہ سب اسی بیش بہا تمدنی خزانے کے اجزا ھیں جو ماضی نے حال کو وراثتاً دیا ھے اور جس میں ھماری کوشش اور ذھنی اجتہاد سے روز بروز اضافہ ھو رھا ھے - لیکن جیسا کہ مندرجۂ بالا مثالوں سے ظاھر ھوتا ھے یہ تمام ورثہ باوجود اس کے کہ ھر وقت ھمارے سامنے موجود ہے در اصل گویا ایک سنگین عمارت میں بند ھے جس کے دروازے اُس وقت تک نہیں کھل سکتے جب تک افراد کی دماغی اور معاشرتی نشو و نما مناسب طریقے پر نہ کی جائے اور اُن میں اُن چیزوں کی قدردانی کی صلاحیت اور اُن کے استعمال کی قابلیت پیدا نہ ھو -

بچپن کے زمانے کی تعلیمی اہمیت

اس تمام بحث سے تعلیم کے معنی اور اس کی عمرانی اغراض پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب تک افراد کی تعلیم اور اُن کے فطری قوتوں کی نشو و نما کے لیے کوئی مناسب انتظام نہ کیا جائے گا وہ اپنے ماحول کو سمجھنے اور اُس سے کام لینے سے قاصر رہیں گے اور زندگی کے کار و بار میں عمدگی کے ساتھ حصہ نہ لے سکیں گے - اگر ہم اسی مسئلے کے دوسرے پہلو کو دیکھیں یعنی بچے کی نفسی زندگی کا مطالعہ کریں تب بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کیونکہ تعلیم کا عمل افراد اور جماعت کے باہمی ربط اور تعلق پر منحصر ہے اور اُس کا کوئی نظریہ اُس وقت تک صحیح نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ اُس ترازو کے دونوں پلوں پر برابر نہ اُترے - ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ تمام انسانی اداروں اور نظاموں کی بنیاد انسان کی فطرت اور جبلت پر ہے - یہی حال تعلیم کا ہے - اگر بچے میں شوق اور تجربہ حاصل کرنے اور اُسے برتنے کی قابلیت نہ ہوتی تو سرے سے تعلیم دینا ناممکن تھا - لیکن انسان کو تعلیم دینے کے لیے محض یہ جبلی قوتیں کافی نہیں - حیوانوں کے لیے اُن کی جبلت اور اُن کے گرد و پیش کی مفید اور مضر قوتیں معلم کا کام دیتی ہیں اور اُنہیں کی مدد سے وہ اپنی مقابلتاً محدود اور سادہ زندگی کا کار و بار انجام دینے کے قابل ہو جاتے ہیں - وہ کھیل کود کے ذریعے، زیادہ تجربہ‌کار حیوانوں کی تھوڑی سی ہدایت سے اور زیادہ‌تر اُن جبلتوں کی بدولت جو انسانوں اور حیوانوں دونوں کے لیے محرک عمل ہوتی ہیں، ضرورت کے مطابق اپنے

ماحول کو سمجھ لیتے ہیں ، خوراک تلاش کرنا ، رہنے کے لیے کسی قسم کا گھر بنانا یا ڈھونڈنا ، اپنے دشمنوں اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے بچنا - بقاے نسل کے فرائض ادا کرنا یہی چند چیزیں بالعموم اُن کا شغل زندگی ہوتی ہیں - اور اُن سب کو وہ آدمی کے بچے کی نسبت بہت جلد سیکھ جاتے ہیں اور بچپن کا زمانہ ختم کرکے اپنی نوعی زندگی میں شریک ہو جاتے ہیں - برخلاف اس کے انسانوں کی تعلیم میں دو مشکلات ہیں - اول تو یہ کہ بچہ پیدائش کے وقت بالکل بےبس اور بےکس ہوتا ہے - وہ اپنی حفاظت اور پرورش کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور ہر بات میں ماں کا یا دوسرے لوگوں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کے بچپن کا زمانہ اور تمام حیوانات کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے - یہاں بچپن سے مراد وہ تمام زمانہ ہے جب تک فرد میں اس قدر جسمانی اور دماغی پختگی نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی زندگی کا رہنما بن سکے اور بحیثیت ایک آزاد شہری کے معاشرے کے مشاغل میں شریک ہو کر اپنے فرائض پورے کر سکے - انسانی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان کا بچپن اور تمام حیوانات کی نسبت کیوں زیادہ مدت تک رہتا ہے - بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے ، اور بعض لوگوں کا سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال ہے ، کہ بچپن کا یہ تمام زمانہ ایک طرح سے اکارت جاتا ہے کیونکہ اس سارے عرصے میں بچہ اپنا وقت اُن اہم انسانی مشاغل میں صرف نہیں کر سکتا جو اُس کے شایان شان ہیں - جارج برنارڈ شا (G. B. Shaw) اپنے

ڈرامے " رجوع بہ میتھوسلا " (Back to Methuselah) میں
ایک ایسے زمانے کی پیشین‌گوئی کرتا ھے جب پیدائش ھی کے
وقت بچوں کی عمر سترہ سال کی ھوگی یعنی وہ اُس زمانے سے
گزر چکے ھوں گے جو اب نابالغی اور خام‌کاری کا سمجھا جاتا ھے
اور وہ تمام باتیں سیکھے سکھائے پیدا ھوں گے جو اب بہت مشکل
اور محنت سے سیکھنا پڑتی ھیں - اِس تخیل کے لطیفے سے
قطع نظر کرکے ' جس کا اگر امکان بھی ھوتا تو ھرگز مفید نہ
ھوتا ' غور کرنے سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ آدمی کے بچپن کا طویل
ھونا عین مصلحت ھے - جانوروں کے لیے بہت مختصر سا
بچپن کا زمانہ ان تمام مشاغل کو سیکھنے کے لیے کافی ھوتا ھے
جن سے اُن کو آئندہ سابقہ پڑنے والا ھے اور اس عرصے میں وہ اپنے
کم و بیش محدود اور معین ماحول کی ضروری چیزوں سے
واقف ھو جاتے ھیں - انسان کی حالت اُس سے مختلف ھے
اُس کا ماحول نہ معین ھے نہ محدود - جوں جوں زمانہ گزرتا
گیا ھے اُس نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی ھے ' علوم و فنون
میں کمال حاصل کیا ھے ' مادی اور ذھنی نظام قائم کیے ھیں
اس کی وجہ یہ ھے کہ اس میں اور تمام حیوانات کی نسبت
یہ صلاحیت بہت زیادہ ھے کہ گذشتہ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر
نئے کاموں اور نئے مواقع سے زیادہ عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ھو سکے
اپنی سیرت کو ضرورت کے مطابق ڈھالے اور اپنے طرز عمل اور طرز
زندگی میں ترمیم اور اصلاح کرے - اس صلاحیت کی وجہ سے
ابتدائے آفرینش سے اب تک انسان کی ترقی جاری رھی ھے
اور اُس نے گذشتہ تجربات کے نتائج کو آئندہ کامیابی کے لیے
استعمال کیا ھے اس طرح ھر نسل نے ' جیسا کہ ھم دیکھ چکے

ہیں، علوم و فنون میں اضافہ کیا ہے اور تمدن کی مجسم یادگاریں چھوڑی ہیں - اس لیے انسان کے بچوں کو اپنے غیر محدود، تغیر پزیر، نمو پزیر ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے گزشتہ نسلوں کے صدیوں کے تجربات کو سمجھنے اور اُن سے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے خاص اہتمام کی اور طویل مدت کی ضرورت ہے - یہی خاص اہتمام تعلیم کہلاتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے قدرت نے بچپن کا زمانہ جو تعلیم کا بہترین زمانہ ہے مقابلتاً طویل رکھا ہے - تعلیم کا مسئلہ دراصل ایک نسل سے دوسری نسل کو مفید تجربات منتقل کرنے کا مسئلہ ہے - معاشرے کی تمدنی اور اخلاقی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ انسان جو کچھ تجربے سے سیکھا ہے اس کو آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرتا رہے - اگر یہ علمی خزانے اور علمی وسائل مناسب طریقے پر ایک نسل سے دوسری نسل تک نہ پہنچائے جائیں تو تھوڑے سے عرصے میں نہایت متمدن اور تہذیب یافتہ جماعتیں بھی وحشی اور جاہل افراد کا مجموعہ بن کر رہ جائیں - واقعہ یہ ہے کہ عمرانی زندگی کا انحصار ہی ان چیزوں پر ہے جو اس کے تمام افراد میں مشترک ہوتی ہیں اور جن کو وہ اسی طرح حاصل کرتے ہیں کہ اُن میں مبادلۂ خیالات اور داد و ستد ہوتی رہتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہوتے ہیں - اگر اس تعامل اور داد و ستد کا سلسلہ بند ہو جائے تو جماعت کی یکجہتی کا فوراً خاتمہ ہو جائے کیونکہ جماعت محض افراد کے ایک جگہ اکٹھا ہو جانے سے نہیں بنتی بلکہ اُن کے اتحاد خیالات اور اتحاد اغراض و مقاصد سے وجود میں آتی ہے - یہ ممکن ہے کہ لوگ ایک

دوسرے سے بہت فاصلے پر ھوں لیکن اُن میں باھمی مُراسلت وغیرہ کے ذریعے سے وہ تعلقات قائم ھوں جو افراد کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے ھیں اور اُنھیں صحیح معنوں میں ایک زندہ جماعت بناتے ھیں -

"ایک کتاب یا ایک خط کے ذریعے سے اُن لوگوں میں جو ایک دوسرے سے ھزاروں میل دور ھیں ایسے قریبی مراسم اور تعلقات قائم ھو سکتے ھیں جو ممکن ھے ایک ھی گھر میں رھنے والوں کے درمیان نہ پائے جائیں........افراد کو ایک جماعت یا سوسائٹی کی شکل میں منظم کرنے کے لیے ضروری ھے کہ اُن کے مقاصد، اُن کے عقائد، اُن کی خواھشات، اُن کا علم مشترک ھو، ان میں یکجہتی اور باھمی مفاھمت ھو - اس قسم کی چیزوں کو مادی حیثیت سے ، اینٹ پتھروں کی طرح، ایک سے دوسرے کو منتقل نہیں کیا جا سکتا - اُن میں لوگ اس طرح شریک نہیں ھو سکتے جس طرح کسی کھانے کی چیز کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ سکتے ھیں - وہ باھمی داد و ستد جس سے یکجہتی پیدا ھوتی ھے - ایسی ھونی چاھیے جس سے ذھنی اور جذباتی میلانات میں یکسانیت پیدا ھو اور افراد توقعات اور ضروریات کو ایک ھی طرح پورا کریں" [1] -

افراد کی باھمی اثر پذیری

ابھی ھم تعلیم کے محدود اور مسلمہ معنی سے بحث نہیں کر رھے ھیں بلکہ افراد کی عام تربیت اور تاثیر و تاثر کے اُس وسیع تر نظام کو سمجھنا اور سمجھانا چاھتے ھیں جو

1- Dewey : Democracy and Education صفحہ ۵ -

معاشرے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے اور جس میں مدرسے کی تعلیم کو ایک اہم لیکن جزوی حیثیت حاصل ہے۔ بیشک مدرسوں کا کام بھی یہی ہے، جیسا کہ ہم آئندہ چل کر زیادہ تفصیل کے ساتھ دکھائیں گے کہ وہ گذشتہ اور موجودہ نسلوں کے تجربات کو منظم اور مرتب کر کے بچوں اور نوجوانوں کے سامنے پیش کریں اور اُن کے اندر افکار اور اعمال پر معاشرتی مقاصد اور اغراض کے مطابق اثر ڈالیں۔ لیکن اس کام کی پوری اہمیت اور اُس کی حدود کو ہم اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک یہ نہ معلوم ہوجائے کہ وہ مستقل اور بنیادی طریقے کیا ہیں جن کے ذریعے معاشرہ خود بخود افراد کی تربیت کرتا ہے اور جس کی تکمیل اور تنظیم کے لیے مدرسے کا مخصوص ماحول ترتیب دیا گیا ہے۔ ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے افراد کو تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کے تجربات سے متاثر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یعنی اس کی وجہ سے ان کے خیالات میں وسعت اور کارکردگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جو تربیت کا مرادف ہے۔ اس داد و ستد میں صرف اسی شخص کو فائدہ نہیں پہنچتا جو شاگرد کی حیثیت سے اُستاد سے کچھ سیکھتا ہے بلکہ تجربے میں شرکت ایسی چیز ہے جو دونوں فریقوں کے لیے مفید ہے۔ جب کوئی بچہ کسی کام میں شریک ہوکر اپنے والدین کے خیالات اور جذبات سے واقفیت حاصل کرتا ہے تو ایک حد تک اس کا طرز عمل اور نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کی طبیعت اور اس کے علم میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ گویا ایک نئی ہستی بن جاتا

ہے - اسی طرح جب وہ اپنے ہمعمروں میں کھیلتا ہے، ان کی نقل اتارتا ہے، ان کے ساتھ مقابلہ یا تعاون کرتا ہے تو اس کے تجربے میں وسعت اور وضاحت پیدا ہوتی ہے - اسے اپنے تخیل سے کام لینا پڑتا ہے - اپنے خیالات کو، اپنی گفتگو کو، اپنے سارے طرز عمل کو ذمہ‌داری کے ساتھ معین اور مرتب کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ دوسروں کے دوش بدوش زندگی بسر کرسکے - عمرانی زندگی ہی کی بدولت وہ تمام مواقع حاصل ہوتے ہیں - جو انسان کو غور فکر اور محاسبۂ نفس کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اس کے تجربے کو منظم اور نمو پزیر بناتے ہیں - بالکل تنہائی کی زندگی میں تو انسان کو اِس سے زیادہ غور و فکر اور تگ و دو کی ضرورت نہ پڑتی کہ وہ اپنی حیوانی ضروریات کو کس طرح پورا کر لے - اسی طرح اس اشتراک عمل سے وہ بالغ افراد بھی مستفید ہوتے ہیں جو نوعمر بچوں کو اپنے تجربات میں شریک کر کے ان کی تربیت کرنا چاہتے ہیں ان کے تجربات اکثر ان کے عمل کا جزو بن جاتے ہیں اور عادت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں - جب وہ کسی بات کو ایک دفعہ سیکھ لیتے ہیں تو انہیں یہ ضرورت نہیں رہتی کہ اس کی منطقی یا نفسیاتی تحلیل کریں - اور اپنی معلومات کو معین اور واضح شکل میں ترتیب دیں - لیکن جب انہیں نوعمر بچوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تجربے کو اس طرح مرتب کریں کہ بچے اس سے مستفید ہو سکیں یعنی ان کے پختہ اور مکمل تجربے اور بچوں کے نامکمل اور آزمائشی تجربات کے درمیان رابطہ قائم ہو جائے - اس مقصد کے لیے انہیں بہت کچھ دماغی

کارش کرنی پڑتی ہے جو خود ان کی ذات کے لیے مفید ہوتی ہے - غرض بالغوں کے نقطۂ نظر سے فن تعلیم کے معنی یہی ہیں کہ معاشرے کے تجربات کو ایسی شکل میں منتقل کیا جائے کہ وہ بچوں کے خیالات، جذبات اور دلچسپیوں کے ساتھ ہم‌آہنگ ہو جائیں - اور ان کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے نامکمل اور مبہم تجربات کی تکمیل اور تنظیم کر کے تہذیب و تمدن کے حامل بن جائیں - جو لوگ فن تعلیم سے پوری واقفیت رکھتے ہیں انہیں اندازہ ہے کہ یہ کام کس درجہ مشکل اور کتنی ذمہ‌داری کا ہے - اس کو انجام دینے کے لیے کسی قدر علمی قابلیت اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے اور اگر یہ ایمانداری اور خلوص کے ساتھ کیا جائے تو اس سے خود معلموں کی قابلیت میں کتنا اضافہ ہوتا ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ذرا اس بات کی کوشش کیجیے کہ کسی تجربے کو وضاحت اور صحت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو سمجھایا جائے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ خود آپ کا نقطۂ نظر اس کے متعلق بدل گیا - بالخصوص اس صورت میں کہ وہ تجربہ ذرا پیچیدہ اور مشکل ہو..........کسی تجربے کو منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کو ایک مخصوص شکل میں مرتب کیا جائے - اور ترتیب دینے کے لیے لازم ہے کہ ہم بےتعلقی سے اس پر غور کریں اسے دوسرے شخص کے نقطۂ نظر سے دیکھیں، یہ سوچیں کہ اس تجربے میں اور دوسرے کی زندگی میں کس طرح

رابطہ قائم ہو سکتا ہے - اور یہ اُس کے سامنے کس شکل میں پیش کیا جائے کہ وہ اِسے آسانی سے سمجھ لے - سوائے اس صورت کے کہ ہم بالکل پیش پاافتادہ اور جانی بوجھی باتیں سکھانا چاہیں ہمیشہ اِس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے تجربے کو موثر طور پر کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہم ایک حد تک، اپنی قوت تخیل سے اُس کے تجربات کو اپنے تجربات بنا لیں " ۱ -

نظام تمدن کا ارتقا

انسان نے جوں جوں ترقی کی ہے، انتقال تجربات کے وسائل بھی بڑھ گئے ہیں اور زیادہ مکمل ہو گئے ہیں - سب سے قدیم اور موثر ذریعہ تو یہی ہے کہ لوگوں کو ایسے مشاغل میں شریک کیا جائے کہ وہ براہ راست اُن کو حاصل کریں جن کو منتقل کرنا مقصود ہے - اور تعلیم کی ابتدا بھی اسی طرح ہوئی کہ بالغوں نے بچوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں شریک ہونے کا موقع دیا اور اس طرح اُن کو وہ ضروری فنون اور رسوم و روایات سکھائیں جو معاشرے کے نزدیک قائم رکھنے کے قابل تھیں - لیکن اس کے ساتھ ہی خود بالغ افراد کے روزافزوں تجربات کو محفوظ رکھنے کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا تھا - اول اول اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے محض حافظے سے کام لیا جاتا تھا - اور ان کو منتقل کرنے کے لیے زبانی الفاظ سے - چنانچہ قدیم‌ترین ادب اور شاعری کے شاہکار ہم تک

---

۱ - Dewey - Democracy and Education صفحہ ۷ -

اِسی طرح سینہ بسینہ پہنچے ہیں - مگر انسان کا دماغ اِس ناقابل اعتبار اور محدود انتظام پر قناعت نہیں کر سکتا - اُس کی قوت اِختراع نے اپنے تجربات کی حفاظت کے لیے بہت سے نئے ذرائع اِیجاد کر لیے - فن تحریر نے انسانی خیالات کو حیات دوام بخش دیا اور ہمیں حافظے کے فریب سے آزاد کر دیا - آوازوں کو قائم رکھنے اور منتقل کرنے کے لیے بھی مختلف قسم کے آلات ' گراموفون وغیرہ بنائے گئے - صورتیں مصوری اور عکاسی کے ذریعے فنا ہونے سے بچا لی گئیں - یہ تمام ذرائع انسانی تجربات کو منتقل کرنے کے کام میں آنے لگے ہیں اور اُن میں آئے دن نت نئی ایجادیں اور اضافے ہوتے رہتے ہیں - چنانچہ آج ہر متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں خیالات کو منتقل کرنے کے ذرائع اِس کثرت سے موجود ہیں کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر علوم و فنون کے کسی شعبے میں کام کرتے ہیں ایک دوسرے کی کوششوں ' کامیابیوں ' اور ناکامیوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں - زمان و مکان کے قیود سے انسان بڑی حد تک آزاد ہو گیا ہے اور خیال کے گویا پر لگ گئے ہیں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں پہنچ سکتا ہے - اخباروں کے ذریعے تمام ملکوں کی خبریں روز کے روز معلوم ہو جاتی ہیں - گراموفون کے ذریعے ہم حال اور ماضی کے بڑے بڑے موسیقی دانوں اور مقرروں کی آواز سن سکتے ہیں - ٹیلیفون ' سنیما ' لاسلکی ' وغیرہ خیالات کو سرعت کے ساتھ پھیلاتی ہیں اور اشتراک عمل کے امکانات کو زیادہ کرتی ہیں - اُن تمام چیزوں کی مدد سے تہذیب و تمدن کا نظام ' جس کی بنیاد وحشیوں اور نیم

شائستہ جماعتوں نے ڈالی تھی، نہایت تیزی کے ساتھ پھیلتا اور وسیع ہوتا چلا جاتا ہے -

اب تعلیم کا مسئلہ اِس صورت میں ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے کہ ایک طرف تو نوعمر بچہ ہے جو نہ جسمانی نقل و حرکت کے قابل ہے، نہ اپنے ماحول سے واقف ہے، نہ اپنے دماغ سے کام لے سکتا ہے اور دوسری طرف یہ عظیم‌الشان نظام تمدن اور علوم فنون کی دنیا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے - کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی کا بچہ بھی بغیر کسی خارجی امداد کے، محض اپنی جبلت اور ماحول کی قوتوں کی رہنمائی میں جانوروں کے بچوں کی طرح تھوڑے سے عرصے میں اس نظام کے تمام عناصر پر حاوی ہوکر اپنے فرائض کو ادا کرنے کے قابل ہو جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات امکان سے خارج ہے -

تعلیم کے ذریعے نظام تمدن کا قیام

انسانوں اور جانوروں کے ماحول میں اب تو زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن تمدن کے ابتدائی مدارج میں بھی یہ تفاوت نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا - ممکن ہے کہ بالکل ابتدائی مدارج میں انسانی تمدن اس درجہ سادہ اور واضح ہو کہ اُس وقت کے بچے بغیر کسی خاص بیرونی امداد کے چھوٹی سی عمر میں "بالغ" ہو جاتے ہوں یعنی بالغوں کی زندگی میں شریک ہوکر تمدنی کار و بار میں حصہ لیتے ہوں - لیکن جوں جوں یہ نظام زیادہ متنوع اور پیچیدہ ہوتا گیا بچوں کو تمدنی زندگی کے لیے تیار کرنا بھی ایک مشکل اور اہم ذمہ‌داری ہوگئی - جس کے لیے زیادہ مدت درکار ہونے لگی - بچپن جس کو "تیاری کے زمانے" سے تعبیر

کیا جا سکتا ہے - کوئی معین مدت نہیں بلکہ اس کی میعاد ضرورت کے مطابق خود بخود بڑھتی جاتی ہے تاکہ بچے اس عرصے میں کم از کم اُن وسائل پر قابو پا سکیں جن کی مدد سے وہ نظام تمدن کو سمجھ لیں اور اُن کی جسمانی اور دماغی نشو و نما صحیح راہ پر لگ جائے - تعلیم کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم کا زمانہ واقعی زیادہ طویل ہوتا گیا ہے - گذشتہ صدی کی تعلیمی جد و جہد کا ایک اہم باب وہ کوششیں ہیں جو بچوں کی لازمی تعلیم کی مدت کو بڑھانے کے لیے کی گئی ہیں - اکثر مغربی ممالک میں صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد سے برابر یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ نہ صرف بچپن کے زمانے میں بلکہ زمانۂ بلوغ میں بھی طلبہ تعلیمی ماحول اور تعلیمی اثرات میں رہیں کیونکہ ماہرین تعلیم محسوس کرتے ہیں کہ دور حاضرہ کے تمدن کے بہت سے اصول اور فرائض ایسے ہیں جن کو طلبہ بچپن کے زمانے میں نہیں سمجھ سکتے - اُن کو عمدگی کے ساتھ سمجھنے کے لیے زیادہ پختہ تجربے کی ضرورت ہے جو بلوغ کے زمانے میں حاصل ہوتا ہے، جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں عمرانی زندگی کے حقوق اور فرائض کو خود اپنے عملی تجربے کی بدولت پہچانتے ہیں - اسی وجہ سے امریکا میں ثانوی تعلیم کو بھی تمام طلبہ کے لیے مفت اور لازمی قرار دیا گیا ہے اور جرمنی میں ہر طالب علم کو ابتدائی تعلیم کے مدارج ختم کرنے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر تک "تعلیم مزید" کے کسی شعبے میں داخل ہونا پڑتا ہے - انگلستان میں چند سال ہوئے ایک

مشورتی کمیٹی مقرر کی گئی' تھی جس نے تعلیم بالغان کے مسئلے پر غور کر کے ایک نہایت قابل قدر رپورٹ پیش کی ھے - اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ھے کہ عہد بلوغ کے شروع ھوتے ھی بچوں کو مدرسے سے نکال کر زندگی کی کشمکش اور آزمائشوں میں ڈال دینا اور ان کو تعلیمی ھدایت اور رھنمائی سے محروم رکھنا' بہت خطرناک چیز ھے - شہری زندگی کے فرائض اور اصولوں کو سمجھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ھے کہ عمر کی اس اھم اور نازک منزل میں ان کے لیے مناسب تعلمی ماحول اور سہولتیں فراھم کی جائیں - اقتصادی اور تمدنی مشکلات اور ایک حد تک انفرادی اختلافات کا خیال کرتے ھوئے وہ اس بات کو مناسب نہیں سمجھتے کہ تمام نوجوان ثانوی تعلیم کے کل مدارج مدرسوں میں طے کریں - اس لیے انھوں نے یہ تجویز پیش کی ھے کہ تعلیم مزید کے موجودہ نظام کو مرتب اور مکمل کیا جائے اور وہ تمام طلبہ جو باقاعدہ ثانوی مدراس میں تعلیم نہیں پا سکتے اپنے وقت کا ایک حصہ' جو ان کے اقتصادی مشاغل سے بچایا جائے' ان مدرسوں میں صرف کریں اور وھاں ان کو تعلیم ایسی دی جائے کہ وہ نہ صرف اپنے مخصوص اقتصادی کار و بار میں زیادہ قابلیت کے ساتھ حصہ لے سکیں بلکہ اپنے عمرانی وظائف کو بھی اچھی طرح سمجھ کر ادا کریں -

اب یہ بات صاف ھو جاتی ھے کہ انسانی تمدن کے نظام میں تعلیم کی ابتدا کس طرح ھوئی - بچہ اپنی کمزوری اور

Report of the Consultative Committee on the—Education of the Adolescent.

بے بسی کی وجہ سے اپنے گھر والوں کا، خصوصاً اپنے والدین کا سہارا لیتا ہے - محض اسی بات سے کہ وہ پیدا ہوتے ہی اپنے سے زیادہ عمر اور تجربے کے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے - اور ان سے تعلقات پیدا کرتا ہے اس کی تعلیم کی ابتدا ہو جاتی ہے - شروع میں اس "تعلیم" کا مقصد علم سکھانا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا قائم رکھنا ہوتا ہے - والدین اس کی حفاظت اور نگہداشت کے لیے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں جن کا منشا اس کی جسمانی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کی نشو و نما کرنا ہوتا ہے - اگر اس کے لیے یہ انتظام نہ ہو تو زندگی محال ہو جائے - اب جوں جوں اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت اور دماغ میں آدمیوں اور چیزوں کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے انسانی اور طبیعی ماحول سے تعلقات پیدا کرتا ہے - اپنے والدین، عزیزوں اور دوستوں کی ہمت‌افزائی اور روک تھام، اور ایک حد تک قدرتی تادیب کے ذریعے اس کی عمرانی اور اخلاقی تعلیم بھی شروع ہو جاتی ہے - خاندان کے افراد اور متعلقین جو تعلیمی اثر بچے پر ڈالتے ہیں اس کی تفصیل ہم ایک آئندہ باب میں کریں گے، لیکن اس کی ابتدائی تربیت میں قدرتی تادیب کی اہمیت کا سمجھ لینا ضروری ہے - اکثر محبت اور احتیاط کرنے والے والدین اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ بچے اس تکلیف سے بالکل محفوظ رہیں جو غلط اور نامناسب حرکات کی وجہ سے انہیں پہنچنی چاہیے - لیکن مشہور انگریزی مفکر ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) نے شد و مد اور قابلیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اخلاقی تعلیم کے لیے وہ تادیب بہت موثر ہوتی

ہے جو بچے اپنے افعال کا قدرتی خمیازہ بھگتنے سے حاصل کرتے ہیں - وہ اپنی معرکۃ الارا تصنیف "فلسفۂ تعلیم" میں لکھتا ہے :—

"یہ قدرتی سزائیں جو بچے کے بےجا کاموں کا نتیجہ ہیں مستقل بلا واسطہ اور یقینی ہیں اور ان سے چھٹکارا نہیں ہوسکتا - یہاں زجر و توبیخ کا کچھ کام نہیں - بلکہ چپ چاپ سختی سے کام لیا جاتا ہے - اگر بچہ اپنی انگلی میں سوئی چبھو لے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو تکلیف ہوتی ہے - اگر دوبارہ ایسا کرتا ہے تو پھر یہی نتیجہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہتا ہے - بچہ موجودات غیر ذی روح کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں یہ بات معلوم کرتا ہے کہ وہ اپنی خاصیت سے منحرف نہیں ہوتے - کوئی عذر نہیں سنتے اور ان کی نہ داد ہے نہ فریاد - اس سخت مگر فیض پہنچانے والی تربیت کو پہچان کر بچہ نہایت ہی ہوشیار ہو جاتا ہے کہ آئندہ ان کی خلاف‌ورزی نہ کرے.............معاشرتی تربیت اور بچوں کی ابتدائی تربیت جو قدرت کرتی ہے ان دونوں تربیتوں کی باہمی مشابہت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے - اور کنایتاً اس بات کا بھی یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہی تربیت سب سے زیادہ موثر ہے" - ۱

اس تمام بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ تعلیم اور تمدن ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں -

---

۱ - ہربرٹ اسپنسر : فلسفۂ تعلیم (مترجمۂ خواجہ غلام الحسنین)

تعلیم کوئی ایسا نظام نہیں جس کو بعض ضروریات سے مجبور ہوکر انسان نے قائم کر لیا ہو اور نہ وہ ایسا شغل ہے جس کو انسانی زندگی کے لیے محض زینت کا باعث سمجھا جائے۔ وہ تو تمدنی زندگی کے رگ و ریشے میں پیوست ہے اور جسم اجتماعی میں جان بن کر سمائی ہوئی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر دکھایا ہے اس کا مقصد اب محض اتنا نہیں کہ وہ تسلسل حیات کو قائم رکھے بلکہ وہ "حیات برتر" کا ایک وسیلہ بن گئی ہے جس کے ذریعے ہم ناواقف اور ناتجربہ‌کار بچے کو بہترین اخلاقی اور معاشرتی اقدار[1] اور اصولوں سے روشناس کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے ورثے کے ان عناصر کو جو بہترین تعلیمی قدر رکھتے ہیں بچے کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں خود بخود ایک بہتر معاشرے کی بنیاد ڈالنے کی اہلیت پیدا ہو جائے، اس طرح تعلیم ایک طرف بچے کی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف اسے تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ شخصیت کی نشو و نما ان مشاغل کے ذریعے کرتی ہے جو تمدنی زندگی کا اہم جزو ہیں اور جن کے ذریعے سے بچہ رفتہ رفتہ اُسے سمجھنے اور اس میں شرکت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ تعلیم کا صرف ایک رخ ہے۔ یعنی اگر ہم عمل تعلیم کو معاشرے یا بالغ افراد کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے بچوں کو زندگی کے لیے تیار کر رہے ہیں۔

---

[1] Values—1

تعلیم کا ایک غلط تصور

لیکن اِس نظریے کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسئلۂ تعلیم پر اُس کے موضوع یعنی بچوں کے نقطۂ نظر سے بھی غور کریں اور دیکھیں کہ اُن کے نزدیک اس تمام سلسلۂ مشاغل کے کیا معنی ہیں جو تعلیم‌گاہوں وغیرہ میں رائج ہے - اُن کو اُن تمام سبقوں اور کھیلوں کے سیکھنے سے کیا حاصل ہوتا ہے جن میں وہ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کرتے ہیں ؟ تعلیم پر یک‌طرفہ غور کرنے سے اکثر معلموں نے اور تعلیمی نظریے قائم کرنے والوں نے بہت بڑی غلطیاں کی ہیں جن کا خمیازہ بےچارے بچوں نے صدیوں بھگتا ہے - انہیں غلطیوں میں سے ایک یہ خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف اِتنا ہے کہ بچوں کو آئندہ زندگی کے لیے تیار کرے - بظاہر یہ خیال نہ صرف بالکل بےضرر بلکہ بہت صحیح اور مفید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اِس میں تعلیم اور تمدنی زندگی کا باہمی تعلق مدنظر رکھا گیا ہے - لیکن ہر خیال جو بجاے خود مفید ہوتا ہے اگر ہم اس میں اس قدر محو ہو جائیں کہ ہمیں دائیں بائیں آگے پیچھے کچھ نہ دکھائی دے تو وہ بہت سی غلطیوں کا سبب بن جاتا ہے - تعلیم کا کام یقیناً یہ ہے کہ طالبہ کو اُن فرائض اور ذمہ‌داریوں کے لیے تیار کرے جن سے اُن کو سابقہ پڑے گا لیکن اِس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے جو علمی نتائج نکلے وہ سراسر نقصان‌دہ ثابت ہوئے ہیں - اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ معلم نے بجاے اِس کے کہ بچوں کی موجودہ ضرورتوں، قوتوں اور دلچسپیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا مستقبل کی توقعات، اور ضروریات کو

اپنا نصب‌العین ٹھہرایا اور تعلیم کے مرکز ثقل کو بالکل بدل دیا - اس میں شک نہیں کہ منزل مقصود تو بلوغ کی زندگی ہے - لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے جس قدر درمیانی منزلیں راستے میں پڑتی ہیں وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اتنی ہی اہم اور قابل توجہ ہیں جتنی وہ آخری منزل - اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر یعنی اُس کی نشو و نما کے ہر ہر قدم کو اُس کے لیے معنی‌خیز اور دلچسپ نہ بنائیں ہم اُس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے ' اُس کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکتے - معلم کے لیے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر نوعمر بچہ ایک مخصوص شخصیت کا مالک ہے اور مخصوص شوق اور رجحانات رکھتا ہے - جن کا دریافت کرنا اُس کا فرض ہے جن کی تربیت کے لیے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اُس کا خاص فن ہے - لیکن اُستادوں اور والدین نے عام طور پر اس نفسیاتی نکتے کو بھلا دیا اور مستقبل کی تیاری کی دھن میں بچوں کی موجودہ قوتوں اور ضرورتوں کو نظرانداز کر کے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ بچہ جلد سے جلد اس "بےکار" زمانے سے گزر کر سن شعور کو پہنچ جائے - گویا سن شعور کوئی طلسمات کا دروازہ ہے جس کے اندر قدم رکھتے ہی ناتجربہ‌کار یا خام‌کار افراد پر زندگی کے تمام حقائق منکشف ہو جاتے ہیں! یورپ میں یہ خیال صدیوں کارفرما رہا - روسو (Rousseau) کے زمانے میں فرانسیسی سوسائٹی میں اس نظریۂ تعلیم کا دور دورہ تھا - بچپن کی اہمیت کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا - گھر پر والدین اور مدرسے

میں اُستادوں کی یہی کوشش رهتی تھی کہ جلد سے جلد نوعمر بچوں کو "سوسائٹی" میں شریک هونے کے قابل بنا دیا جائے - اُن کی دماغی نشو و نما سے قطع نظر کر کے اُنھیں گفت و شنید، نشست و برخاست کے وہ آداب سکھا دیے جائیں جن سے یہ دیکھنے میں قبل از وقت بالغ معلوم هوں - اس حماقت اور کوتہ‌اندیشی سے نہ معلوم بچوں کی کتنی نسلوں کو نہایت سخت جسمانی اور دماغی نقصان پہنچا - روسو (Rousseau) نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "امیل" (Emile) میں اس خیال کے خلاف بہت قابلیت اور زور کے ساتھ جہاد کیا اور اس خلاف فطرت تعلیم کی بنیادیں ہلا دیں - یہی وجہ هے کہ یہ باتفاق راے تعلیم جدید کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا پیغمبر مانا جاتا هے، حالانکہ اُس کے پیش کردہ نظام تعلیم میں جزئیات اور تفصیلات کے اعتبار سے بےشمار غلطیاں بھری پڑی هیں - اُس کی حقیقی عظمت کا راز یہی هے کہ اُس نے تعلیم کے بنیادی اصول کو سمجھ لیا کہ خواہ تعلیم کا منتہا کچھ هو اُس کا نقطۂ آغاز بچے کی ذات هے جس کی جبلتوں اور کمزوریوں اور مخصوص رجحانات کا احترام اور اُن کی هدایت معلم کا اولین فرض هے - همارے ملک میں اب بھی یہ خیال عام طور پر رائج هے اور اُستاد اور والدین سب کی یہی خواهش هے کہ کسی طرح بچہ بہت جلد "پڑھ جائے" یعنی تعلیم کے مرئی اثرات جلد از جلد ظاهر هونے لگیں - اس کے دماغ میں هر قسم کی خشک غیر ضروری اور دور از کار معلومات بھر دی جائے، اور وہ کسی دفتر میں یا کسی اور ملازمت میں کام کرنے لگے - اس سے بحث نہیں کہ اس کی دماغی ارتقا کس حد تک هوئی هے اور اُس

کا کیا تقاضا ہے - اُنہیں تو یہ ارزو ہے کہ اپنے محبوب مقاصد کی تکمیل اور اپنے عزیز خوابوں کی تعبیر دیکھیں - بچے کی نشو و نما اور اُس کی نفسی زندگی سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں - کوئی چاہتا ہے کہ بچہ جلد سے جلد ایک خاص پیشہ سیکھ لے' خواہ طبیعت اور میلان فطری کے لحاظ سے وہ اُس کے لیے موزوں ہو یا نہ ہو - کسی کو خواہش ہے کہ اُس کی اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرے خواہ فطرت نے اُسے اُن تمام دماغی اوصاف سے محروم رکھا ہو جن کے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا محض تضیع اوقات ہے - بعض کی نیت یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح بچے کو چھوٹی سی عمر میں علوم دین کا عالم بنا دیں چنانچہ (اگر اُن میں سوچنے اور اظہار راے کرنے کا مادہ ہے) تو وہ اپنے اپنے خیال کے مطابق مدرسے کے نصاب میں ترمیم اور تبدیلی چاہتے ہیں - بعض علوم و ادب کو غیر ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ براہ راست پیشے کی تعلیم میں کام نہیں آتے - بعض عملی تعلیم کی تمام تحریکوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کیونکہ وہ اُن کی راے عالی میں اعلیٰ تعلیم کے منافی ہیں - بعض اس بات پر مصر ہیں کہ بچوں کو ابتدا سے مذہبی مسائل اور علوم اور مذہبی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت وغیرہ کی تعلیم دی جائے خواہ بچہ اپنی مادری زبان سے بھی اچھی طرح واقف نہ ہو اور ان علوم کی اہمیت اور مفہوم سمجھنے سے بالکل قاصر ہو - اس تمام خلط مبحث کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفسیات اطفال اور فن تعلیم کے صریحی قوانین کے برخلاف' طالبہ کے کسی خاص مقصد کے لیے تیار کرنے کے خبط میں لوگوں نے نصاب کو بجاے تعلیمی ضروریات کے

مطابق مرتب کرنے کے مختلف لوگوں کے درمیان ایک گیند بنا دیا ہے جو کبھی ایک طرف اُچھالا جاتا ہے کبھی دوسری طرف۔ کوئی مضمون دماغ کی تربیت اور "اس میں تیزی" پیدا کرنے کے خیال سے شامل کیا جاتا ہے۔ کوئی برکت کی خاطر، کوئی مفید ہونے کی بنا پر۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں کا نصاب ایک معجون مرکب بن کر رہ گیا ہے جس سے کوئی ایک مقصد بھی کامیابی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ نہ افادی ہے، نہ تہذیبی، نہ مذہبی!

ڈیوئی کا نظریۂ تعلیم

بہر حال یہاں ہماری غرض نصاب کی بحث میں پڑنا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اگر ہم تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے میں بچے کی اپنی ذات اور اس کی فطرت کے مقتضا کو نظرانداز کریں تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی مذکورۂ بالا تصنیف میں جا بجا اس خیال پر زور دیا ہے کہ تعلیم کو در اصل نشو و نما کے مرادف سمجھنا چاہیے۔ اس کو کسی دوسرے بیرونی مقصد کے تابع کردینے سے اس کا حقیقی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ وہ نہ کسی مستقل بعید کے لیے تیاری کا نام ہے، نہ دماغ کی چند مخصوص قوتوں کو تیز اور مرتب کرنے کا۔ ڈیوئی (Dewey) کے نزدیک تعلیم کا کوئی خارجی مقصد یا کوئی علیحدہ منزل مقصود نہیں۔ وہ خود ہی راہ ہے اور خود ہی منزل، آپ ہی مقصد اور آپ ہی مقصود۔ بالفاظ دیگر اس کا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعے سے انسان میں علمی، اخلاقی، معاشرتی نشو و نما کی قوت زیادہ ہوتی جائے اور اس کی

مجموعی شخصیت کی ارتقا برابر جاری رہے - ایک واقعی تعلیم یافتہ اور جاہل آدمی میں اصلی فرق یہ نہیں کہ ان میں سے ایک کو بہت سی باتیں معلوم ہیں اور دوسرے کو نہیں معلوم - ایک کو بہت سے کام آتے ہیں دوسرے کو نہیں آتے - بلکہ اصلی فرق یہ ہے کہ پہلے میں سیکھتے رہنے کی غیر محدود صلاحیت ہے اور دوسرے میں یہ صلاحیت نہیں - پہلے کی تعلیم ہمیشہ جاری رہتی ہے کبھی ختم نہیں ہوتی' دوسرے کی اگر کبھی شروع بھی ہوئی تھی تو اب بند ہے - اسی بنا پر اسلام کے معلم اعظم نے فرمایا ہے کہ گہوارے سے لے کر قبر کی منزل تک تمام عمر تحصیل علم کرتے رہو - حیات بخش صرف وہی علم ہو سکتا ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے' ہمیشہ متحرک رہے - جب علم میں یا تعلیم میں جمود پیدا ہو جائے تو اصل میں انسان کی زندگی کی موت ختم ہو جاتی ہے اگر ہم تعلیم کے اس حرکی ا نظریے کو قبول کریں تو اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ شیرخوارگی کے زمانے سے لے کر سن شعور تک زندگی کی ہر منزل کے لیے اس کی ضروریات کے مطابق تعلیم کا نظام مرتب کریں اور ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھیں کہ عمر کے قدرتی رجحانات کیا ہیں جن سے کام لے کر ہم طالبہ کی فطری قوتوں کو اپنا معین و مددگار بنا سکتے ہیں اور ان کو تعلیم کا وسیلہ قرار دے سکتے ہیں - تعلیم کو محض تیاری کا ذریعہ سمجھنے کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ ہم ان فطری قوتوں کی طرف سے بے‌پروائی برتنے لگتے ہیں جو بچوں کے لیے

Dynamic—1

محرک عمل ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر وہ ہر کام کو استقلال اور جوش کے ساتھ انجام دیتے ہیں - بچوں کی نفسی زندگی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حال کا زمانہ ان کی تمام دلچسپیوں کا مرکز ہوتا ہے - وہ اپنے ذہن میں مستقبل کی تصویر صاف طور پر نہیں کھینچ سکتے - ان کے نزدیک مستقبل کا زمانہ ایک مبہم اور غیریقینی چیز ہے جس میں اتنی کشش اور زور نہیں کہ وہ ان کی موجودہ دلچسپیوں پر غالب آسکے - اس لیے بچوں کی فوری ضروریات اور ان کی موجودہ نشو و نما کے اقتضا سے قطع نظر کر کے ہر قدم پر مستقبل کی امیدوں اور فرائض کا واسطہ دینے سے تعلیم میں جان باقی نہیں رہتی - وہ محض رسمی مشقوں اور سبقوں کے پڑھنے پڑھانے تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے - بچوں کی سمجھ میں کوئی معقول وجہ نہیں آتی کہ وہ کیوں اپنے گرد و پیش کی ہنگامہ‌آفریں زندگی کو چھوڑ کر اپنی تمام توجہ کو مدرسے کے کاموں پر مبذول کریں - ان کی توجہ میں انتشار پیدا ہوجاتا ہے - وہ اپنی تمام دماغی قوتوں کو درسی مشاغل پر مجتمع نہیں کرسکتے جو ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت دونوں کے لیے مضر ہے - یہی وجہ ہے کہ جو تعلیم طلبہ تمدنی زندگی میں براہ راست شریک ہو کر حاصل کرتے ہیں اس کا اثر ان پر زیادہ دیرپا ہوتا ہے خواہ اس میں بالقصد تعلیم مد نظر نہ ہو - مثلاً جب گاؤں میں کوئی بچہ اپنے باپ کے کھیت پر کام کرتا ہے اور کام ہوتے دیکھتا ہے ' آدمیوں ' جانوروں ' زمین ' پانی ' بارش ' کا تجربہ حاصل کرتا ہے تو اس تمام واقفیت کا نقش اس کے دل و دماغ پر بہت گہرا ہوتا ہے بمقابلہ اس اثر کے جو مدرسے کی

تعلیم کا پڑتا ہے - وجہ یہ ہے کہ وہ کام اُس کی بعض بنیادی جبلتوں مثلاً جسمانی نقل حرکت یا دستکاری ' یا تعمیر کو اُبھارتا ہے - اور اُس کی محرف اُس کی موجودہ قوتیں اور رجحانات ہوتے ہیں - برخلاف اس کے مدرسے کا کام سطحی اور مصنوعی معلوم ہوتا ہے جو اس کے زیادہ دلچسپ مشاغل کے راستے میں حائل ہوتا ہے - اس مشاہدے سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انسانی زندگی بجائے خود بہترین اور موثرترین معلم ہے اور تعلیم اپنے مقاصد میں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب وہ بھی انہیں محرکات عمل کو کام میں لائے جو تمدنی زندگی میں کارفرما ہیں -

اس کے علاوہ پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اس نظریۂ تعلیم کی ایک اور خرابی بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب طلبہ کی موجودہ دلچسپیوں کے لیے مدرسے کے مشاغل میں کوئی سامان نہیں ہوتا تو ان کی توجہ کو جذب کرنے کے لیے ہمیں خارجی ذرائع سے امداد لینی پڑتی ہے - کبھی انہیں سزا کا خوف دلایا جاتا ہے کبھی انعام کا لالچ دیا جاتا ہے - اگر ہم کسی کام میں بالکل محو اور مشغول ہو جاتے ہیں تو اس کام کی فطری کشش ہمیں تمام مشکلات اور ترغیبات سے نکال لے جاتی ہے - بالغ افراد کے لیے بھی اکثر یہ خیال کافی نہیں ہوتا کہ فلاں کام کو استقلال کے ساتھ کرنے سے کبھی آگے چل کر ہمیں بڑا فائدہ ہوگا - ان میں بھی جوش و انہماک پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ محسوس کریں کہ اُن کا کام ان کی موجودہ ضروریات کے لیے بھی مفید ہے اور ان کی فطری قوتوں کے اظہار کا ذریعہ ہے - بچوں کے لیے تو اس بات کا احساس اور بھی زیادہ

لازم ہے کہ جو کام وہ کر رہے ہیں وہ ان کے لیے بامعنی اور اہم ہے یعنی ان کے مشاغل کی نوعیت خود ان کے عمل کی محرک ہونی چاہیے - اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں - یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ مدرسے کے مشاغل بچوں کے تمام فطری جذبات اور دلچسپیوں کو ابھاریں اور ان کی تنظیم کریں - گو ان کا آخری مقصد یہی ہو کہ انہیں مفید اور ضروری علوم و فنون کی تعلیم دی جائے ' لیکن ان کی فوری غرض یہ ہونی چاہیے کہ بچوں کی روزمرہ کی زندگی اُن کے لیے زیادہ سے زیادہ خوشگوار ' نتیجہ خیز اور بامعنی تجربے سے مالا مال ہو جائے - ورنہ یہی ہوگا کہ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق بعض استاد سزا کے خوف اور آئندہ کی بہتری کے کمزور حربوں کو اِستعمال کریں گے اور بعض یہ کوشش کریں گے کہ غیر دلچسپ مضامین اور سبقوں کو عارضی اور مصنوعی طور پر دلچسپ بنانے کے لیے ایسی تدبیریں اختیار کریں جن کی تعلیمی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں - اُن تدبیروں سے کام لینا گویا کونین کی تلخ گولی شکر میں لپیٹ کر کھلانا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اس قسم کی دوا کو جو فی نفسہ ناگوار ہو ' زبردستی یا بہ لطائف الحیل کھلا دینے سے جسمانی امراض کا علاج ممکن ہے لیکن دماغی اور اخلاقی نشو و نما ایسی چیز ہے کہ جب تک اس میں خود متعلم اپنے ارادے اور خواہش سے شریک نہ ہو ' خاطرخواہ نتائج برآمد نہیں ہوسکتے - پروفیسر ڈیوئی (Deway) فرماتے ہیں کہ :—

" سوال یہ نہیں ہے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو مستقبل

کے لیے تیار کیا جائے یا نہیں - اگر تعلیم کے معنی
نشو و نما کے ہیں تو لازم ہے کہ وہ موجودہ امکانات کو
بتدریج قوت سے فعل میں لائے اور اِس طرح افراد میں
آئندہ کے فرائض پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرے - نشو و نما
کوئی ایسی چیزیں نہیں جو یوں ہی کبھی کبھی واقع ہو
جایا کرے - تو وہ برابر رفتہ رفتہ موجودہ کیفیت سے
مستقبل کی طرف بڑھنے کا نام ہے - اگر مدرسے کا ماحول
اور خارجی حالات ایسے ہیں جن میں بچوں کی موجودہ
صلاحیتوں کو مناسب طریقے پر کام میں لایا جا سکتا ہے
تو مستقبل جو حال ہی میں سے پیدا ہوتا ہے خود
بخود بہتر اور خاطرخواہ صورت اختیار کر لے گا - غلطی
یہ نہیں کہ بچوں کو مستقبل کے لیے تیار کرنے پر زور
دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس مقصد کو موجودہ کوشش اور
جد و جہد کا مرکز اور مدار قرار دیا جائے - چونکہ
واقعتاً یہ بات بہت اہم ہے کہ نوعمر طالبہ کو اس زمانے
کی زندگی کے لیے جو دم بدم ترقی کرتی رہتی ہے تیار
کیا جائے اس لیے لازم ہے کہ اُن کے موجودہ تجربات کو
معنی‌خیز اور گوناگوں بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی
جائے - جب غیر محسوس طریقے پر حال مستقبل
میں تبدیل ہو جائے گا تو ہم دیکھیں گے کہ حال کی
فکر کرنے میں مستقبل کی فکر خود بخود ہو گئی ہے" - ۱

اگر تعلیم کا مقصد محض یہی نہیں کہ بچوں کو کسی

۱—Democracy and Education صفحہ ۵۵ -

آنے والی زندگی کے لیے تیار کرے بلکہ اُن کی موجودہ زندگی کو تجربات سے مالا مال کرنا اور خوشگوار بنانا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسے کی تنظیم کس طرح کی جائے؟ ظاہر ہے کہ ہمارے مروجہ مدارس تو یہ مقصد پورا نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کی توجہ تمام تر چند مقررہ مضامین کے پڑھانے میں صرف ہوتی ہے جو نصاب کا جزو ہیں - یہ مدرسے مناسب حالات میں زندگی کی تفسیر کرنے میں مدد ضرور دیتے ہیں لیکن زندگی کے قائم مقام نہیں بن سکتے - اوپر کی تمام بحث سے جو تعلیم اور تمدن کے تعلق کو واضح کرتی ہے صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنے تعلیمی ماحول کی تنظیم اِس طرح کرنی چاہیے کہ اس میں معاشرے کی زندگی کا ایک نمونہ پایا جائے - مدرسے کو بقول پروفیسر ہاورتھ (Howarth) کے ' بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا چاہیے جس میں وہ تمام عمدہ اثرات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جو تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں - یہی بات در اصل مدرسے کی دنیا اور بیرونی دنیا میں ما بہ الامتیاز ہونی چاہیے - اُن دونوں کا اصل فرق یہ نہیں کہ دنیا میں اِنسان زندگی بسر کرتے ہیں ' کام کرتے ہیں ' تعاون اور تامل برتتے ہیں ' عمرانی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں اور مدرسے میں بچے پڑھتے ہیں ' سبق یاد کرتے ہیں ' کتابوں کے ساتھ مغز مارتے ہیں گویا یہ کہنا چاہیے کہ زندگی کو ایک دھندلے سے آئینے میں دیکھتے ہیں - زندگی کی روح تو دونوں میں یکساں ہونی چاہیے لیکن مدرسے میں یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انتخاب و تنظیم کا زیادہ عمدہ

موقع حاصل ہے - بیرونی دنیا میں آسانی کے ساتھ مختلف قسم کے اثرات میں تمیز اور انتخاب نہیں کر سکتے - اس میں بری، بھلی، نیک اور بد، نشو و نما میں مدد دینے والی اور رکاوٹ پیدا کرنے والی، غرض سب طرح کی قوتیں اور اثرات موجود ہوتے ہیں - نوعمر اور ناتجربہ‌کار بچوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ بغیر بیرونی امداد اور رہنمائی کے اُس کے عمدہ اثرات سے فائدہ اُٹھائیں اور برے اثرات سے محفوظ رہیں - علاوہ اِس کے دنیا میں اتنے مختلف قسم کے ادارے ہیں اور اُن میں باہمی کشمکش اور جد و جہد کی وجہ سے اس قدر پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں کہ نوعمر طالب بغیر رہنما کے اس بھول‌بھلیاں میں نہیں چھوڑے جا سکتے - اُن کو تنہا اس ہنگامے میں ڈھکیل دینا ایسا ہے جیسا کسی شیرخوار بچے کو مثلاً کسی بہت بڑے مشینوں کے کارخانے میں چھوڑ دینا جس کا ایک کل یا پرزہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا - اس لیے سوسائٹی نے بچوں کی تعلیم کے لیے خاص قسم کے تعلیمی ادارے قائم کر دیے ہیں - تاکہ اُن کی اثرپذیر شخصیتیں ایسے ماحول میں نشو و نما پائیں جہاں وہ اثرات نہ ہوں جو انسانی شخصیت کی نشو و نما میں حائل ہوتے ہیں - بلکہ وہ تمام محرکات اور اسباب مہیا کئے جائیں جو اُس کی تربیت میں مدد دیں -

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس خاص طرز پر ڈھالے ہوئے ماحول کی کیا خصوصیتیں ہیں جو اُس کو اور ہر قسم کے عمرانی ماحول سے ممتاز کرتی ہیں - ایک خصوصیت کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ

اس ماحول کو بیرونی دنیا کی نسبت زیادہ سادہ اور واضح ہونا چاہیے تاکہ اس کا نظم و نسق اور اصول عمل بچے کی سمجھ میں آسانی سے آ جائے - موجودہ متمدن سوسائٹی کا نظام اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ بچہ اس کو بلا واسطہ تمام و کمال کیا جزوی طور پر بھی نہیں سمجھ سکتا - اس لیے مدرسہ اس نظام میں سے اُن اجزا اور عناصر کا انتخاب کرتا ہے جو تربیت کے لیے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں اور بچوں کی زندگی کے ساتھ ہم‌آہنگ ہو سکتے ہیں اور اُن کو ایسی ترتیب سے پیش کرتا ہے کہ جو چیزیں بچہ اپنے شوق سے سیکھتا اور کرتا ہے اُنہیں کے ذریعے اُس پر علم اور واقفیت کے نئے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اِنسانی مشاغل میں سمجھ بوجھ کر شرکت کرنے لگتا ہے - نصاب کی تدوین اور مدرسے کے تمام مشاغل کی تشکیل میں معلم کو ہمیشہ یہی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ تمدنی زندگی کے اہم ترین عناصر کو سادہ اور دلچسپ شکل میں مدرسے کی زندگی کا جزو بنا دے اور اُن کی ترتیب اس طرح کرے کہ جوں جوں بچوں کی عمر اور تجربے میں ترقی ہو وہ رفتہ رفتہ تمدنی زندگی کے زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل سے روشناس ہوتا جائے - جہاں تک خود بچوں کا تعلق ہے اُنہیں ہمیشہ یہی محسوس ہونا چاہیے کہ وہ ایسے مشاغل میں شریک ہیں جو اُن کے لیے دلچسپ ہیں ' جن میں اُن کی قوتوں کا اظہار ہوتا ہے ' جن سے اُنہیں مسرت حاصل ہوتی ہے - البتہ معلم اور والدین جو اُن مشاغل کے نتائج کو سمجھ سکتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آگے چل کر اُن کی تکمیل کس شکل میں

ہوگی وہ بچوں کے طفلانہ کھیلوں اور اُن کے پڑھنے لکھنے میں اُن مہتم بالشان مقاصد کی جھلک دیکھ سکتے ہیں جن کا حاصل کرنا مدرسے کا اِنتہائی فرض ہے -

مدرسے کے ماحول کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُسے اُن اثرات سے پاک ہونا چاہیے جو طلبہ کی دماغی نشو و نما اور اُن کی معاشرتی عادات پر برا اثر ڈالیں - معاشرے کے ارباب فکر اور ارباب عمل خصوصاً معلموں اور ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ عہد حاضر کے تمدنی ورثے میں سے ان چیزوں کا انتخاب کریں جو نئی نسل کی تربیت اور معاشرے کی آئندہ ترقی کے لیے مفید ہیں اور پھر ان چیزوں کو یہ اسلوب مناسب مدرسے کے نصاب میں داخل کریں - اس زمانے میں یہ انتخاب خاص طور پر ضروری ہوگیا ہے کیونکہ ہر شعبۂ زندگی میں اس قدر تیزی کے ساتھ ترقی اور توسیع ہو رہی ہے اور علوم و فنون کی دنیا اس قدر پھیلتی چلی جاتی ہے کہ تمام چیزوں کا حاصل کرنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں - ایک زمانہ ایسا تھا جب لوگ یہ کوشش کرتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم پانے والے جملہ علوم و فنون پر عبور حاصل کریں - مشرق اور مغرب دونوں کی تعلیمی تاریخ میں ایسے دور گزرے ہیں کہ اعلیٰ درسگاہوں میں لوگ طب ، فلسفہ ، ادب ، منطق ، ریاضی وغیرہ جملہ علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور اب بھی ایک حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم کی بنیاد اسی خیال پر قائم ہے اگرچہ اب رفتار زمانہ نے اس کی ظاہری حیثیت میں تبدیلیاں کر دی ہیں - یورپ میں بھی قرون وسطیٰ میں ، بالخصوص کومینیس

(Comenius) کے زمانے تک اس قسم کی ہمہ‌دانی پر مبنی تعلیم مرتب کرنے کا شوق ماہرین تعلیم میں عام تھا - اس وقت اگر ایک حد تک یہ خیال قابل عمل تھا بھی ، تو ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ہم اس کو قابل غور بھی نہیں سمجھ سکتے - کیونکہ یہ نہ صرف ناممکن ہے بلکہ ممکن بھی ہوتا تو مفید نہیں ہو سکتا تھا - اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ وقتاً فوقتاً بہت احتیاط اور وسعت نظر کے ساتھ مدرسے کے نصاب کی چھان بین اور پڑتال کی جائے - یعنی بالفاظ دیگر معاشرے کے مشاغل اور ضروریات کا جائزہ لیا جائے کیونکہ دراصل یہی نصاب کا ماخذ اور سرچشمہ ہیں - چونکہ یہ ضروریات اور مشاغل بدلتے رہتے ہیں اس لیے نصاب میں بھی ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت ہوتی رہتی ہے - اگر اس کی طرف سے غفلت برتی جائے گی تو مدرسے کے نصاب میں ہر قسم کی رطب و یابس چیزیں بھر جائیں گی - بہت سی چیزیں جن کی اہمیت عارضی ہے یا کم ہے یا بالکل نہیں وہ نصاب کا جزو بن جائیں گی اور بہت سی ضروری چیزیں ناواقفیت کی وجہ سے یا اس اندیشے سے چھوٹ جائیں گی کہ نصاب میں بہت زیادہ مضامین کا ہجوم نہ ہو جائے - اس میں بہت سے دور از کار مضامین جو ماضی کی یادگار ہیں اور حال کی ضروریات سے ہم‌آہنگ نہیں محض قدامت‌پرستی کی وجہ سے باقی رہ جائیں گے ، بعض مضامین انفرادی ذوق کی وجہ سے داخل ہو جائیں گے اور نصاب کے مسئلے پر جو ایک طرف تمدنی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسری طرف بچوں کی نفسی زندگی سے ، کماحقہ غور نہ ہو سکے گا -

ہم آئندہ کسی باب میں حساب کے مسئلے پر بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ ہمیں نہ صرف درسی حساب کے مضامین میں ترمیم اور انتخاب کی ضرورت ہے - بلکہ موجودہ اصول انتخاب کو صحیح راستے پر لانا ہے - ہمارا مقصد مدرسے کی تعلیم سے یہ بھی نہیں کہ مفید ترین علوم و فنون کی تمام ضروری ضروری ابتدائی باتیں بچے کو سکھا دی جائیں کیونکہ ان کا دائرہ بھی بہت بڑا ہے اور ایک محدود مدت میں کسی اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے طالب علم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ادب' سائنس' علم معاشرت اور آرٹ کی مبادیات پر بھی عبور حاصل کر سکے - ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس میں اس امر کی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ مدرسے کی ذہنی تربیت کی مدد سے اپنی ضرورت اور مصلحت کے مطابق آئندہ چل کر جس علم یا ہنر کو ضروری سمجھے اسے حاصل کر سکے - یعنی اسے علوم پر نہیں بلکہ تحصیل علم و فن کے ذرائع اور وسائل پر قابو حاصل ہو جائے - ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ مدرسے کی مختصر زندگی کے دوران میں طالب علم اس ساری زمین کو کھود کر کاشت کرے جو اس کو زندگی بھر میں درکار ہوگی - لیکن ہم مدرسے کی تعلیم کی بدولت اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت' اس کے دماغ میں بیداری' حوصلہ اور جوش' اس کے دل میں ولولۂ عمل پیدا کر دیں اور اس کے ہاتھ میں ایسے اوزار دے دیں کہ وہ آگے چل کر بغیر کسی بیرونی جبر یا تحریص یا نگرانی کے جس زمین کو چاہے کھود کر کاشت کرے اور اسے لہلہاتا ہوا کھیت یا ہرا بھرا چمن بنا دے - یہ

ھے تعلیمی ماحول کی دوسری خصوصیت کہ وہ تمدن حاضرہ کے بےشمار مظاھر میں سے بہترین اور مفیدترین کو چن کر انہیں نوعمر بچوں کے گرد اس طرح ترتیب دے کہ ان میں منہمک ھو کر اپنے اندر اس تمدن کو سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت پیدا کریں -

تعلیمی ماحول کی تیسری خصوصیت پروفیسر ڈیوئی (Dewey) یہ بیان کرتے ھیں [1] کہ وہ تمدنی ماحول کے مختلف عناصر میں ھم‌آھنگی اور توازن پیدا کرتا ھے - اکثر بچوں کا گھر اور پڑوس کا ماحول بہت تنگ اور محدود ھوتا ھے اور اس میں اتنی گنجائش اور امکانات نہیں ھوتے کہ وہ ان کی مجموعی اور مکمل تربیت کر سکے - مثلاً ایک بچہ کسی صناع یا مزدور کے گھر میں پیدا ھوتا ھے تو اس کے گرد و پیش کے تمام حالات اس کو مزدوری یا صنعت و حرفت کی طرف رغبت دلاتے ھیں - اسی قسم کے خیالات ' جذبات اور دلچسپیاں اس میں پیدا کرتے ھیں - اسی طرح اگر کوئی بچہ کسی دولت‌مند گھرانے میں پیدا ھوتا ھے جس کے افراد کوئی خاص کام نہیں کرتے تو وہ صنعت و محنت کے سارے نظام سے ناواقف رھتا ھے اور اس کو یہ بھی نہیں معلوم ھوتا کہ

ز مزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیب خواجۂ ناکردہ‌کار رخت حریر

اگر کوئی بچہ گاؤں میں کسی کاشتکار کے یہاں پیدا ھوتا

۱—Democracy and Education باب اول صفحہ ۲۳ - ۲۶ -

ہے تو وہ اکثر صورتوں میں نہ صرف موجودہ صنعت و حرفت کے نظام اور شہری زندگی سے بےخبر ہوتا ہے بلکہ اُن تمام تہذیبی مشاغل سے بھی نابلد رہتا ہے جن میں فرصت کا وقت خوش‌دلی اور عمدگی سے بسر ہو سکتا ہے - غرض خواہ بچہ معاشرے کے کسی طبقے میں پیدا ہو وہ اپنے محدود ماحول میں مقید ہوتا ہے اور آسانی سے اس سے باہر نہیں نکل سکتا - صرف مدرسہ ہی ایک ایسا منظم اور گوناگوں ماحول ہے جہاں خاص طور پر اس بات کا التزام ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ بچے کی نشو و نما کے لیے ایک مناسب فضا پیدا کی جائے جس میں وہ مختلف قسم کے دماغی اور جسمانی مشاغل میں شریک ہو سکے اور مکمل اور ہم‌آہنگ تربیت پا سکے اور ساتھ ہی وہ ان مشاغل کے دوران میں اپنی مخصوص صلاحیتوں اور رجحانات کا پتا چلا سکے - مدرسے کو اس کے لیے ایک آزاد ماحول ہونا چاہیے جہاں وہ اپنی تعلیم کے زمانے میں بغیر بےجا روک ٹوک کے مختلف قسم کے تجربے کر سکے اور زندگی کی مختلف راہوں سے واقفیت حاصل کرے - مدرسے سے باہر دنیا میں مختلف قسم کے ادارے ہیں جو نوعمر طلبہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں - ہر فرد صرف ایک ہی جماعت کا رکن نہیں ہوتا بلکہ بہت سی جماعتوں میں شریک ہوتا ہے اور ان میں سے ہر جماعت کی رکنیت سے اس کی طبیعت اور مشاغل اور دلچسپیوں پر اثر پڑتا ہے جیسا کہ ہم اس سے اگلے باب میں وضاحت کے ساتھ بتائیں گے - ہر معاشرتی ادارہ خواہ اس کا تعلق اقتصادی مسائل سے ہو، یا سیاسی مسائل سے، یا وہ خلاف قانون اور

منضبط اخلاق اغراض کی تکمیل کے لیے قائم کیا گیا ہو، اپنے اراکین کی تربیت میں دخیل ہوتا ہے اور وہ افراد جو اس میں شریک ہوتے ہیں اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں نئے تجربات سے متاثر ہوتے ہیں - اس کشمکش کی زندگی میں جہاں ہر فرد پر مختلف اور متضاد قوتوں کے اثرات کام کرتے رہتے ہیں بچوں کے لیے مدرسہ نہ صرف ایک تربیت‌گاہ ہے بلکہ جاے امن ہے - یہاں بغیر اُس کی شعوری واقفیت کے اس کے نفس میں ان اخلاقی قدروں اور معیاروں کا نظام مرتب ہوتا ہے جو تمام عمر اس کی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں - اگر معاشرہ اس قسم کا کوئی مرکزی ادارہ قائم نہ کرے تو نوعمر نسلوں کی تربیت بہت ناقص، نامکمل اور یک‌طرفہ ہو اور ان کی طبیعتوں میں بھی وہ توازن اور انصاف‌پسندی پیدا نہ ہو سکے جو حقیقی تہذیب کی بنیاد ہیں اور جن کی بدولت انسان نظری تحقیق اور عملی زندگی میں متانت اور سلامت‌روی سے کام لیتا ہے اور ہر بات کے کل پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کرتا ہے - اس زمانے میں جب ہمارے ملک میں باہمی اختلافات بےحد بڑھ چکے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں بلکہ اختلافات کی حد سے گزر کر مناقشات کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں اور معاشرہ بےشمار جماعتوں میں تقسیم ہوتا چلا جا رہا ہے جن میں اغراض و مقاصد، رسوم و روایات کا فرق ہے، ایک ایسے تعلیمی نظام کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے جو قوم کے تمام بچوں اور نوجوانوں کے لیے ایک سا ماحول مہیا کرے اور مناسب حد تک ان میں یکسانی پیدا کرے - جب کسی مدرسے میں بہت سے بچے جن کا تعلق مختلف

معاشرتی طبقوں، مذہبوں اور جماعتوں سے ہوتا ہے ساتھ پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں، مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں تو ان کے لیے مدرسے ان کے گھروں سے زیادہ وسیع اور موثر ماحول بن جاتا ہے جہاں ایک ہی قسم کے مشاغل میں مصروف رہ کر ان میں اتحاد خیال اور ہمرنگی پیدا ہو جاتی ہے جو ایک ملک کے باشندوں اور ایک قوم کے افراد کے لیے لازم ہے - " مدرسے کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ہر فرد کی طبیعت میں اُن تمام اثرات کی ہم‌آہنگ تنظیم کرے جو مختلف معاشرتی اداروں میں شرکت کرنے سے حاصل ہوتے ہیں - گھر کی زندگی میں ایک ضابطۂ اخلاق کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور گلی اور بازار میں دوسرے کی، دکانوں کارخانوں میں تیسرے کی، مذہبی تعلقات میں چوتھے کی - جب ایک ہی آدمی ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جاتا ہے تو اس پر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی قوتیں عمل کرتی ہیں اور اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت پر ایسا اثر پڑے کہ وہ مختلف موقعوں پر عمل و جذبات کے مختلف مقتضا اور معیار کے مطابق کام کرے - اس وجہ سے مدرسے کا فرض ہے کہ بچوں کی طبیعت میں استقلال اور وحدت کا رنگ پیدا کرے "[1] -

اگر مدرسے میں تربیت کا انتظام اچھا ہے تو بچے کی زندگی اور کردار کے لیے ایسے اٹل قانون قائم ہو جائیں گے جو اس کو آئندہ زندگی میں سیدھے راستے پر چلاتے ہیں اور ایسے وقت میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں جب مختلف قسم کی

---

1 - Democracy and Education صفحہ ۲۶ -

ترغیبیں اور ماحول کے اثرات ان کو مختلف سمتوں میں کھینچتے ہیں اور عقل، جوانی کی اندھیری رات میں راستہ ٹٹولتی ہوئی بھٹکتی پھرتی ہے -

---

باب دوم

تعلیم اور تمدنی ادارے

هم نے گزشتہ باب میں، مختصر اور عام الفاظ میں تعلیم اور تمدن کا تعلق ظاهر کرنے کی کوشش کی هے اور بتایا هے تمدنی زندگی کا سلسلہ نسلاً بعد نسل اس طرح قائم رهتا هے کہ کہ مختلف ذرائع اور وسائل سے هر نسل اپنے تمدنی ورثے کو جس میں وہ خود اپنی جد و جہد سے اضافہ کرتی هے اپنے بعد آنے والی نسل کی طرف منتقل کر دیتی هے - جب یہ عمل انتقال دو فریقوں کے درمیان واقع هو جن میں سے ایک پختہ‌کار اور سن رسیدہ هے اور دوسرا ناتجربہ‌کار اور نوعمر تو هم اسے اصطلاحاً تعلیم و تربیت کے نام سے موسوم کرتے هیں - یہ تعلیم و تربیت جیسا کہ هم اوپر بتا چکے هیں معاشرہ براہ راست بھی کرتا رهتا هے اور بہت سی مفید اور ضروری باتیں جو بچے سیکھتے هیں وہ زیادہ تر معاشرے کے بلا واسطہ اثر سے سیکھتے هیں یعنی بچے ان مشاغل میں جو ان کے گرد و پیش هوتے رهتے هیں شرکت کرتے هیں اور عملی تجربے کی بدولت اپنی واقفیت اور کارکردگی میں اضافہ کرتے هیں - لیکن معاشرے کی موجودہ حالت میں تمدنی ترقی کی وجہ سے هم اس بلاواسطہ تعلیم پر

اکتفا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہوتی - اور اس میں وہ نظم و تربیت نہیں پائی جاتی جو ایک مخصوص تعلیمی ماحول میں ہونا چاہیے جہاں ہر کام اس مقصد سے داخل کیا جاے کہ اس کے ذریعے بچوں کی مکمل تربیت اور نشو و نما ان کی نفسی زندگی کے قوانین کے مطابق ہو سکے - لہذا باقاعدہ مدرسوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور تعلیمی ادارے قائم کئے گئے جن کی بعض اہم خصوصیات کا ذکر ہم کر چکے ہیں -

اس تمام بحث میں ہم نے تعلیم کے لفظ کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے - ایک تو وہ خاص مفہوم ہے جس سے ہر شخص واقف ہے اور جو " علم " کے لفظ کے ساتھ وابستہ ہے - اس معنی میں مدرسوں میں " تعلیم " دی جاتی ہے یعنی طالبہ کو بعض علم و فنون سکھائے جاتے ہیں جو بعد کی زندگی میں ان کے کام آتے ہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں - اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے اور اسے لفظ تعلیم کے دوسرے وسیع معنی سے ممیز کرنے کے لیے انگریزی میں (Instruction) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے لغوی معنی " سکھانے " کے ہیں - پروفیسر فنڈلے (Findlay) نے اپنی کتاب " مدرسہ " (The School) میں تعلیم کی یہ تعریف کی ہے :—

" تعلیم ان تدابیر اور وسائل کے مجموعے کا نام ہے جو نوعمروں کو تمدنی زندگی کا اہل بنانے کے لیے بالارادہ کام میں لائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے ان کے دماغوں کو بعض خاص اثرات اور مقاصد سے متاثر کیا جاتا ہے " -

اس تعریف میں زور اس بات پر دیا گیا ھے کہ معاشرے کے بالغ اور ذمہ‌دار افراد بالارادہ نوعمر بچوں اور نوجوانوں کی تشکیل سیرت میں حصہ لیں اور ان کی نشو و نما پر اثر ڈالیں - اس محدود معنی میں تعلیم کا عمل دو فریقوں سے تعلق رکھتا ھے - ایک طرف والدین اور اساتذہ وغیرہ کی جماعت ھے اور دوسری طرف نوعمر بچے - ان کی باھمی اثر آفرینی اور اثر پزیری تعلیم کہلاتی ھے - تعلیم کا ایک دوسرا مفہوم زیادہ عام اور وسیع ھے جس کے مطابق انسان کو زندگی اور اس کے تمام مظاھر اور ادارے تعلیم دیتے ھیں - اس کے لیے انگریزی میں (Education) کا لفظ استعمال ھوتا ھے - جس کا ترجمہ " تربیت " کیا جا سکتا ھے - بعض مصنفوں نے " تعلیم " اور " تربیت " کے الفاظ کو ان معنوں میں احتیاط کے ساتھ علحدہ علحدہ استعمال کیا ھے " تعلیم کو مدرسے کے اندر علوم و فنون سکھانے کے محدود معنی میں اور " تربیت " کو عام ذھنی نشو و نما کے معنی میں - لیکن ھم ان الفاظ کو اس طرح استعمال نہیں کرتے - اول تو اردو میں یہ تفریق رائج نہیں - دوسرے معنوی اور نفسی اعتبار سے بھی یہ مناسب نہیں کہ ان میں ایک حد فاصل قائم کر دی جائے کیونکہ در اصل تعلیم و تربیت کے حدود آپس میں ملتے ھیں اور ان میں آسانی سے تمیز نہیں کی جا سکتی - جب ھم کسی بچے کو کوئی نیا علم یا فن سکھاتے ھیں مثلاً اس کو پڑھنے یا لکھنے کی تعلیم دیتے ھیں یا ڈرائنگ اور مصوری کا ھنر سکھاتے ھیں تو اس کا اثر محض دماغی تعلیم تک محدود نہیں رھتا بلکہ اس کی شخصیت کی عام تربیت اور نشو و نما

میں بھی معین ہوتا ہے - اسی طرح جو تربیت ہم عمرانی زندگی میں براہ راست شریک ہوکر حاصل کرتے ہیں وہ ہمارے علم میں بھی اضافہ کرتی ہے اور اس کا اثر مدرسے کی تعلیم پر بھی پڑتا ہے - اس لیے ہم حسب ضرورت کہیں دونوں الفاظ کا استعمال کریں گے اور کہیں صرف ایک کا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمیں اس عمل کے کسی پہلو پر زور دینا مقصود ہے -

ہماری شعوری کوششوں سے بہت پہلے فطرت نے وسیع معنی میں نسل انسانی کی تعلیم و تربیت کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا - اس کے تمام مظاہر اور تمام قوتیں ابتدائی زمانے کی انسانی جماعتوں پر مختلف طریقوں سے اپنا اثر ڈالتی تھیں اور ان کے مفید اور مضر اثرات کا تجربہ حاصل کر کے انسان اپنے اعمال و افعال میں حسب ضرورت ترمیم اور تغیر کرتے تھے - اِس اثرآفرینی کا ذریعہ قدرتی ضبط اور سزا کا وہی طریقہ تھا جس کا ذکر ہم گزشتہ باب میں کر چکے ہیں - لیکن جب معاشرتی اور تمدنی ادارے قائم ہوئے اور افراد ان میں شریک ہونے لگے تو تعلیم و تربیت کے نئے ذرائع اور وسائل پیدا ہوگئے - کیونکہ فطرت کی قوتوں کی طرح ' نظام معاشرت کے اثرات نے بھی ان کی طبیعت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا - حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملہ جو دو انسانوں میں ہوتا ہے ' ہر تجربہ جو ہم معاشرتی زندگی یا قدرتی مظاہر کے سابقے سے حاصل کرتے ہیں ہمارے خیالات ' ہمارے چال چلن ہماری کارکردگی پر اثر ڈالتا ہے اور ہمارے عام رویے میں تبدیلی پیدا کرتا ہے - یہ اثر سب لوگوں کے لیے عام ہے خواہ وہ نوعمر ہوں یا سن رسیدہ - اس معنی

میں ہم ہر معاملے اور ہر تجربے کو اپنا معلم کہہ سکتے ہیں
کیونکہ وہ ہماری طبیعت اور ہمارے اعمال میں تبدیلی پیدا
کرتا ہے - بہ قول غالب :

اہل بینش کو ہے توفان حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں !

غرض " تربیت " وہ عمل ہے جس کے ذریعے سے شعوری یا
غیرشعوری طور پر ' بلاواسطہ یا بالواسطہ ' افراد (بالخصوص
بچوں) کی حرکات اور اعمال کی نگہداشت اور اصلاح کی جاتی
ہے - تاکہ ان میں بعض تبدیلیاں جو پسندیدہ سمجھی
جاتی ہیں پیدا کی جائیں - ان تبدیلیوں کو پیدا کرنا اور
نوعمروں کی طبیعت کو ان مقاصد اور اصولوں کے مطابق ڈھالنا
جو بحیثیت مجموعی اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے بہترین
قرار پائیں معلموں اور تعلیم گاہوں کا فرض منصبی ہے - لیکن
ظاہر ہے کہ یہ فرض محض تعلیم گاہوں تک محدود نہیں '
نہ وہ اس کو بغیر بیرونی امداد کے پورا کر سکتی ہیں - بچے
کی طبیعت کی ساخت اور تشکیل میں ' اس کی ابتدائی
تربیت میں ' اس کے شوقوں اور رجحانوں کے ابھارنے اور سدھارنے
میں مدرسے کے علاوہ اور بھی بہت سے تمدنی اداروں کو دخل
ہے - ان میں سے بعض کو تمام عمر اور بعض کو زندگی کی
مخصوص منازل میں انسان کی ذہنی نشو و نما سے بہت
قریبی اور گہرا تعلق ہوتا ہے - جو شخص مسئلۂ تعلیم پر
غائر اور وسیع نظر ڈالنا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ
ان تمام عناصر اور قوتوں کو خیال میں رکھے جو بچے کی
شخصیت کو بناتی یا بگاڑتی ہیں اور مدرسے کے کام میں مدد

دیتی ہیں یا اس میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں - تعلیمی مباحث کے لیے یہ وسعت نظر نہایت اہم ہے - کیونکہ اس کے بغیر ہم مدرسے کو ایک مفید اور موثر ماحول نہیں بنا سکتے - مدرسے کے بےشمار اور گوناگوں مسائل مدرسے کی چاردیواری ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ تمدنی زندگی کے وسیع اور ہمہ‌گیر نظام کے مختلف شعبوں میں ان کی ابتدا ہوتی ہے اور وہاں سے ان کا اثر مدرسے کے اندر پہنچتا ہے - مدرسے کا خاص کام یہ ہے کہ وہ ان مسائل کے حل کرنے میں بچوں کی مخصوص ضرورتوں اور نفسی کیفیتوں کا لحاظ رکھے - مدرسے کے باہر معاشرے کے بالغ افراد بھی ان مسائل سے دو چار ہوتے ہیں - لیکن وہ ان کا حل دوسرے اثرات اور تجربات کی رہنمائی میں تلاش کرتے ہیں - مدرسہ ان سب چیزوں سے مسالے کا کام لیتا ہے اور ان کی تشکیل ایک مخصوص طرز پر کرتا ہے - اس لیے تمام تمدنی اداروں سے ہر وقت اس کا رابطہ قائم رہتا ہے اور رہنا چاہیے - اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ مدرسہ محض ایک رسمی درس‌گاہ بن کر رہ جائے گا جہاں زندگی کے بہترین عناصر کا تجربہ حاصل ہونے کے بجائے محض کتابوں کے سبق پڑھائے جاتے ہیں اور تربیت قدرتی اصولوں کے مطابق نہیں مصنوعی اور دور از کار طریقوں سے ہوتی ہے - جو استاد یا ماہرین تعلیم مدرسے اور نظام تمدن کا صحیح تعلق نہیں سمجھتے وہ ہمیشہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ مدرسے کے سبقوں اور درسی مشقوں کو مقصود بالذات بنا لیتے ہیں اور اس اصول کو بھول جاتے ہیں کہ ہم بچے کو کوئی چیز ، کوئی بات ، کوئی کام بلا واسطہ نہیں سکھا سکتے -

طبیعت کی تشکیل ہمیشہ ان مشاغل میں شرکت کرنے سے ہوتی ہے جو معاشرے میں رائج ہیں یا مناسب ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ مدرسے میں رائج کئے جاتے ہیں - مدرسے کو اپنے مخصوص کام میں حقیقی کامیابی صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب اس کا طریقۂ تعلیم انہیں اصولوں پر مبنی ہو جن پر عمل کرنے سے تمدنی زندگی کا نظام اور ربط قائم ہے - اور وہ انہیں محرکات عمل سے کام لے جو بالغ افراد کی زندگی میں کارفرما ہیں - ورنہ محض کتابی اور لفظی تعلیم کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو طوطوں کو رٹانے کا - یعنی بچوں کی واقفیت سطحی اور اوپری ہوتی ہے اور ان کے اخلاق و عادات محض نقالی بن کر رہ جاتے ہیں - " بچوں کے نفس میں ان عادات اور رجحانات کی تربیت کے لیے جو عمرانی زندگی میں تسلسل اور ترقی کو قائم رکھتے ہیں یہ طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا کہ براہ راست انہیں الفاظ کے ذریعے عقائد ' جذبات اور معلومات کا درس دیا جائے - طبیعت کی مستقل اور ہمہ گیر تشکیل دانشمندی کے ساتھ اسی وقت ہو سکتی ہے جب نوعمر بچے رفتہ رفتہ ان مختلف عمرانی جماعتوں کے مشاغل میں حصہ لیں جن سے وہ تعلق رکھتے ہیں [1] -

اس باب میں ہم انہیں عمرانی جماعتوں کے نظام اور تعلیمی اثرات سے بحث کرنا چاہتے ہیں جن سے بچے کو تعلق ہوتا ہے اور جو اس کی تربیت پر گہرا اور پائدار اثر ڈالتے ہیں - ہم دیکھ چکے ہیں کہ دو اشخاص یا دو جماعتوں کے باہمی

---

1 — Dewey : Democracy and Education صفحہ ۲۶ -

تعلق اور ربط سے ہمیشہ دونوں پر کچھ نہ کچھ ' برا یا بھلا ' اثر ضرور پڑتا ہے - یہ تعلقات عمرانی زندگی میں محض اتفاقی اور عارضی نہیں بلکہ اپنی اپنی نوعیت کے مطابق مستقل اداروں (institutions) کی شکل میں منظم ہیں - ان میں سے بعض ایسے ہیں جن میں افراد کا تعلق اور اشتراک عمل بہت گہرا اور قریب کا ہوتا ہے اور وہ براہ راست ایک دوسرے سے مل جل سکتے ہیں - مثلاً خاندان ' کھیل کی ٹیمیں ' محلے والوں کی جماعت - بعض اداروں میں باہمی تعلقات ایک حد تک بلاواسطہ ہوتے ہیں اور ایک حد تک بالواسطہ - مثلاً مدرسے یا مذہبی جماعتیں ' یا امداد باہمی کی مختلف قسم کی انجمنیں - ان میں افراد ایک دوسرے سے براہ راست بھی ملتے جلتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں اور بعض اثرات بغیر ذاتی میل جول کے بھی اپنے کام کرتے ہیں - مثلاً مدرسہ ایک لحاظ سے ایک مقامی ادارہ ہے جس میں استاد طلبہ آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ذاتی تعلقات سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک لحاظ سے اس کے اثرات غیر شخصی ہوتے ہیں - کتابیں ' تعلیمی آلات اور وسائل ' مدرسے کا علم نظم و نسق ایسی چیزیں ہیں جو تمام تعلیمی اداروں ' معلموں اور متعلموں کو ایک سلسلے میں منسلک کرتی ہیں - اسی طرح مذہبی اداروں میں جہاں لوگ ایک دوسرے سے یا مذہبی پیشواؤں کی زندگی سے براہ راست مستفید ہوتے ہیں وہاں ان کے خیالات اور عقائد پر رسوم و عبادات اور روایات کا بھی اثر پڑتا ہے - تیسری شکل ان تمدنی اداروں کی ایسی ہے جن میں افراد میں بلاواسطہ تعلق بہت ہی کم ہوتا ہے

یا بالکل نہیں ہوتا بلکہ باوجود بعد مقام کے تمام اراکین ایک سلسلے میں منسلک ہوتے ہیں - مثلاً ریاست کا نظام ' صنعت و حرفت کے کارخانے ' یا علمی تحقیق و تفتیش کرنے والوں کی جماعتیں جن کے ارکان کا ایک دوسرے سے ذاتی طور پر ملنا جلنا ضروری نہیں - وہ اپنے اپنے اداروں کے عام نظم و نسق سے متاثر ہوتے ہیں ' کتابوں ' کانفرنسوں ' رسالوں کی مدد سے ایک دوسرے کے کام سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور گو باہم صورت آشنا تک نہ ہوں مگر حقیقت میں ایک ہی جماعت کے رکن ہوتے ہیں -

مندرجۂ بالا تقسیم پروفیسر اسمتھ (Smith) نے اپنی کتاب " معاشیات تعلیمی " (Educational Sociology) میں افراد کے باہمی تعلقات کی بنا پر کی ہے - اگر ان اداروں کی تقسیم ان کے مقاصد کے لحاظ سے کی جائے تو ہمیں میکنزی (Mackenzie) کے نقطۂ نظر سے مدد ملے گی [1] اس کے خیال کے مطابق بعض جماعتوں اور اداروں کا مقصد مذہبی یا تہذیبی ہوتا ہے جن میں بنائے اشتراک یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب نفس یا تفریح کے لیے اجتماعی طور پر اہتمام کریں - اس ذیل میں ہم مذہبی نظاموں ' تعلیمی اداروں ' علمی انجمنوں اور فنون لطیفہ کے مرکزوں کو شمار کر سکتے ہیں - دوسری قسم ان جماعتوں کی ہے جن کی وجہ قیام اقتصادی ہے اور مادی کار و بار سے تعلق رکھتی ہے

۱—دیکھو میکینزی : زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamental Problems of life) صفحہ ۱۵۹ -

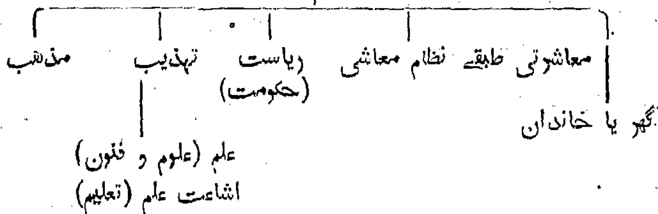
مثلاً مختلف پیشوں کی برادریاں ' صنعت و حرفت کے کارخانے ' وہ تمام اِدارے جو پیدائش دولت اور تقسیم دولت کا کام انجام دیتے ہیں - اور بعض اوقات ایک دوسرے سے بالکل علحدہ اور دور رہنے والے لوگوں کو ایک رشتے میں منسلک کرتے ہیں - تیسری قسم ان جماعتوں کی ہے جن کی بنیاد قانونی ہے - ان کی سب سے اہم اور بڑی مثال ریاست ہے - اُن تمام اداروں سے مل کر ہمارا تمدنی ماحول بنا ہے - بقول پروفیسر ایڈمسن (Adomson) یہ ہماری "دنیاے تمدن" ہے جو "طبعی دنیا" اور "اخلاقی دنیا" کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے [۱] - اور ہماری فطرت کے اظہار کے لیے مواقع اور وسائل بہم پہنچاتی ہے - بچے ' جوان ' بوڑھے سب اپنی اپنی قابلیت اور حالات کے مطابق ان کے مشاغل میں حصہ لیتے ہیں اور اپنی قوتوں اور جبلتوں کا اظہار کرتے ہیں اور اسی طرح ان کی علمی ' اخلاقی اور تمدنی نشو و نما ہوتی ہے جس کا تجربہ آئندہ باب میں صراحت کے ساتھ کیا جائے گا -

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم اُن تمام جماعتوں اور اداروں کے تعلیمی اثرات سے بحث کر سکیں جو بچے کی زندگی کا احاطہ کئے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی تفصیل کے لیے معاشرے کے ہر شغل کا تجزیہ لازم آتا ہے - اس لیے ہم مختصراً صرف ان اداروں کا ذکر کریں گے جو بچے کی زندگی

۱—ایڈمسن (Adamson) نے اپنی معرکۃالارا تصنیف "فرد اور ماحول" (Individual Environment) میں انسانی ماحول کی تقسیم اس عنوان سے کی ہے -

سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں اور مدرسے کے نصاب اور نظام عمل پر اثر ڈالتے ہیں -

پروفیسر فنڈلے (Findlay) نے اپنی تازہ تصنیف " تعلیم کی بنیادیں " (Foundations of Education) میں ان اداروں کو مندرجۂ ذیل نقشے کے ذریعے ظاہر کیا ہے :—



کتاب کے اس حصے میں ہم ان مختلف اداروں کے تعلیمی اثرات اور مطالبات سے بحث کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ دور حاضر میں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں جنھوں نے ہمارے نظام تعلیم کو صریحاً متاثر کیا ہے ۔ البتہ تہذیب اور مذہب کے اثرات بحث کو کتاب کے آخری حصے کے لیے ملتوی رکھیں گے جس کا تعلق طلبہ کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت کے مسائل سے ہے -

باب سوم

خانگی اور معاشری زندگی کے اثرات

بچے کی درسگاہ اولین

گھر کی زندگی . اور خاندان کے افراد کا جو اثر اوائل عمر میں بچے کی شخصیت پر پڑتا ھے اس کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات ہر شخص کے ذاتی مشاہدے اور تجربے میں آتی ھے - پہلے ماں کی گود میں اور اس کے بعد اور گھر والوں کی صحبت میں بچہ وہ ابتدائی حرکات اور مشاغل سیکھتا ھے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں - اور یہی نہیں بلکہ اس کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت بھی زیادہ تر گھر ھی میں ہوتی ھے - یہاں وہ سب سے پہلے یہ محسوس کرتا ھے کہ کس طرح متعدد افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر مشترک مقاصد کے لیے کوشاں ہیں اور جب تک اُن میں سے ہر ایک اپنا اپنا کام نہ کرے گھر کا کارخانہ نہیں چل سکتا - باہمی احتیاج اور امداد کا یہ احساس ساری اخلاقی اور تمدنی تربیت کی بنیاد ھے - اس میں شک نہیں کہ جیسا ارسطو نے کہا ھے اور سب تمدنی اداروں کی طرح خاندان کی ابتدائی غرض بھی محض زندگی

کو قائم رکھنا - لیکن رفتہ رفتہ اس کے مقاصد میں اچھی طرح زندگی بسر کرنا بھی شامل ہو جاتا ہے - لیکن یہ امر کہ خاندان کا اثر بچے کی طبیعت اور خیالات پر خوشگوار ہوگا یا نہیں خاندان کی پرانی روایات اور اصول اور بزرگوں کے طرز عمل اور مثال پر منحصر ہے - اگر اس کے محدود ماحول میں ایسے مواقع موجود ہیں جن سے فائدہ اُٹھاکر بچے اپنی شخصیت کی تشکیل اور اپنی جبلتوں کا اظہار کر سکتے ہیں تو اس کا اثر ان کی زندگی پر اچھا پڑتا ہے - بر خلاف اس کے اگر خاندانی روایات تنگ نظری پیدا کر کے بچوں کے مشاغل اور دلچسپیوں کا میدان بہت محدود کر دیتی ہیں اور رسم و رواج اور بزرگوں کی سخت گیر طبیعت کے دباؤ سے ان کی شخصیت اُبھرنے نہیں پاتی تو اسی کا مجموعی اثر جیسا کہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں بہت خراب ہوتا ہے - کیونکہ جب بچوں کی تربیت کی بنیاد ہی کمزور ہوگئی تو اس پر جو عمارت بنائی جائے وہ کسی طرح مستحکم نہیں ہو سکتی -

خشت اول چوں نہید معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج!

بچے کی سیرت کی تشکیل میں گھر کی زندگی کے دو اثرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ایک طرف تو وہ بچے کو تمدنی زندگی کے سب سے پہلے اور سادہ ترین نظام سے آشنا کرتی ہے اور اس کے دل میں محبت ' ہمدردی اور تعاون کا بیج بوتی ہے اور دوسری طرف بچے کی شخصیت اور انفرادیت کی حفاظت کرتی ہے - ہر ماں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا بچہ دنیا سے

نرالا اور سب بچوں سے بڑھ کر ہے - وہ اس نظر میں غیر معمولی طور پر ذہین اور محبت کرنے والا اور عجیب و غریب صفات کا مالک ہوتا ہے یعنی ماں جو گھر کی سردار اور اس کی روح کا بہترین مظہر ہوتی ہے ہر بچے کی غیر محدود انفرادی قدر کو تسلیم کرتی ہے - اس کا یہ نقطۂ نظر ' خواہ وہ محبت کی وجہ سے کتنا ہی مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو ' معلم کے رسمی نقطۂ نظر کی نسبت حقیقت سے زیادہ قریب ہے - معلم بالعموم یہ سمجھتا ہے کہ سب بچے ایک لاٹھی سے ہانکے جاسکتے ہیں اور ان سے ایک ہی قسم کے معیار عمل کی توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ اسے یہ بات اچھی طرح محسوس نہیں ہوتی کہ ان میں سیرت اور قابلیت کے اعتبار سے کسی قدر بین فرق ہوتا ہے - زمانۂ حال کی نفسیاتی تحقیقات نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ ان بچوں میں بھی جو ایک ہی یا ایک سے ماحول میں رہتے ہیں اور ایک ہی تعلیمی منزل میں ہوتے ہیں بعض اوقات نہایت زبردست دماغی اور جذباتی اختلافات پائے جاتے ہیں جن کی طرف سے بے پروائی برتنے سے اکثر طلبہ کی زندگی برباد ہو جاتی ہے یا کم سے کم ان کی ابتدائی تربیت ناقص رہ جاتی ہے اور ان کی صلاحیتوں کی ارتقا پوری طرح نہیں ہونے پاتی - مندرجۂ بالا بحث میں بچوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بڑی حد تک ان نوجوانوں پر بھی عائد ہوتا ہے جو بچپن کی وادی عیش سے نکل کر شباب کی پرآشوب منزل میں قدم رکھتے ہیں - بچپن میں ' جب عادتیں مستحکم ہونی شروع ہوتی ہیں اور طلبہ کے جذباتی میلانات نشو و نما پاتے ہیں ' گھر کا اثر مدرسے سے بہت زیادہ

دیرپا اور وسیع ہوتا ہے - اس کے بعد نوجوانی کے دور میں جب بچپن کا توازن تہ و بالا ہو جاتا ہے نئی جبلتیں اور نئے جذبات رونما ہوتے ہیں اور نوجوان طالب علم کو طرح طرح کی تحریصوں اور کششوں کے درمیان اپنے لیے راہ نکالنا پڑتی ہے - اس وقت بھی گھر کی فضا اور روایات اس کی رہنمائی کرتی ہیں - ممکن ہے کہ یہ فضا خراب اور یہ روایات ناقص اور گمراہ کن ہوں - ایسی حالت میں نوجوان کی بے مرکز زندگی کا خدا حافظ ہے - لیکن اگر اس وقت والدین اور بھائی بہن اور عزیزترین دوستوں کی محبت اور مثال خاموشی کے ساتھ اپنا عمدہ اثر ڈالتی ہے تو نوجوان کی زندگی ہمیشہ کے لیے سدھر جاتی ہے - اسی جد و جہد اور کشمکش کے دور میں اگر نوجوان کو یہ احساس ہو کہ اس کا گھر اس کے لیے ایک امن و سکون کی منزل ہے جہاں ایسے اصولوں اور قدروں کی حکمرانی ہے جن کا وہ احترام کرتا ہے تو ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ وہ اس تقریب اور اطمینان قلب کی بدولت تمام تحریصات پر غالب آئے - بقول ڈاکٹر وہیلر کے :—

”والدین اور بھائی بہنوں کی محبت ، گھر کی مسرت بخش زندگی ، عزیزوں کی باہمی مراعات ، وہ بےتکلفی اور ارتباط جو ایک چھوٹی سی قدرتی جماعت ہی میں پیدا ہو سکتا ہے ، حفظ حقوق و مراتب کی فضا میں زندگی بسر کرنا ، حق ، خیر اور حسن کا احترام ، یہی چیزیں ہیں جو فرد کے جذبات کی تربیت کرتی ہیں“ [1] -

---

Wheeler, Youth—[1]

x ہمارے ہندوستانی گھروں میں بچوں اور نوجوانوں کو دو مختلف خطرے درپیش ہیں - ایک خطرہ تو یہ ہے کہ بعض اوقات ان کی اس قدر بےجا نازبرداری اور رعایت کی جاتی ہے کہ وہ بڑے ہوکر معاشرتی زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہتے یا بہت سے تلخ تجربے اُٹھانے کے بعد دوسروں کے حقوق اور فرائض کا احترام کرنا سیکھتے ہیں - دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ اس قدر بےجا سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ ان میں آزادی سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی ان کی اپج دب جاتی ہے ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے یا ان کے دل میں والدین اور عزیزوں کی طرف سے نفرت اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو انہیں اندر ہی اندر "باغی" اور "سرکش" بنا دیتے ہیں - اور لطف یہ ہے کہ اکثر ایک ہی بچے کے ساتھ دونوں قسم کا برتاؤ کیا جاتا ہے - کبھی تو والدین ان کے ساتھ حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں ' ان کی ہر بات اور ہر ضد کو مان لیتے ہیں اور کبھی کم از کم بچوں اور نوجوانوں کے خیال میں ' منطق کے تمام کلیے توڑ کر خواہ مخواہ اُن پر ناراض ہوتے ہیں اور ان کی قدرتی خواہشوں کو روکنا چاہتے ہیں - یا والدین میں سے ایک بےجا نازبرداری اور دوسرا غیر ضروری سختی کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے بڑوں کے ساتھ صحیح اور مستحکم تعلقات قائم نہیں کرسکتا - اور اس وجہ سے ان کی صحبت کے عمدہ اثرات سے بھی مستفید نہیں ہوسکتا - کچھ عرصے کے بعد جب بچہ بڑا ہوکر نوجوانی کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ والدین اور گھر کے دوسرے لوگ ان تبدیلیوں اور انقلابات

کی پوری اہمیت کو نہیں سمجھتے جو اس زمانے میں ہوتے ہیں - اس وقت بھی وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتے ہیں جو بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اب ان کو زیادہ آزادی رائے اور آزادی عمل حاصل ہونا چاہیے اور بجائے تحکمانہ برتاو کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا زمانہ آگیا ہے - اس ناواقفیت یا تحکم پسندی کی بدولت والدین اور اولاد کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں اور روزمرہ کے جھگڑوں کی وجہ سے ان کی نشو و نما کے لئے سازگار ماحول پیدا نہیں ہو سکتے - چنانچہ گھر جو در اصل ایک تعلیمی ادارہ ہے فرائض کی ادائگی سے قاصر رہتا ہے - اسی وجہ سے بچوں اور نوجوانوں کی نفسی زندگی کے صحیح اور واضح علم کی اشاعت والدین کی آگاہی کے لیے ضروری ہے - ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ ہماری موجودہ غلط فہمی اور جہالت ہماری طبیعت میں راسخ ہو جائے گی اور نوعمروں کی صحیح تربیت نہ گھر کے بس کی بات رہے گی نہ مدرسے کے بس کی - بچوں کی نشو و نما سے گھر کا جو تعلق ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طالبہ کی تعلیم اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوسکتی جب تک مدرسہ اور گھر دونوں مل کر اس میں حصہ نہ لیں اور باہمی اتحاد عمل کے ساتھ ان کی زندگی کو سدھارنے اور مفید بنانے کی کوشش نہ کریں - آج کل تو یہ حالت ہے کہ مدرسے کے معلموں کو گویا طالبہ کی خانگی زندگی سے اور گھر والوں کو ان کی تعلیمی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں - یہ صورت حال بہت افسوسناک اور مضر ہے - کسی شخص کی زندگی بھی مختلف شعبوں میں اس طرح تقسیم

نہیں کی جا سکتی کہ انہیں ایک دوسرے سے تعلق نہ ہو چہ جائیکہ بچوں کی زندگی جن کی ذات سراسر وحدت کا مظہر ہوتی ہے - بچے روزانہ چوبیس گھنٹوں میں سے تقریباً اٹھارہ گھنٹے مدرسے سے باہر گھر میں اور اس کے آس پاس بسر کرتے ہیں - ان کے ذہن اور سیرت کی تشکیل صرف مدرسے کے وقت تک محدود نہیں بلکہ بیداری کے ہر لمحے میں ہوتی رہتی ہے اور کم سے کم بچپن میں تو گھر کا اثر مدرسے کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے - اگر گھر کا مجموعی اثر مفید ہے اور مدرسے کے کام میں اعانت کرتا ہے تو بچے کی نشو و نما مناسب طریقے پر ہوگی لیکن اگر ان دونوں کے اثرات ہم‌آہنگ نہیں اور مدرسے کی تربیت گھر میں آکر زائل ہو جاتی ہے یا گھر کی عمدہ روایات اور عادتیں مدرسے میں پختہ نہیں ہوتیں تو طالب‌علم کے نفس میں ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے - جس کا نتیجہ اس کی زندگی کے لیے اچھا نہیں ہوتا - اس کی ایک معمولی سی مثال زبان اور گفتگو کا مسئلہ ہے - اکثر طلبہ کے گھروں پر جو زبان بولی جاتی ہے وہ غلط یا گنواروں کی زبان ہوتی ہے - مدرسے میں بحیثیت مجموعی اس سے بہتر اور زیادہ صحیح زبان رائج ہوتی ہے - جب طالب علم مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو استاد کوشش کرتے ہیں کہ وہ صحیح زبان بولے لیکن گھر کی پڑی ہوئی عادت آسانی سے نہیں چھوٹتی بلکہ روزمرہ کے اثر سے اور پختہ ہوتی جاتی ہے - بالعموم یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جو طلبہ ابتدائی یا ثانوی مدارس کی تعلیم حاصل کر کے چھوڑ دیتے ہیں وہ پہلے تو ایک عجیب مخلوط زبان بولتے ہیں جس میں کچھ ان کی ”تعلیمی“

زبان کا جزو ہوتا ہے اور کچھ ان کے گرد و پیش کی روزمرہ کا ۔ کچھ عرصے کے بعد وہ مدرسے کی زبان رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں اور تقریباً وہی زبان بولنے لگتے ہیں جو ان کے گرد و پیش رائج ہوتی ہے ۔ اس مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اکثر تعلیمی مقاصد اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک گھر اور مدرسہ یعنی والدین اور استاد مل جل کر ' بچوں کی تربیت کا انتظام نہ کریں ۔ یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں کہ ان دونوں اداروں میں اشتراک عمل کے لیے کیا عملی طریقے استعمال کئے جائیں لیکن اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس مقصد کے لیے محض دو تین سالانہ جلسے کافی نہیں ۔ جن میں والدین تماشا دکھلانے کے لیے بلا لیے جاتے ہیں ۔ اس کے لیے وہ مخصوص ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن سے والدین اور سرپرست یہ محسوس کریں کہ ان کے شہر یا گاؤں کا مدرسہ کوئی اجنبی یا سرکاری ادارہ نہیں جو ان کی زندگی اور مشاغل سے بے تعلق ہے ۔ بلکہ ان کی تمدنی زندگی کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے جس کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دو باتوں کی خاص ضرورت ہے ۔ ایک تو یہ بدیہی امر ہے کہ والدین اور معلموں میں باہمی میل جول ہونا چاہیے تاکہ وہ ایک دوسرے کی ضروریات اور مقاصد سے واقف ہو جائیں اور اپنے بچوں کی تربیت کے لیے بہترین اور مناسب‌ترین ذرائع اختیار کریں ۔ دوسری بات جو ایک لحاظ سے زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ مدرسے کو بحیثیت ایک تعلیمی ادارے کے ایسے مشاغل اختیار کرنے چاہییں جو گرد و پیش کے بالغ لوگوں کو

براہ راست فائدہ پہنچانیں - موجودہ نظریۂ تعلیم کا یہ اصول
کہ مدرسے کو اپنے شہر یا گاؤں کی تمدنی زندگی کا مرکز ہونا
چاہیے اور لوگوں کو بہتر طرز زندگی سے روشناس کرنا چاہیے
اسی خیال کی تفسیر ہے - مغربی ممالک میں جا بجا اور
ہندوستان میں کہیں کہیں اس قسم کے جو تجربے کیے گئے
ہیں خصوصاً گاؤں کی زندگی کی اصلاح اور لوگوں کی طرز
معاشرت اور حفظان صحت کے انتظام میں مدرسوں نے جو
حصہ لیا ہے وہ غور اور مطالعے کے قابل ہے اور اس قسم کے کام
اس سے بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے - اگر ہندوستانی
مدراس کی تنظیم جدید میں اس خیال کو عملی جامہ
پہنایا گیا تو اس سے نہ صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جن
کی مدرسے خدمت کریں گے بلکہ خود مدرسے کی تعلیم زیادہ
مفید، زیادہ دلچسپ اور زیادہ علمی ہو جائے گی کیوں کہ طلبہ
محسوس کریں گے کہ ان کے تعلیمی مشاغل بےکار اور بےمقصد
نہیں ہیں بلکہ ان سے ایسے کاموں کو کرنے میں مدد ملتی ہے
جو صریحاً مفید ہیں اور ان کی تعمیری قوتوں کو اُبھرنے کا
موقع دیتے ہیں -

معاشرتی زندگی کا تعلیمی اثر

گھر بچے کا سب سے پہلا اور قریبی ماحول
ہوتا ہے - اس سے زیادہ وسیع ماحول جو اس
کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے اُن گروہوں اور جماعتوں پر مشتمل
ہے جن سے بچے کا قریبی تعلق ہوتا ہے - انہیں ہم مجموعی
طور پر معاشرتی طبقے کہتے ہیں - ان میں سے ایک تو وہ
خاص جماعت ہے جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے اور جس کا رکن
وہ تقریباً اسی حیثیت سے ہوتا ہے جس حیثیت سے اپنے

خاندان کا فرد ہوتا ہے ۔ کسی گروہ کو اس معنی میں ایک جماعت بننے کے لیے کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس کے افراد کی مالی حیثیت ' رسم و رواج ' طرز معاشرت ' تہذیب و تمدن کی روایات کم و بیش ایک سی ہوں اور ان میں خود بخود اتحاد اور میل جول ہو ۔ مثال کے طور پر اس معنی میں کسی شہر کے جلاہے یا قصاب ایک ''جماعت'' ہوتے ہیں نہ اس وجہ سے کہ وہ ایک ہی پیشہ اختیار کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں ہر طرح یک‌جہتی اور یکسانی پائی جاتی ہے ۔ وہ لفظاً اور معناً ایک ہی برادری کے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح کسی شہر کے تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ لوگ جن کی اقتصادی اور معاشرتی حیثیت ایک سی ہوتی ہے اور آپس میں میل جول ہوتا ہے ایک جماعت کے افراد ہیں ۔ یا انگلستان میں کچھ عرصے پیشتر تک جو طلبہ وہاں کے بڑے بڑے تاریخی پبلک اسکولوں مثلاً ایٹن (Eton) اور رگبی (Rugby) وغیرہ میں تعلیم پانے کے لیے داخل ہوتے تھے وہ خوش حال امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی خاص روایات اور خاص نقطۂ نظر ہوتا تھا جو اپنی خوبیوں اور خرابیوں دونوں کے لحاظ سے اور تمام جماعتوں سے علیحدہ اور ممتاز ہوتا تھا ۔ یہاں ہم نے ماضی کا صیغہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ گزشتہ چند سال میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہاں جمہوری تحریکوں کی بدولت ان مدرسوں میں بھی وہ امتیازی شان نہیں رہی جو پہلے تھی ۔ اس معاشرتی ماحول میں ہم پڑوس کے اثرات اور بعض صورتوں میں شہری اور دیہاتی زندگی کے مجموعی تمدنی اثرات کو بھی شامل کرسکتے ہیں ۔ کیونکہ

ان سب چیزوں کو مجموعی طور پر نہ صرف افراد کی سیاسی اور اقتصادی نشو و نما میں دخل ہے بلکہ وہ ان کی معاشرتی تعلیمی اور مذہبی حالت کو بھی متاثر کرتی ہیں -

جب بچہ زندگی کا سفر شروع کرتا ہے تو وہ نہ صرف گھر کی فضا میں پرورش پاتا ہے بلکہ اس کے گرد ایک دائرہ عمرانی زندگی کا ہوتا ہے جو اکثر غیر محسوس لیکن نہایت موثر طریقے سے اس کی عادات' خیالات اور سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے - اس کی چال ڈھال' اس کا طرز گفتگو اور ذخیرۂ الفاظ' اس کے اخلاقی اصول اور نصب‌العین اپنے ماحول کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں - اوپر کی مثالوں کو لے کر ان پر غور کیجیے - اگر بچے کی ابتدائی زندگی جلاہوں کی کسی منظم اور محنتی جماعت میں بسر ہوگی تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اس میں اپنے اُس ماحول کی وجہ سے عمرانی احساس بہت مستحکم ہوگا محنت کرنے کی عادت ہوگی' ہاتھ سے کام کرنے میں عار نہ ہوگا' لیکن اگر اس کے خاندان میں تعلیم کا چرچا نہیں تو وہ ان خوبیوں کے باوجود تنگ خیال اور تنگ نظر ہوگا - اس کی ہمدردی اور مشاغل کا دائرہ محدود ہوگا - اس کو چند انی گنی چیزوں کے علاوہ دنیا کی کسی اچھی چیز سے دلچسپی نہ ہوگی - اس کے مقابلے میں کسی ایسے بچے کو لیجیے جو ایک تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ شخص کے گھر میں پیدا ہوتا ہے اور جیسے ہوش سنبھالتے ہی زیادہ‌تر اسی جماعت یا طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے - اس کی بول چال اس کے خیالات' اس کی طرز زندگی سب پہلے بچے سے مختلف ہوں گے - اغلب یہ ہے کہ اس کو ہاتھ کا کام

کرنے کی نہ عادت ہوگی نہ شوق - بلکہ اگر اس کی تربیت
" شرافت " کے غلط تصور کے زیر اثر ہوگی تو وہ محنت اور
دستکاری کو ذلیل سمجھے گا اور تعلیم ہی کے زمانے میں " نوکری "
کو اپنا مطمح نظر بنائے گا - اس کو شائد یہ احساس بھی نہ
ہو کہ وہ زندگی کتنی محدود اور تنگ ہوتی ہے جس میں
انسان کو شیشہ دفتر میں بیٹھ کر مشین کی طرح کام کرنا پڑتا
ہے - فطرت کے مناظر اور مظاہر سے اسے نہ واقفیت ہوگی اور نہ
دلچسپی - وہ اپنے خیال میں معاشرے کو دو طبقوں میں
تقسیم کرے گا - ایک وہ لوگ جن کے رہنے سہنے کا طریقہ اس سے
ملتا جلتا ہے ' جنھوں نے تھوڑی بہت تعلیم پائی ہے ' جدید
تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے ہیں - دوسرا طبقہ ان لوگوں کا
ہوگا جو اس کے نزدیک ''ذلیل'' اور کم درجہ کے کام کرتے ہیں
اس سے کم‌تر حیثیت رکھتے ہیں اور معاشرتی زندگی کے آداب
و رسوم میں بھی اس سے مختلف ہیں - اس کے ساتھ یہ امکان
بھی ہے کہ یہ لڑکا گفتگو ' آداب مجلس ' عام علمی اور کتابی
واقفیت اور ذہنی بیداری میں اپنے ہم‌عمر جلاہے کے لڑکے
سے بہتر ہو کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بچے بغیر
کسی خاص تعلیمی اہتمام کے خود بخود اپنے ماحول سے سیکھ
لیتے ہیں - یہ دونوں مثالیں اس خاص مطلب کو واضح کرنے
کے لیے دی گئی ہیں کہ اگر تعلیم و تربیت کے اثرات اور طبعی
اختلافات کا دخل نہ بھی ہو تو بھی قرین قیاس یہ ہے کہ
محض عمرانی ماحول کے فرق کی وجہ سے دو ارسط درجے کے
بچوں میں اس قسم کا فرق پایا جائے گا - یہ اور بات ہے کہ
خاص اثرات کے ماتحت ان دونوں کی شخصی نشو و نما اس

کے برعکس ہو - بہر حال اس امر سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ مقامی حالات اور روایات بڑی حد تک بچوں کے لباس، گفتگو، خیالات، مذاق اور اخلاقی اصول کو بناتے یا بگاڑتے ہیں -

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرتا لیکن عملاً اس کی تعلیمی اہمیت اور نتائج کو لوگوں نے نہیں سمجھا - تعلیم کا کام بھی یہی ہے کہ وہ بعض معینہ اصولوں کے مطابق اور کسی اعلیٰ نصب‌العین کے ماتحت بچوں اور نوجوانوں کی زندگی کی تشکیل کرے یعنی ان کے موجودہ عادات و خیالات اور ان کی طبیعت اور مذاق کی اصلاح کر کے ان کو بہتر اور شائستہ‌تر بنائے - اس لیے ایک لحاظ سے تعلیم اور عمرانی اثرات کا دائرہ بڑی حد تک ایک ہی ہے اور معلموں اور تعلیم‌گاہوں کو ہرگز ان اثرات کی طرف سے بےپروائی نہیں برتنا چاہیے جو طلبہ کے گرد و پیش کی جماعتی زندگی سے پیدا ہو کر ان کی شخصیت میں جذب ہوتے رہتے ہیں -

× ہمارے ملک میں بعض خاص معاشرتی اسباب سے یہ اثر دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ راسخ اور مستحکم ہے - یہاں ذات پات کی بندشیں اور قیود ایسی ہیں جو نہ صرف افراد کی معاشرتی حیثیت کو بلکہ ایک حد تک ان کے خیالات، ان کے باہمی میل جول کی حدود، ان کے پیشوں کو بھی پہلے سے متعین کر دیتی ہیں اور لوگ خواہ وہ سن‌رسیدہ ہوں یا نوعمر، آسانی سے ان بندشوں اور ضابطوں کو نہیں توڑ سکتے جو "ذات" ایک مطلق‌العنان اور جابر حاکم کی طرح ان پر عائد کرتی ہے - اس میں شک نہیں کہ گزشتہ زمانے

میں بہت سی اصلاحی اور سیاسی تحریکوں کی وجہ سے ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ہوگئی ہیں اور ایسے اثرات کام کر رہے ہیں جو غالباً کچھ مدت میں ان کو بالکل توڑ دیں گے لیکن ابھی تک ان کا اثر اتنا وسیع اور راسخ ہے کہ نظریۂ تعلیم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کا تعلق ان جماعتی اثرات سے کیا ہے - اس مسئلے کے بعض پہلو تو بالکل صاف اور واضح ہیں - مدرسہ اکیلا اپنے طلبہ کی تربیت کا فرض ادا نہیں کرسکتا اس کے ساتھ دوسرے تمدنی اداروں کی شرکت بھی ضروری ہے کیونکہ اس کا اثر ان کے روزمرہ کے اوقات کے ایک تھوڑے سے حصے تک محدود ہوتا ہے اور باقی اوقات میں اُن کی تربیت وہ تمام عمرانی تعلقات اور روایات کرتی ہیں جن کا مرکز مدرسے سے باہر ہے لہذا کوئی تعلیمی اصلاح اس وقت تک پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ وسیع تر تمدنی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے تاکہ تمام تمدنی اداروں کا مجموعی اثر ہم آہنگ اور طلبہ کی تربیت کے لیے مفید ہو - ظاہر ہے کہ اگر عمرانی اثرات مدرسے کے کام میں معین ہوں تو تربیت کا فرض بہت سہل ہو جاتا ہے - اور یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ ان اثرات کی وجہ سے مدرسے کے طلبہ میں انفرادی اختلافات بہت نمایاں ہو جاتے ہیں - اول تو فطری اختلافات کا دائرہ بجائے خود بہت وسیع ہوتا ہے پھر جب اس کے ساتھ گھر اور عمرانی ماحول کا فرق بھی شامل ہو جائے تو افراد میں باہم اور زیادہ تفاوت ہو جاتا ہے - کیا بہ لحاظ جسمانی اور معاشرتی

تربیت کے، کیا بہ لحاظ اخلاقی اور دماغی نشو و نما کے ہر طالب علم اور تمام طلبہ سے مختلف ہوتا ہے یہاں تک کہ ان طلبہ میں بھی جو کم سے کم ذہنی اعتبار سے بظاہر ایک ہی معیار کے معلوم ہوتے ہیں پوری طرح غور اور امتحان کرنے پر بہت بڑا فرق نکلتا ہے - ان سب کی تربیت کرنا مدرسے کا فرض ہے - کسی قدر پیچیدہ اور دشوار ہے یہ فرض اگر اس کو پوری طرح سمجھا جائے! ہم دیکھ چکے ہیں کہ مدرسہ ایک تمدنی ادارہ ہے جسے معاشرہ اپنے مشترک اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے قائم کرتا ہے - برخلاف اس کے خاندان کا نقطۂ نظر تمام‌تر انفرادی ہوتا ہے یعنی جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے نزدیک ہر بچہ ایک مخصوص سیرت کا مالک ہے جس کی نشو و نما گھر کی تربیت کا سب سے زیادہ اہم فرض ہے - مطالبات کی اس کشمکش میں مدرسے کا نازک فرض یہ ہے کہ نہ صرف طلبہ کی انفرادی بہبود کا خیال رکھے بلکہ ان کو اجتماعی ذمہ‌داریوں اور فرائض کی بجاآوری کے لیے بھی تیار کرے - اس فرض کی دقت اور نزاکت کا پورا احساس انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو یہ جانتے ہیں کہ اگرچہ حالت کمال میں فرد اور جماعت کی اغراض بالکل متحد اور ہم‌آہنگ ہونی چاہییں لیکن عملاً ہماری اس ناقص دنیا میں ہر ہر قدم پر انفرادی آزادی اور معاشرے کے اٹل مطالبات میں جنگ ہوتی رہتی ہے - بہر حال اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کی اہلیت پیدا کی جائے اور ان تعصبات اور اختلاف کو دور کیا جائے جو افراد اور

جماعتوں کے باھمی ربط و ضبط اور اشتراک عمل میں سد راہ
ھیں اور لوگوں کے دلوں میں قومی روح اور وحدت مقاصد کا
احساس پیدا نہیں ھونے دیتے - یہ ایک ایسی حقیقت ھے
جسے یوں نظری طور پر تو ھر شخص تسلیم کر لیتا ھے لیکن
اگر لوگ خلوص اور ھمت کے ساتھ اس پر عمل کریں تو نہ
صرف تعلیم بلکہ تمام نظام معاشرت میں ایک انقلاب عظیم
برپا ھو جائے کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ھے کہ تعلیم کے اداروں
اور انتظامات کا مجموعی اور متحدہ رجحان یہ ھو کہ ذات
پات کی تمام بیجا بندشوں ' جماعتی خود غرضیوں ' اقتصادی
مظالم اور ناانصافیوں کی بیخ‌کنی کی جائے // اگر تعلیم کے
میدان میں یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو کسی " اونچی "
ذات کا لڑکا کسی " نیچی " ذات کے لڑکے کے ساتھ تعلیم پانے
سے کیوں کر انکار کر سکتا ھے ؟ مختلف طبقوں کے لیے
مختلف قسم کے تعلیمی ادارے دب جائز رکھے جا سکتے ھیں ؟
محض دولت‌مند ھونا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی شرط کیسے
قرار پا سکتا ھے ؟ ھر طبقے اور ھر گروہ میں اشتراک عمل
کے بجائے مقابلے اور رقابت کے جذبات پیدا کرنا کس طرح
گوارا کیا جا سکتا ھے ؟ جمہوریت کا اصل مفہوم یہی ھے کہ
ھر اس چیز کو جو معاشرے کے افراد کو اجتماعی بندشوں
میں جکڑ کر ان کی آزادانہ نقل و حرکت اور میل جول کو
روکتی ھے ' جو نام و نسب کی اضافی صفات کے مقابلے میں
ذاتی صلاحیت کو خاطر میں نہیں لاتی ' جو بعض لوگوں کو
صرف محنت کی کڑیاں سہنے کے لیے اور بعض کو محض
رصت کا لطف اٹھانے کے لیے مخصوص کرتی ھے ' مٹا دیا

جائے ' تاکہ ہر فرد بغیر کسی روک ٹوک کے ایک آزاد اور سازگار ماحول میں اپنی قوتوں کو پوری طرح نشو و نما دے سکے اور ان کو اجتماعی اور قومی اور اس سے بڑھ کر نوعی خدمت کے لیے استعمال کرنا سیکھے - لہذا جمہوری تعلیم کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ان ناجائز سہولتوں اور غیرمعمولی رعایتوں کو دور کیا جائے جو بعض افراد یا جماعتوں کو بغیر ذاتی استحقاق کے حاصل ہو گئی ہیں اور تمام افراد قوم کے لیے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کی معرکةالاراء کتاب "تعلیم اور جمہوریت" (Democracy and Education) جو اس صدی کی بہترین تعلیمی تصنیف ہے اس مبحث پر ہر پہلو سے روشنی ڈالتی ہے اور اس کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے ان تمام اجتماعی بندشوں اور سختیوں کو دور کیا جائے جنھوں نے افراد کی قوتوں اور صلاحیتوں کو جکڑ رکھا ہے اور عام لوگوں کے اندر جو جوہر ہے اسے ابھرنے کا موقع نہیں دیتیں - اس طرح تعلیم تمدنی اصلاح کے لیے ایک زبردست آلۂ کار بن جاتی ہے جو نئی نسل کے افراد میں ایک نئی ذہنیت پیدا کر کے معاشرتی ناانصافیوں کو دور کرنے کی فکر کرتی ہے -

لیکن اسی کے ساتھ تعلیم کا یہ بھی کام ہے کہ وہ جماعتوں کی مختلف خصوصیات اور تمدنی روایات کا لحاظ رکھے اور افراد کی تربیت اسی طرح کرے کہ نہ صرف ان کی ذہنی قوتوں کی نشو و نما ہو بلکہ وہ ان کو اپنے عمرانی ماحول میں بغیر کشمکش اور تصادم کے خوبی اور عمدگی کے ساتھ استعمال

کر سکیں - ہر شخص کی زندگی صرف مجموعی معاشرے کے زیر اثر نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کا ماحول زیادہ‌تر ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور گروہوں پر مشتمل ہے جو اس کی گھر کی زندگی کو کئی ہم‌مرکز دائروں کی طرح گھیرے ہوئے ہیں - ہم کیسے کسی شخص کو صحیح طور پر تعلیم‌یافتہ کہ سکتے ہیں جب تک اس میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اپنے گھر والوں ' اپنے ہمسایوں اور پڑوسیوں ' اپنی ''برادری'' کے اشخاص کے ساتھ مناسب سلوک کر سکے ؟ مناسب سلوک سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ ان جماعتوں کے اصول معاشرت ' روایات ' اور مخصوص معاملات کو سمجھے اور ان سے ہمدردی کرے ' بالعموم اس کے افعال ان کے ساتھ ہم‌آہنگ ہوں اور وہ ان فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرے جو ان جماعتوں کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے ذمے عائد ہوتے ہیں - مثال کے طور پر ہندوستان کے کسی گاؤں کے باشندے کو لیجیے جس نے مقامی یا ضلع کے مدرسے میں تعلیم پائی ہے - اگر یہ تعلیم اس کو اپنے مخصوص دیہاتی ماحول میں زندگی گزارنے کے قابل نہ بنا سکے ' اگر اس کو مناظر فطرت سے دلچسپی باقی نہ رہے ' کام اور محنت کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے ' گاؤں کی زندگی کے بنیادی اصول یعنی باہمی امداد اور اشتراک عمل اس کے دل کو نہ لگیں تو وہ تعلیم اس کے لیے نہ صرف بےکار ہے بلکہ نہایت مضر ہے - اس کو اپنی زندگی اسی ماحول میں گزارنی ہے اور سواے خاص صورتوں کے اسی ماحول میں گزارنی چاہیے - لہذا اگر وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود اپنے

گاؤں میں اجنبی بن کر زندگی بسر کرے گا اور ان معاملات میں دلچسپی نہ لے گا تو ایک طرف وہ خود خوشی اور مسرت سے محروم رھے گا اور دوسری طرف اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی کوئی خدمت نہ کر سکے گا -

هندوستان کے موجودہ تعلیمی حالات اور رجحانات کو دیکھ کر اس بات پر زور دینے کی ضرورت خاص طور پر محسوس ھوتی ھے - اس سے ھمارا مقصد تنگ‌نظاری اور محدود مذاق کی حمایت کرنا نہیں اور نہ ھم یہ چاھتے ھیں کہ گاؤں کے رھنے والوں کہ صرف گاؤں سے دلچسپی ھو اور شہروں کے رھنے والے اپنے سامنے کی چیزوں کے سوا کسی چیز کو نہ دیکھیں اور نہ اس پر غور کریں - موجودہ زمانے کی ایجادات اور سائنس کی ترقی نے دنیا کو اس طرح ملا دیا ھے اور تمام انسانوں کو تعلقات اور باھمی احتیاج کی زنجیروں میں اس شدت سے جکڑ دیا ھے کہ ھمارے لیے ہرگز مناسب نہیں کہ ھم اپنی فوری ضروریات کے علاوہ اور تمام مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں - لیکن ھمیں یاد رکھنا چاھیے کہ دنیا کا باشندہ بننے سے پہلے ھمارا یہ فرض ھے کہ ھم اپنے گاؤں کے دیہاتی یا اپنے شہر کے مفید اور ذمہ‌دار شہری بنیں - حقیقت میں کوئی شخص جس کو اپنی مقامی حالات سے واقفیت اور دلچسپی نہ ھو وسیع‌تر قومی اور بین‌الاقوامی معاملات میں معقول اور مفید طریقے پر شرکت نہیں کرسکتا - وہ " لیڈری " کر سکتا ھے مگر خدمت اس کے بس کی بات نہیں - اکثر لوگ جنھوں نے خاموشی اور استقلال کے ساتھ اپنے ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت انجام دی اور صفحۂ تاریخ پر اپنا نقش ثبت کر گئے وھی تھے جنھوں

نے ابتدا میں کسی محدود حلقۂ عمل میں خلوص اور محنت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام کرکے بڑے کارناموں کے انجام دینے کی قابلیت بہم پہنچائی - اس کے علاوہ ہم میں سے زیادہ‌تر لوگوں کے لیے یہ امکان ہی نہیں کہ براہ راست قومی یا بین‌الاقوامی معاملات پر کوئی زبردست اثر ڈال سکیں - وہ حلقۂ عمل ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے اپنی قابلیت، اپنی مسلسل محنت اور ایک حد تک اچھے موقعوں سے فائدہ اُٹھا کر مسلمہ حیثیت پیدا کرلی ہے جس کی بدولت، وہ ان معاملات میں حصہ لے سکتے ہیں - باقی لوگوں کا فرض اور نہایت اہم فرض یہی ہے کہ وہ اپنے محدود حلقۂ عمل میں اپنے متعلقین اور گرد و پیش کے لوگوں کی خدمت کریں - اس خدمت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقامی ماحول کا مطالعہ کریں اور اس کو سمجھیں، عمرانی زندگی کے نظام پر غور کریں اور اپنی اپنی قابلیت کے مطابق جہاں تک موقع ملے ان میں اصلاح اور بہتری کی کوشش کریں - معاشرے کے جمہوری نظام کی کامیابی کے لیے یقیناً قابل لیڈروں کی ضرورت ہے لیکن اتنی ہی ضرورت تربیت یافتہ اور فرض شناس پیرووں کی ہے جو ان لیڈروں کے مانند اپنا اپنا کام ذمہ‌داری اور دانشمندی کے ساتھ انجام دیں - اول تو لیڈر بجائے خود کچھ نہیں کرسکتے جب تک ان کے ساتھ ایک جماعت نہ ہو جو اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکے - دوسرے جمہوری نظام میں لیڈر بننے کے لیے کسی خاص طبقے میں پیدا ہونا یا دولتمند ہونا شرط نہیں بلکہ انہیں عام لوگوں میں سے غیرمعمولی قابلیت کے لوگ اپنی اپچ اور کارکردگی کی بدولت آگے بڑھ کر قیادت

کے فرائض انجام دیتے ھیں - لہذا قومی اصلاح اور سیاسی اور معاشرتی تعمیر اسی وقت ممکن ھے جب تمام افراد قوم کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ چھوٹے چھوٹے مفید کاموں اور فرائض میں انہماک اور دلچسپی کا اظہار کریں اور ان کو نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ انجام دیں کیونکہ یہی وہ قطرے ھیں جو مل کر سمندر بن جاتے ھیں اور جن کے بغیر ساری کوششیں جو بڑی بڑی قومی انجمنوں اور اداروں میں کی جاتی ھیں بیکار ثابت ھوتی ھیں - ھندوستان میں جو مفید تحریکیں آئے دن ناکام ھوتی رھتی ھیں ان کی اصل وجہ یہی ھے کہ لوگ بڑے بڑے منصوبوں اور دعووں کے ساتھ ان کو شروع کرتے ھیں لیکن جب وقتی جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ھے تو کوئی ایسی خاموش کارکن جماعتیں نہیں ملتیں جو باوجود مشکلات اور ھمت شکن حالات کے استقلال کے ساتھ انھیں اپنے اپنے حلقۂ عمل میں چلاتی رھیں - ھماری موجودہ تعلیم کا ایک اندیشہ‌ناک رجحان یہ ھے کہ وہ افراد کو ایک حد تک ان کے قریبی ماحول اور اس کے اھم اور غور طلب مسائل سے بیگانہ کردیتی ھے اور دور از کار باتوں میں الجھا دیتی ھے یا محض ذاتی فوائد کے پھیر میں ڈال دیتی ھے - ماھرین تعلیم کا فرض ھے کہ وہ نصاب، طریقۂ تعلیم اور تعلیم کی اندرونی روح کو اس طرح بدلیں کہ طلبہ میں مقامی "حب وطن" پیدا ھو اور وہ مقامی معاملات میں توجہ اور ھمدردی کے ساتھ حصہ لے سکیں - اب آگے انھیں جہاں تک توفیق اور ان میں جتنی قابلیت ھو - انسان کا ذھن زنجیروں سے بندھا ھوا نہیں ھے بلکہ آزادی سے نامحدود فضا میں اڑتا ھے - اگر اس میں

مطالعے اور تخیل کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو انسان ادب اور فلسفے اور سیاست کے بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے مسائل میں دلچسپی اور حصہ لے سکتا ہے -

ہمچو پرکاریم در راہ شریعت مستقیم
پاے دیگر سیر ہفتاد و دو ملت می کنیم

اس میں "راہ شریعت" سے ہماری مراد سامنے کے فرائض اور معاملات ہیں اور "ہفتاد و دو ملت" وہ بیشمار مسائل جن کی بدولت ہمارا تعلق بحیثیت انسان کے تمام دنیا کے انسانوں سے ہے - مستقبل کی تعلیم کے لیے یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے کہ مخصوص مقامی حب وطن اور تعلقات اور ہمارے وسیع تر مفاد اور دلچسپیوں میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے تاکہ تعلیم یافتہ لوگ ایک دو طرفہ خطرے سے محفوظ رہیں - بعض تو ایسے ہیں جو بالکل اپنے سامنے کی چیزوں کو نہیں دیکھتے بلکہ عام معاملات میں محض ایک سطحی اور نظری دلچسپی کا اظہار کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ نظام عالم میں ایک مفید خدمت انجام دے رہے ہیں - اور بعض ایسے ہیں جن کی توجہ ذاتی اور وقتی مسائل میں اس درجہ منہمک ہوتی ہے کہ ان کو دنیا کی وسعت اور گوناگوں دلچسپیوں اور مسائل کا علم ہی نہیں ہوتا - اس قسم کی تعلیم کا تشکیل دینا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں - انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں تعلیم، طلبہ میں مقامی حب وطن کا احساس پیدا کرتی ہے اور لوگ اپنے اپنے ضلعوں اور ان کے مخصوص ادارات اور روایات سے محبت رکھتے ہیں اور ان کے

تحفظ اور استحکام کی کوشش کرتے ہیں - انگلستان کے ہر ضلعے کی کرکٹ ٹیم وہاں کے باشندوں کی مشترک چیز ہوتی ہے جس پر وہ ناز کرتے ہیں - اسی طرح ہر ضلع اپنے اپنے مدارس، اپنے حفظان صحت کے نظام وغیرہ میں دوسرے ضلعوں پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتا ہے - ہندوستان میں ابھی تک یہ احساس کسی مفید شکل میں پیدا نہیں ہوا - مختلف صوبوں کے باشندوں میں باہمی رقابت ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو حقیر سمجھنا اس جذبے کا بدل نہیں ہو سکتا - لیکن ہماری حالت کو دیکھتے ہوئے اس جذبے کی تربیت اور رہنمائی نہایت ہی ضروری ہے کیونکہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور جب اس میں عنقریب وفاقی نظام قائم ہو جائے گا تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہمیت حاصل کرے گا کہ لوگوں میں کس طرح ملکی حب وطن کے ساتھ ساتھ مقامی حب وطن کا احساس گہرا اور مستحکم کیا جائے -

یہاں ہم ان تمام اصولوں کے عملی نتائج سے بحث نہیں کر سکتے - لیکن یہ ظاہر ہے کہ تعلیم اور معاشرتی جماعتوں کے باہمی تعلق کا صحیح احساس تعلیم کے تمام پہلوؤں پر بہت نمایاں اثر ڈالے گا - اور اس کی وجہ سے نہ صرف تعلیم کے عام مفہوم میں تبدیلی لازم آئے گی بلکہ مدرسوں کے نصاب اور تعلیمی طریقوں اور ضبط و تربیت کے نظام سب میں اس بات کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ یہ چیزیں طلبہ کو معاشرتی زندگی کی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرتی ہیں یا نہیں - نصاب کی تدوین اور مدرسے کے تمام مشاغل

کی تربیت اور انتخاب کرتے وقت ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ جس خاص ماحول میں مدرسہ واقع ہے جہاں اس کے طالبہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہاں معاشرے کی بہبود اور کامیابی کے لیے کن چیزوں پر زور دینے کی اور کیا کیا سکھانے کی ضرورت ہے - معاشرے کے مشاغل کیا ہیں ان کا تعلق صنعت و حرفت سے ہے یا تجارت سے یا زراعت سے - لوگوں کا طرز معاشرت کس قسم کا ہے - ان کے عام رجحانات، کار و بار کے اصول، تفریح اور فرصت کے مشغلے کیا ہیں - ان مشاغل اور معاشرت کے طریقوں کا پرتو مدرسے کے نصاب پر بھی پڑے گا - اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم براہ راست پیشوں کی تعلیم دیں گے یا فرقہ‌وارانہ تعصبات اور تنگ‌نظری کو مستقل بنانے کی کوشش کریں گے اور تعلیم کے وسیع تر مقاصد یعنی دماغ اور روح کی بیداری اور انسانی قوتوں کی ہم‌آہنگ تربیت کو نظرانداز کر دیں گے - لیکن یہ ضرور ہے کہ مدرسے کی اونچی جماعتوں کی تعلیم میں پیشوں کی مناسبت کا خیال رکھا جائے گا اور ان مضامین میں بھی جو تمام مدارس میں مشترک ہوں گے ایسے حصوں پر زور دیا جائے گا جن کا تعلق بالخصوص ماحول کی زندگی سے ہو - مثلاً یہ ضروری نہیں کہ سائنس یا جغرافیہ یا حساب پڑھانے میں دیہات اور شہر کے مدارس میں یا زراعتی اور صنعتی اضلاع میں ان مضامین کا بالکل ایک ہی نصاب مقرر کیا جائے - بلکہ یہ بہت بہتر ہوگا کہ عام اصولوں کی تشریح کے لیے عملی مثالیں ایسی منتخب کی جائیں جو مدرسے کے مخصوص ماحول سے لی گئی ہوں - اس طرح سائنس کی تعلیم میں ہم دیہاتی

مدراس میں ' علم نباتات و حیوانات ' مطالعۂ فطرت وغیرہ پر زیادہ زور دیں گے اور صنعتی علاقوں کے مدراس کی توجہ ریاضی اور طبیعیات اور کیمیا کی طرف زیادہ ہوگی اگرچہ تعلیمی مصلحت سے ان میں سے کسی شاخ کو بھی بالکل نظرانداز کرنا مناسب نہ ہوگا - ڈاکٹر وہیلر (Wheeler) نے اپنی کتاب (Youth) " شباب " میں نوجوانوں کے نصاب تعلیم سے بحث کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ثانوی منزل میں نصاب کے دو حصے ہو جانے چاہییں - ایک وہ حصہ جو تمام طلبہ کے لیے مشترک اور ہر اسکول میں ایک سا ہو اور جس کا پورا کرنا ذہین اور کند ذہن ' سائنس پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے شہری اور دیہاتی غرض سب طلبہ کے لیے لازمی ہو - اس حصے میں وہ مندرجۂ ذیل مضامین کو شامل کرتے ہیں :—

جسمانی تربیت - کوئی صناعی یا دستکاری - مطالعۂ فطرت - مادری زبان یا زبانیں - ادب - تاریخ و جغرافیہ - معاشرتی اور مذہبی تربیت -

دوسرے حصے میں ان کے نزدیک ایسے مضامین ہونے چاہییں جن کو نوجوان طلبہ اپنی مخصوص قابلیت اور ضروریات کے مطابق منتخب کر سکیں - اس حصے میں باقی تمام مضامین جو بالعموم نصاب کا جزو ہوتے ہیں شامل ہیں وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں :—

" زیادہ ذہین طلبہ کے لیے اس چھوٹے سے چھوٹے نصاب میں بعض ایسے مضامین اور مشاغل بھی شامل کرنے چاہییں جن کی تعداد اور نوعیت کا انحصار افراد کی

ذاتی صلاحیت اور شوق اور مختلف مدرسوں کے ماحول کی ضروریات پر ہو - گزشتہ باب میں جن نفسیاتی تعلقات سے بحث کی گئی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ذہانت رکھنے والے طالبہ دو قسم کے ہو سکتے ہیں - ایک وہ جن کا رجحان علمی ہے یعنی ادب یا سائنس کی طرف ہے - دوسرے وہ جن کی دلچسپیاں زیادہ تر عملی ہیں - ان دونوں سے ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اوسط یا کم‌تر ذہانت کے طالبہ کی نسبت مندرجۂ بالا نصاب سے زیادہ کام کریں گے - لیکن پہلی قسم میں جو طالبہ شامل ہیں اُن کے نصاب میں حساب ' فرانسیسی ' جرمن ' لاطینی ' طبیعیات ' کیمیا جیسے مضامین پڑھائے جائیں گے - اور دوسری قسم کے طالبہ کے لیے عملی مضامین کا اضافہ کیا جائے گا مثلاً مختلف دستکاریاں اور صنعتیں اور عملی سائنس کی وہ شاخیں جن کا ان سے تعلق ہے "[1] -

ظاہر ہے کہ مقامی حالات اور جماعتی ضروریات کا اثر نصاب کے دونوں حصوں پر پڑے گا لیکن پہلے حصے کی نسبت دوسرے حصے پر اس کا اثر زیادہ نمایاں ہوگا - " اگر مدرسہ دیہاتی ماحول میں ہے تو ان علوم و فنون پر زور دیا جائے گا جن کا زراعت سے قریبی تعلق ہے - اگر مدرسہ کسی کان‌کنی کے مرکز میں واقع ہے تو علوم طبیعی پر زیادہ زور دیا جائے گا" - لیکن ہر صورت میں یہ احتیاط شرط ہے کہ نصاب اور مشاغل

۱- صفحہ ۹۷ -

کی وہ ترتیب و تدوین خراب نہ ہونے پائے جو طلبہ کی عام ذہنی بیداری اور جذبات کی نشو و نما کے لیے قائم کی گئی ہے -

دوسرا اہم مسئلہ جو ہم کو اس ضمن میں پیش آئے گا وہ یہ ہے کہ مدرسے کو عمرانی زندگی کا مرکز کس طرح بنایا جائے - ہم نے گھر اور مدرسے والدین اور معلموں کے باہمی تعلق کو واضح کرتے ہوئے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے - ہمارے ملک میں بدقسمتی سے یہ خیال بہت عام ہے کہ مدرسہ بھی بہت سے سرکاری دفاتر اور اداروں کی طرح ایک سرکاری ادارہ ہے جس کا قومی زندگی اور قومی ضروریات سے کوئی قریبی تعلق نہیں ہے - اس کے بہت سے تاریخی وجوہ ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - ان وجوہ کی بنا پر اس خیال کا پیدا ہونا ایک حد تک قرین عقل ہے - مگر اس کا اثر تعلیم کی ترقی پر بہت برا پڑا ہے اور قومی زندگی اور تعلیم‌گاہوں کا وہ تعلق جو تعلیم میں روح پھونکتا ہے اور اسے اثر آفرینی کی قوت بخشتا ہے مفقود ہو گیا ہے - اس لیے ہمیں ایک طرف تو تعلیم کو بحیثیت مجموعی قومی ضروریات کا کفیل اور قومی مقاصد اور معیاروں کا ضامن بنانا ہے اور دوسری طرف یہ کوشش کرنی ہے کہ ہر مدرسہ اپنے خاص ماحول اور اس کے باشندوں کی زندگی کے لیے تہذیب کا ایک مرکز ہو تاکہ معاشرہ یہ محسوس کرے کہ یہ درسگاہ نہ صرف بچوں کو بعض ضروری علوم و فنون کی تعلیم دیتی ہے بلکہ کل جماعت کے لیے براہ راست مفید ہے اور اس کو بہتر مقاصد اور دلچسپیوں سے روشناس کرتی ہے -

بعض ملکوں میں اکثر مدرسوں کی عمارت اور تمام تعلیمی وسائل اور آلات شام کے وقت گرد و نواح کے لوگوں کے لیے بطور کلب اور تفریح گاہ بلکہ ایک حد تک بطور بالغوں کی تعلیم گاہ کے استعمال کئے جاتے ہیں اور اس طرح مدرسہ تبادل خیالات باہمی میل جول اور تفریحی مشاغل کا مرکز بن جاتا ہے۔ مدرسے اور ماحول کی زندگی میں یہ زندہ رابطہ پیدا کرنا تعلیم کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کو حقیقی معنوں میں "قومی تعلیم" بنانے کا جزو لازم ہے۔

باب چہارم

لیم اور مسئلۂ معاش

ر مسئلۂ معاش کے تعلق کی طرف رجوع
ق کی نوعیت اور نتائج سے کسی قدر
ا کریں گے کیونکہ صنعت و حرفت
اقتصادی مسائل کی اهمیت بہت بڑھ
تی جاتی هے اور پیشے کی اهمیت محض
ں اور اخلاقی بھی هے - اس لیے نظریۂ
کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری هے -
ے متعلق عام طور پر لوگوں میں اس
هوئی هیں اور تعلیمی مسائل میں ان
چیدگیاں پیدا هوگئی هیں که یه بحث
ے لیے ضروری هے - اس ضمن میں پہلا
هے که هم نے معاشی نظام کو ان تمدنی
مل کیا هے جو بچوں اور نوجوانوں کی
هیں اور اس کا اثر ان کی طبیعت اور
هے -

بالغوں کے پیشوں کا کوئی اثر بچوں کی زندگی پر گو براہ راست نہیں پڑتا اور ان کے تعلیمی نصاب میں پیشوں کی تربیت کو داخل کرنے کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے قابل تسلیم نہیں ' تاہم کسی خاص جماعت یا ملک کے پیشوں کے نظام کا جو اثر اس کے افراد پر پڑتا ہے وہ بالواسطہ بچوں کی طبیعت' عادات اور مشاغل کو بھی متاثر کرتا ہے - بچہ اپنے تمدنی ماحول سے مختلف قسم کے اثرات قبول کرتا ہے - ان میں ایک بڑا اور مستقل حصہ اس اثر کا ہوتا ہے جو کسی جماعت کے پیشوں اور وسائل معاش کی تنظیم کا لوگوں کی زندگی پر پڑتا ہے - لوگوں کی ذہنی اور عملی دلچسپیاں' ان کا نظریۂ حیات ' ان کی سیرت کا عام رنگ بہت کچھ اس کام کی بدولت معین ہوتا ہے جو وہ اپنی روزی کمانے کے لیے آٹھ دس گھنٹے روزانہ کرتے ہیں - ہر شخص کو جو کسی پیشے میں داخل ہوتا ہے ایسے شرکاے کار سے سابقہ پڑتا ہے جن کی گفتگو ' خیالات ' عادتیں اور تفریحی مشاغل ایک خاص قسم کے ہوتے ہیں - وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا' خواہ ابتدا میں اس کی طبیعت بالکل ہی مختلف کیوں نہ ہو - رفتہ رفتہ ان مشاغل اور خیالات کا رد عمل اس کی خانگی زندگی اور فرصت کے مشاغل پر بھی ہوتا ہے جو براہ راست اس کی اولاد کی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں - اس مثال کو اگر زیادہ واضح کردیا جائے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ پیشوں کی تنظیم کس طرح قومی سیرت اور ذہنیت کو بناتی اور بگاڑتی ہے اور "کاروباری اخلاق" اور "کاروباری ذہنیت" کس طرح رفتہ رفتہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھا جاتی ہے - انگریزوں

کو بعض نقادوں نے '' دکانداروں کی قوم '' کا خطاب دیا ھے -
اس نام سے نہ صرف یہ معلوم ھوتا ھے کہ انگریزوں کا سب سے
بڑا اور اھم وسیلۂ معاش تجارت اور اس کے متعلقہ کاروبار ھیں
بلکہ یہ بھی ظاھر کرنا مقصود ھے کہ ان کی قومی سیرت اور
سیاسی ارتقا کو سمجھنے کے لیے اس خصوصیت کو پیش نظر
رکھنا لازم ھے - اسی طرح سوئستان '' یورپ کا مہمان خانہ '' کہا
جاتا ھے - جو شخص سوئس لوگوں کی قومی خصوصیات سے
واقف ھے وہ جانتا ھے کہ ان کے اخلاقی اور ذھنی رجحانات پر
مہمانداری کے پیشے کا کس قدر گہرا اثر پڑا ھے اور ان کی خوبیوں
اور کمزوریوں دونوں کو سمجھنے میں اس سے کس قدر مدد
ملتی ھے - علیٰ ھذاالقیاس ھندوستان صدیوں سے زراعت کا گھر
رھا ھے اس وجہ سے کوئی شخص ھماری قومی تاریخ اور قومی
سیرت کی بھلائیوں اور برائیوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ
سکتا جب تک وہ اس مسئلے پر غور نہ کرے کہ اس ملک میں
اسی فیصدی لوگ کاشتکاری کرتے ھیں یا اسی کے متعلق اور کام
انجام دیتے ھیں اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ اُسی قناعت
آموز اور صبر طلب شغل میں بسر ھوتا ھے - پھر کیا تعجب
ھے کہ بچے جو اپنے بڑوں کی سیرت اور ماحول کا اثر بڑی جلدی
قبول کرتے ھیں ایک غیر محسوس طریقے پر ان معیاروں کو
تسلیم کرلیتے ھیں جو اُن کے ماحول میں مانے جاتے ھیں اور
اس پیشے کے گرویدہ ھو جاتے ھیں جو ان کے گرد و پیش رائج
ھے - خواہ وہ زراعت ھو یا تجارت یا صنعت و حرفت -
پروفیسر اسپرانگر (Spranger) اپنی قابلِ قدر تصنیف

"نفسیات عنفوان شباب" ۱ میں لکھتے ھیں :-

" ہر پیشہ انسان کے لیے نوشتۂ تقدیر بن جاتا ھے - چند سال کے عرصے میں وہ انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ھے اور اس کی سیرت کی تشکیل کرتا ھے - کیونکہ یہی ذھن خارجی کا وہ پہلو ھے جس سے فرد کو بہت قریبی تعلق ھوتا ھے اور وہ رفتہ رفتہ اس کے رنگ میں ڈوب جاتا ھے - صرف پیشہ ھی ھمارا نہیں ھوتا بلکہ ھم بھی پیشے کے ھو جاتے ھیں - پیشے کے اثر سے انسان کے تصور کائنات کے بیشتر حصے کی تشکیل ھوتی ھے - یہی وہ گوشہ ھے جہاں سے انسان دنیا کا مشاھدہ کرتا ھے......جہاں نوجوان کی ذات پوری قوت سے مکمل خارجی تمدن سے ٹکراتی ھے " ۲ -

ایک دوسرا سبب جس سے پیشوں کی تعلیمی اھمیت اور بڑھ گئی ھے وہ ان کی جدید اندرونی تنظیم ھے - یورپ اور دوسرے مغربی ممالک میں گزشتہ دو سو برس میں جو صنعتی انقلاب ھوا ھے اُس نے لوگوں کے کاروبار اور مشاغل کی نوعیت کو بالکل تبدیل کر دیا ھے - پہلے تقریباً ھر قسم کا کام ھاتھ سے یا بہت سادہ آلات اور اوزاروں سے کیا جاتا تھا جو ھاتھ ھی سے چلائے جاتے تھے - ماھرین فن اپنے اپنے شاگردوں کو مختلف کاموں کی تعلیم دیتے تھے - لیکن اب تقریباً ھر قسم کا کام مشینوں کے

۱- یہہ کتاب جرمن زبان میں (Psychologie des Jugendalters) کے نام سے شائع ھوئی ھے- اسی کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا ھے جو اردو اکیڈمی جامعۂ ملیہ دھلی کی طرف سے شائع ھوا ھے -

۲- صفحہ ۲۷ -

ذریعے ہونے لگا ہے - بڑے بڑے کارخانے قائم ہوگئے ہیں جن میں
سیکڑوں مزدور مشین کے پرزوں کی طرح کوئی ایک مقررہ
حرکت یا کام کرتے رہتے ہیں - ان ممالک کے علاوہ ہندوستان
میں بھی دستکاروں اور صناعوں کی سرپرستی کم ہوتی جاتی
ہے - کیونکہ جو کام وہ بہت وقت اور محنت صرف کر کے کرتے
تھے وہ اب آسانی اور کفایت سے مشین کے ذریعے ہو سکتا ہے -
لیکن اس تبدیلی سے جہاں ایک طرف وقت اور روپئے کی کفایت
ہوئی وہاں دوسری طرف یہ نقصان ہوا کہ عام لوگوں کے مشاغل
میں سے صناعی اور دستکاری کا وہ عنصر مفقود ہوگیا جو ان کی
شخصیت اور سیرت کی تربیت میں مدد دیتا تھا - ایک صناع
جو کوئی چیز مثلاً جوتیوں کا ایک جوڑا یا کپڑے کا ایک تھان
محنت اور شوق سے بناتا ہے اس ذریعے سے نہ صرف اپنی
روزی پیدا کرتا ہے بلکہ اس میں اپنے ذوق طبع کا اظہار بھی
کرتا ہے - ایک حد تک اُس چیز میں جو وہ تیار کرتا ہے اپنی
شخصیت کا رنگ بھرتا ہے اور اس طرح اسے اپنے کام میں اظہار
خودی کی مسرت حاصل ہوتی ہے - برخلاف اس کے جو شخص
تمام عمر کسی کارخانے میں محض مشین کے پرزے کی طرح
کام کرتا ہے اور اس کا کام بھی محض چند مقررہ حرکات تک
محدود ہوتا ہے اسے ہرگز اس میں لطف نہیں آسکتا ' نہ اس
کے ذریعے اس کی قوتوں کی نشو و نما ہو سکتی ہے - اس کا
دماغ اس تمام عرصے میں معطل رہتا ہے وہ نہ اس کام کی ابتدا
سے واقف ہوتا ہے نہ انتہا سے ' نہ اس کی پوری تنظیم کو
سمجھتا ہے نہ یہ جانتا ہے کہ اس کی تمدنی اہمیت کیا ہے -
اس صورت حال نے تعلیم کو نئی مشکلات اور نئے مسائل سے

دوچار کر دیا ھے - چونکہ صنعت و حرفت وغیرہ کے معمولی مشاغل میں شخصی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع تقریباً مفقود ہوگئے ہیں اس لیے اکثر عمدہ عادتیں اور صنعتیں جو مدرسے کی تعلیم کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں بہت سے پیشوں کے ناسازگار ماحول میں ضائع ہو جاتی ہیں - تعلیم کا تقاضا یہ ھے کہ طلبہ میں جدت ' تجسس اور اپج کا مادہ اُبھارے - لیکن بچارے کارخانوں کے مزدوروں کو اپنے روزمرہ کے مشاغل میں ان چیزوں سے کیا مطلب ؟ ان کا وقت تو ایسے کاموں میں صرف ہوتا ھے جس سے نہ دماغ کی تربیت ہو سکتی ھے نہ روح کی - انسان کی نفسی ترکیب میں بےشمار عناصر شامل ہیں جن میں سے بعض جسمانی نشو و نما چاہتے ہیں ' بعض ذہنی جد و جہد کی طرف راغب ہیں ' بعض مشاہدۂ حقیقت اور نظارۂ جمال کے جویا ہیں - لیکن اس قسم کے مشین‌نما کام میں ان میں سے کسی خواہش کی تشفی بھی نہیں ہو سکتی اور انسان کی شخصیت پست اور محدود ہوکر رہ جاتی ھے - اسپرانگر (Spranger) لکھتے ہیں :—

" اب اگر ہم موجودہ زمانے میں پیشے کی زندگی کی خارجی ترکیب پر غور کریں تو ہمیں یہ دیکھ کر افسوس اور رنج ہوگا کہ ہر پیشے میں ' خصوصاً اقتصادی پیداوار کے کاموں میں اس عین پسندی (idealism) کی کس قدر کم گنجائش ھے - یہ شکایت کہ صنعتی کاروبار تخصیص پسندی اور مشین پرستی کے سبب سے روحانیت سے خالی ہوگئے ہیں ایک نغمۂ دلدوز ھے جو ہمارے آهنگ تمدن میں نشید اجل کی طرح سنائی دیتا ھے .... مختصر

یہ ہے کہ صنعتی پیداوار کے اکثر شعبوں میں انسان اور اس کے کام میں کوئی زندہ اور معنوی کلی رابطہ باقی نہیں رہا ہے، محض اس لیے کہ ایک انسان سے کوئی پورا کام نہیں لیا جاتا "[۱]۔

اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اول تو صنعت و حرفت کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ جو کام بالکل میکانکی ہیں یعنی جن میں صرف ایک مقررہ حرکت درکار ہے ان کو مشینوں ہی کے ذریعے انجام دیا جائے تاکہ لوگوں کی زندگی اور وقت ان کے لیے وقف نہ ہو جائے۔ یہ ایک وسیع تمدنی اور عملی مسئلہ ہے جس کا تعلیم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ البتہ تعلیم کا یہ فرض ضرور ہے کہ طالبہ کی علمی اور دماغی تربیت اس طرح کرے کہ وہ آئندہ زندگی میں اپنے محدود کاموں کی غیر محدود اہمیت کو سمجھ سکیں۔ خواہ اُن کے ذمے محض اتنا ہی کام ہو کہ مشین کے ذریعے سوئی کے ناکے میں سوراخ کریں پھر بھی ان کو کارخانے کے پورے نظام سے واقفیت اور تمدنی زندگی میں اس کی اہمیت کا علم ہونا چاہیے تاکہ وہ کولھو کے بیل کی طرح کام نہ کریں بلکہ یہ سمجھ سکیں کہ وہ اپنے محدود دائرۂ عمل میں ایک ضروری خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس قسم کی خدمتوں کی انجام دہی پر معاشرے کے پیچیدہ نظام معاش اور کاروبار کا دار و مدار ہے۔ جو مزدور اور کاری گر اس حقیقت کو سمجھ کر اپنا فرض انجام دیتا ہے، جو خاکروب

۱۔ صفحہ ۲۲۸ ۔

صفائی کے کام کی وقعت اور تمدنی اهمیت کا علم رکھتا هے ' اس کے لیے اس کا کام اسی معنی میں متبرک هو جاتا هے جس معنی میں کارلائل (Carlyle) نے کہا تھا کہ " هر قسم کا سچا کام متبرک هے.........جس شخص کو یہ برکت نصیب هے اسے کوئی اور برکت طلب کرنے کی حاجت نہیں " - لہذا تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی هے کہ عام لوگوں کی کاروباری زندگی کے تنگ اور محدود کرنے والے اثرات کو دور کرنے کے لیے طلبہ کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کی وسیع تر اهمیت سے آگاہ کر کے انھیں ان کی نظر میں معنی خیز بنائے اور ان میں یہ بات پیدا کر دے کہ پیشے زندگی میں بھی اعلی مقاصد اور عین پسندی کو هاتھ سے نہ دیں ' محض مشین بن کر نہ رہ جائیں بلکہ اپنی فطرت کی پوری بلندی اور وسعت کو حاصل کر سکیں - اس لحاظ سے هماری موجودہ تعلیم ' جو محض رسمی علوم و فنون تک محدود هے اور تمدن کے زندہ مسائل سے ان کا ربط ظاهر نہیں کرتی ' بالکل ناقابل اطمینان هے - وہ نہ صرف طلبہ کو معاشی نظام سے ناواقف رکھتی هے بلکہ ان میں عملی کاموں کی صلاحیت کو بھی مردہ کر دیتی هے - محنت اور هاتھ کا کام کرنے کے خلاف ان میں ایک تعصب پیدا هو جاتا هے جو آگے چل کر ان کو بہت تکلیف پہنچاتا هے اور معاش کی بہت سی راهیں ان پر بند کر دیتا هے -

مندرجۂ بالا بحث کا تعلق زیادہ تر نوجوانوں کی تعلیم سے هے - جیسا هم اوپر بتا چکے هیں بچوں کی تعلیم کو اس مسئلے سے براہ راست زیادہ تعلق نہیں - بچپن میں طلبہ

کی دلچسپی اور شوق کو تتلی کی طرح ایک جگہ قرار نہیں ہوتا - ان کی توجہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہوتی رہتی ھے - بچہ اپنی بڑھتی ہوئی شخصیت کے لیے نئے تجربے اس طرح حاصل کرتا ھے کہ کبھی وہ ایک شخص کا پارٹ کرتا ھے کبھی دوسرے کا - کبھی انجن ڈرائیور بنتا ھے تو کبھی ڈاکٹر ' کبھی بچوں کو پڑھاتا ہے تو کبھی گھوڑا بن کر ایک خیالی گاڑی کھینچنے لگتا ھے گویا بقول ورڈزورتھ (Wordsworth) کے " اس کا کام یہی ھے کہ ہمیشہ نیا بہروپ بھرتا رھے " - اس کی کام کرنے کی خواہش جو آگے چل کر کوئی پیشہ اختیار کرنے کے ارادے میں تبدیل ھو جاتی ھے ' مختلف کھیلوں اور نقلوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ھے - بچوں کے کھیلوں اور ان کے پیشوں کے شوق میں جو تعلق ھے اس کے بارے میں پروفیسر اسپرانگر (Spranger) جن کی رائے ہم نے اوپر بیان کی ھے لکھتے ہیں :—

" بچے جو پیشے کے خواب دیکھتے ہیں ان پر کھیل کا اور نقل کا رنگ غالب ہوتا ھے لیکن ان کھیلوں میں نہ صرف گہرے معنی ہوتے ہیں بلکہ ایک مخفی قوت تشکیل بھی جو بڑی گہری اہمیت رکھتی ھے - اس میں شک نہیں کہ پیشوں کے جو کھیل بچے کھیلتے ہیں ان میں سے بعض عہد طفلی سے مخصوص ہیں اور اُن سے آئندہ ارادے کا پتا نہیں چلتا - بعض پیشے ہر بچے کو متوجہ کرتے ہیں کیونکہ وہ عہد طفلی کی جبلی زندگی سے مناسبت رکھتے ہیں یا ان میں آئندہ زندگی کے اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں - مثلاً سپاھی یا کوچبان یا سوداگر بننا '

عمارت یا دوسری چیزیں بنانا ، شکار یا صیادی ، گھوڑے کی سواری ، شمشیرزنی اور نشانے بازی آئندہ زندگی کی عام ضروریات میں سے ہیں - اس لیے اگر بچے کو ان کا شوق ہو تو ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ وہ آئندہ چل کر ان میں سے کسی چیز کو اپنا پیشہ بنائے گا "[۱] -

لیکن بچہ منزل طفولیت اور شباب کی پہلی منزل سے گزر کر شباب کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے تو وہ ان نقلی مشاغل پر قانع نہیں رہتا - اب معاش کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے یعنی اسے کوئی پیشہ اختیار کرنے کی خواہش اور ضرورت ہوتی ہے - اس کی بڑھتی ہوئی قوتیں عملی زندگی کے ساتھ نبردآزمائی کرنا چاہتی ہیں - وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کے گرد و پیش دنیا میں کیا کیا کام ہوتے ہیں اور وہ ان میں کس کام کے لیے زیادہ موزوں ہے - اس کے شوق جو چند سال پیشتر نچلے نہیں بیٹھتے تھے اب کسی ایک مرکز کے گرد جمع ہونے شروع ہوتے ہیں - وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کی طبیعت کو زیادہ لگاؤ ادبی مشاغل سے ہے ، یا سائنس سے ، یا عملی کاروبار سے - اس کا ذاتی مطالعہ ، اس کی دلچسپیاں اس کے فرصت کے مشاغل یہ سب اسی چیز کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں جس کی طرف اسے خاص رجحان ہے - بالفاظ دیگر آئندہ پیشہ کی جھلک ابھی سے اس کی درسی زندگی پر اپنا اثر ڈالنا شروع کرتی ہے اور وہ بالعموم انہیں مضامین اور مشاغل کا انتخاب کرتا ہے اور انہیں

---

۱ — صفحہ ۲۵۲ —

پر زیادہ توجہ اور شوق صرف کرتا ھے جو اس کے نزدیک اس کی آئندہ زندگی میں مفید ثابت ھوں گے اور اسے اس کی منزل مقصود کی طرف لے جاتے ھیں - میرا یہ مطلب نہیں کہ واقعاً ھمارے ملک میں تمام نوجوانوں کی عملی اور ذھنی دلچسپیوں کا ارتقا اسی طریقے پر ھوتا ھے - بدقسمتی سے ھمارے یہاں ان میں سے اکثر کو یہ موقع ھی نہیں ملتا کہ وہ اپنی مخصوص صلاحیتوں اور رجحانوں کے مطابق اپنے لیے کوئی شغل زندگی اختیار کریں - مدرسے سب کو ایک ھی قسم کی کتابی تعلیم دے کر ایک اندھیری گلی میں چھوڑ دیتے ھیں - اس میں جو راستہ بھی مل جائے وہ اسی کو اختیار کر لیتے ھیں خواہ وہ ان کے فطری میلانات کے لحاظ سے مناسب ھو یا نہ ھو - لیکن یہ امر یقینی ھے کہ اگر بچوں کی ابتدائی تعلیم صحیح اصول پر ھو اور عہدشباب میں نوجوانوں کے شوقوں اور جبلتوں کی پرورش مناسب طریقے پر کی جائے تو وہ ثانوی یا اعلیٰ مدارس میں پہنچ کر یقیناً بعض خاص مشاغل کی طرف زیادہ مائل ھوں گے اور اپنی علمی اور عملی دلچسپیوں سے ظاھر کر دیں گے کہ ان کا فطری میلان کس طرف ھے - یہ تو مشکل ھے اور اس کی ضرورت بھی نہیں کہ طالب علم صحیح اور قطعی طور پر بتا سکے کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرے گا - اس کے لیے تجربے کی پختگی اور خودشناسی درکار ھے جو ابھی اسے میسر نہیں آسکتی - واقعہ یہ ھے کہ مناسب پیشے کا انتخاب نہایت مشکل اور بڑی ذمہ‌داری کا کام ھے جس کے لیے ماھرین علم‌النفس اور والدین دونوں کی مدد درکار ھے - اس غرض کے لیے بعض ترقی یافتہ

ممالک میں جابجا ایسے ادارے قائم کئے گئے ھیں جو پیشوں کے انتخاب میں نوجوانوں کی رھنمائی کرتے ھیں ؛ اور وھاں اس سلسلے میں بہت سے مفید مشاھدات اور تجربات ھوئے ھیں - ان سے ظاھر ھوتا ھے کہ بلوغ کے زمانے میں نوجوانوں کو اپنے مستقبل کے مشغلے اور پیشے کی بڑی فکر ھوتی ھے اور اگر ھم یہ چاھتے ھیں کہ نوجوان اپنی تمام دماغی جد و جہد اور توجہ تعلیم کی طرف مبذول کریں تو ان کی تعلیم میں پیشے کے رجحان کو زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ھے - محض نظری رسمی تعلیم جو ان کے نزدیک نہ ان کی موجودہ زندگی اور ضروریات کے لیے موزوں ھے نہ انھیں مستقبل کے لیے تیار کرتی ھے ھرگز یہ کشش نہیں رکھتی کہ وہ دل و جان سے اس میں منہمک ھو جائیں - اس سے ھمارا یہ مطلب نہیں کہ طالبہ کو قبل از وقت عام تعلیم سے ھٹا کر پیشوں کی تعلیم دلائی جائے کیونکہ یہ طریقۂ عمل نہ صرف ان کے شخصی ارتقا کے لیے مضر ھوگا بلکہ ان کی اقتصادی کارکردگی کو بھی یقیناً کم کر دے گا - جو شخص اپنے بچپن اور نوجوانی میں عمدہ ادبی اور علمی تعلیم سے محروم رھتا ھے اس کی دماغی قوتیں پوری طرح نشو و نما نہیں پاتیں - خواہ وہ کوئی شغل اختیار کرے، اسے اس میں پوری کامیابی اور کمال حاصل نہیں ھو سکتا - بعض لوگ ؛ خصوصاً وہ جن کا تعلق براہ راست کاروبار سے اور اقتصادی پیداوار کے کاموں سے ھے ؛ عام ادبی تعلیم کو بچوں اور نوجوانوں کے لیے غیرمفید سمجھتے ھیں اور چاھتے ھیں کہ وقت اور روپئے کی کفایت کر کے جلد سے جلد بچوں کو کوئی " کام کی چیز " سکھا دی جائے تاکہ وہ

زیادہ وقت پیشے میں مہارت حاصل کرنے اور روزی کمانے میں صرف کر سکیں - اس خیال کی محرک جس حد تک وہ بےاطمینانی ہے جو سمجھدار لوگوں کو ہمارے ملک کی کتابی اور نظری تعلیم سے ہے - ہمیں اس سے ہمدردی ہے اور ہر شخص جو علمی دلچسپیوں کے علاوہ دنیا کے حالات اور ضروریات سے بھی واقفیت رکھتا ہے اس خیال کی تائید کرے گا کہ ہماری موجودہ تعلیم طلبہ کو اس زندگی کے لیے بخوبی تیار نہیں کرتی جو ان کو پیش آنے والی ہے - لیکن اس خیال کا وہ پہلو جو عام عقلی تعلیم و تربیت کو مضر اور فضول سمجھتا ہے اور اس کو بند کر کے وقت اور روپئے میں کفایت چاہتا ہے سراسر ناواقفیت اور تنگ نظری پر مبنی ہے - یہ کفایت اگر کی جائے تو آگے چل کر قوم کو بہت گراں پڑ جائے گی - اس طرح یہ تو ممکن ہے کہ ہم ملک میں ایک بڑی تعداد معمولی کاریگروں اور پیشہ وروں کی مہیا کر سکیں جو لکیر کے فقیر بن کر ایک مقررہ راستے پر چلتے رہیں اور اپنے محدود دائرۂ عمل میں کافی مہارت پیدا کرلیں - لیکن قوم میں موجد اور مخترع، محقق اور نئے راستے نکالنے والے لوگ پیدا نہیں ہو سکتے جن کے بغیر کوئی ملک صنعت و حرفت کے سرگرم مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا - جب تک تمام لوگوں کو یہ موقع نہ ملے گا کہ وہ بہترین علوم و فنون اور خیالات کے مطالعے سے اپنی ذہنی قوتوں کو بیدار کریں اس وقت تک غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے لوگ بھی اپنے جوہر کا اظہار نہیں کر سکیں گے - اس کے بغیر نہ تو معاشرتی زندگی کے رہبر پیدا ہو سکتے ہیں نہ صنعت و حرفت کے

ھراول - یہ ضروری نہیں کہ وہ سب لوگ جو عام تعلیم اور اعلیٰ تعلیم سے بہرہور ہوں قوت ایجاد کا اظہار کریں - لیکن کون کہ سکتا ھے کہ اگر ہم ایک ہزار طالبہ کو تعلیم دے کر نو سو ننانوے معمولی ذہانت کے محنتی اور ایماندار کام کرنے والے اور ایک غیرمعمولی ذہانت کا موجد پیدا کر سکیں تو یہ دراصل بہت بڑی کفایت نہ ہوگی ؟ کیونکہ ممکن ھے کہ وہ ایک ھی شخص اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر علم اور صنعت و حرفت میں ایسی کایاپلٹ کر دے کہ باقی تمام کام کرنے والوں کی کارگزاری کئی گنی بڑھ جائے - جس شخص نے بھاپ کی قوت کو انسان کا مطیع بنایا اور اس کو مشینیں چلانے میں استعمال کیا اس نے نوع انسانی کی کارکردگی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ! لہذا عام تعلیم کا عمدہ انتظام کرنا نہ صرف ان اعلیٰ انسانی مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ھے جن کا ہم مختصراً گذشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں بلکہ کاروبار اور حصول معاش کے نقطۂ نظر سے بھی مفید ھے - لیکن شرط یہی ھے کہ " عام تعلیم " اس قدر " عام " نہ ہو جائے کہ اس کو طالبہ کی نفسی کیفیات اور دنیا کی عملی ضروریات سے کوئی تعلق ھی نہ رھے اور وہ محض نظری اور کتابی مطالعے میں محصور ہو کر رہ جائے - یہاں بھی صحیح راستہ اعتدال کا ' مختلف مطالبات کے درمیان توازن پیدا کرنے کا راستہ ھے - یعنی نہ تو ھمیں قبل از وقت پیشے کی مخصوص تعلیم شروع کرنی چاھیے اور نہ عام تعلیم کے زمانے میں بچوں اور نوجوانوں کو دنیا کے عملی اور مادی مشاغل سے اس قدر بےتعلق اور بےنیاز کر دینا چاھیے کہ وہ ثانوی تعلیم

ختم کرنے کے بعد کسی قسم کے کاروبار کے قابل ہی نہ رہیں اور انہیں محض یہ خواہش ہو کہ کسی دفتر میں محرری یا ملازمت اختیار کر لیں -

پیشے کی بحث میں ایک نہایت اہم سوال جس کی حیثیت ایک قدیم تاریخی مسئلے کی ہو گئی ہے یہ ہے کہ عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا صحیح مفہوم کیا ہے اور آیا یہ دونوں دوسرے سے بالکل متضاد اور مختلف ہیں یا ان میں ربط اور تعلق کا امکان ہے - قدیم نقطۂ نظر تو یہی ہے کہ ان دونوں کے مقاصد بالکل جداگانہ ہیں اور ہم دونوں کو کسی طرح جمع نہیں کر سکتے - لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بہر حال دونوں قسم کی تعلیم ایک ہی شخص کو دی جاتی ہے گو ان کا زمانہ مختلف ہو اور دونوں ایک ہی نظام تعلیم کے جزو ہیں - اس لیے ہم اپنے نقطۂ خیال کے بموجب کسی ایسے نظریے سے مطمئن نہیں ہو سکتے جو ہمارے نظام تعلیم کے مختلف عناصر کو ایک سلسلے میں منسلک نہ کرے اور ان سب کو ان کے مشترک موضوع یعنی انسان کی شخصیت کی نشو و نما کا ذریعہ نہ بنائے - لہذا ہم ان الفاظ پر غور کر کے پہلے ان کے صحیح مفہوم کا تعین کریں گے اور اس کے بعد بتائیں گے کہ ان دونوں میں اتحاد مقاصد کس صورت میں ممکن ہے -

مدرسوں میں جو تعلیم بالعموم رائج ہے وہ عام تعلیم کہلاتی ہے - یہ طلبہ کو براہ راست کسی پیشے کے لیے تیار نہیں کرتی - اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصد ہے طلبہ کی سیرت کی تربیت ، ان کی ذہنی قوتوں کو بیدار کرنا ،

اُن میں تہذیب نفس پیدا کرنا - چونکہ یہ تعلیم روزی کمانے میں مدد نہیں دیتی اس لیے اس کو غیر افادی تعلیم بھی کہا جاتا ہے لیکن اس کے حامی اس اصطلاح کو کسی برے معنی میں استعمال نہیں کرتے بلکہ فخر اور تعریف کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان شرفا کے لیے ہے جنہیں بوجہ اپنی خوش حالی کے کسب معاش کی ضرورت نہیں محض ذہن کی تربیت اور اخلاق کی جلا درکار ہے -

برخلاف اس کے صنعتی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ براہ راست طلبہ کو کسی خاص شغل یا پیشے کے لیے تیار کرتی ہے - وہ محدود مادی معنوں میں "افادی" ہے اور عام طور پر ان لوگوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے جو اعلیٰ تعلیم پانے کی مقدرت نہیں رکھتے اور جن کے لیے ضروری ہے کہ وہ جلد سے جلد روزی کمانے لگیں - لوگ بالعموم "غیر افادی" تعلیم کو "افادی" تعلیم پر ترجیح دیتے ہیں اور "افادی" تعلیم تو مقابلتاً کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب خیالات غلطفہمی پر مبنی ہیں جس کے بہت سے تاریخی اسباب ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - یہ اسباب ایک طرف اس دوئی سے تعلق رکھتے ہیں جو فلسفے اور انسانی عقائد کی تاریخ میں مدت سے چلی آتی ہے جس کی وجہ سے ہم بالعموم دنیا کے تمام امور اور مسائل کو بجائے ایک کل کی صورت میں دیکھنے کے دو متضاد حصوں میں منقسم سمجھتے ہیں - چنانچہ لوگ ہمیشہ انسانی زندگی کے لازمی اجزا یعنی علم و عمل ' عالم معقول اور عالم محسوس ' فرصت کے مشاغل یعنی

فنون لطیفہ اور کام کے مشاغل یعنی دستکاری میں ایک حد فاصل کھینچتے آئے ہیں - ان کا خیال یہ رہا ہے کہ وہ تعلیم جو لوگوں کو نظری علوم سکھائے ان کو غور و فکر کی زندگی کے لیے تیار کرے ' ان میں فنون لطیفہ کا مذاق پیدا کرے ' بجائے خود مکمل ہے اور اس تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے جو عملی مشاغل اور مادی علوم سکھاتی ہے اور لوگوں کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کے لیے تیار کرتی ہے - وہ انسان کی زندگی اور ضروریات پر ایک مجموعی اور ہمہ گیر نظر نہیں ڈال سکتے بلکہ اس کو بالکل دو جداگانہ شعبوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کی علحدہ قدر و قیمت مقرر کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جب تک ان دونوں میں اشتراک عمل نہ ہو متمدن اور مہذب معاشروں کا قیام ہی ممکن نہیں - اس خیال کی دوسری وجہ جیسا کہ موجودہ زمانے کے بہت سے مفکرین اور تعلیم کے میدان میں بالخصوص پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی تصانیف میں ثابت کیا ہے بعض اقتصادی اور معاشرتی حالات ہیں جنھوں نے صدیوں سے انسانی سوسائٹی کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے - وہ جماعت جس کو ہر قسم کی اقتصادی سہولتیں حاصل رہتی ہیں اور معاش کی جد و جہد سے فرصت نصیب ہے اپنی فرصت کے اوقات میں کتابی اور نظری علوم کی تحصیل کرتی رہی - اس نے اپنی پسند کے علوم اور مشاغل کو ان تمام علوم پر فوقیت دی جو صنعت و حرفت کے کار و بار سے یا مادی اشیا کے بنانے اور فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں - چونکہ ان لوگوں کو خود ہاتھ سے کام نہیں

کرنا پڑتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے ان تمام مشاغل کو حقیر جانا جن میں ہاتھ کا کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں تک کہ فنون لطیفہ اور صناعیوں کو بھی نظری علوم مثلاً فلسفہ، منطق، اور ریاضی وغیرہ سے کم درجے کا قرار دیا۔ انھیں لوگوں نے اپنے محبوب خیالات اور تصورات کو مروجہ فلسفے کا جزو بنا دیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک تعلیم میں وہ فرق نمایاں ہے جو نظری علوم اور عملی مشاغل میں کیا گیا تھا۔

جہاں تک ہمارے موجودہ نظام تعلیم کا تعلق ہے عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا اِمتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمارے یہاں کی ''عام تعلیم'' جس کو پیشے کی تعلیم سے علحدہ اور برتر سمجھا جاتا ہے در اصل بہت تنگ اور محدود معنی میں پیشے کی تعلیم ہے۔ کیونکہ ہمارے مدارس طلبہ کو ایک خاص قسم کی کتابی تعلیم دیتے ہیں جو ان کو سوائے چند مخصوص مثلاً دفتروں کی نوکری یا قانون یا تعلیمی ملازمت کے اور کسی لائق نہیں بناتی۔ اس سے ذہنی قوتوں کی عام تربیت اور بیداری کا مقصد حاصل نہیں ہوتا گو اس کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ طلبہ کی سیرت کی تشکیل کرتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اصول تعلیم اور طلبہ کے نفسی ارتقا کے اصولوں سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی طریقے اس درجہ ناقص اور امتحانوں کے تابع ہیں کہ طلبہ کے ذہنی رجحانات اور قوتوں کی نشو و نما کی طرف توجہ کر ہی نہیں سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ پیشہ آموزی کے نقطۂ نظر سے اُس تعلیم میں اور تجارتی یا زراعت یا انجینیری کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کے مقاصد، خواہ ان کا دعویٰ کچھ بھی ہو،

تنگ اور محدود ہیں - فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ بعض نوکریوں کے لیے طلبہ کو تیار کرتی ہے اور یہ بعض دستکاریوں اور عملی فنون کے لیے - لہذا اس روایتی اختلاف کو نظر انداز کر کے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کے اپنی اپنی جگہ پر کیا فوائد ہیں اور دونوں کے ذریعے ذہنی تربیت اور بیداری کے اسباب مہیا ہوسکتے ہیں یا نہیں - موجودہ تعلیمی نظریے کا دعویٰ یہ ہے کہ پیشے کی تعلیم کو حقیر سمجھنا غلطی ہے کیونکہ اس میں ایسے امکانات موجود ہیں کہ اگر ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کو دانشمندی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ ذہنی تربیت اور تہذیب نفس میں بھی معین ہو سکتے ہیں - نفسیاتی تحقیقات نے اس امر کو ثابت کر دیا کہ ذہنی عمل اور دستکاری میں بنفسہ کوئی تضاد نہیں اور یہ خیال غلط ہے کہ اگر کسی فن یا ہنر کے سیکھنے میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے تو وہ ذہنی تربیت کا ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا - اس غلط خیال کا اثر نہ صرف فنی تعلیم کے مسائل میں نظر آتا ہے بلکہ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ مدارس کے نصاب کی بحثوں میں بھی نمایاں ہے - اکثر ملکوں کے تعلیمی نظام پر صدیوں یہ غلطفہمی حاوی رہی ہے کہ لڑکوں کی تعلیم میں نجاری، پارچہ بافی اور مختلف قسم کی دستکاریوں اور فنون کو داخل کرنے سے یا لڑکیوں کی تعلیم میں امور خانہداری، کھانا پکانا، گھر کی درستی اور صفائی کپڑوں کی سلائی وغیرہ کو اہمیت دینے سے ہم اس کو ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے ناقص بنا دیں گے اور طلبہ کو ان چیزوں کا سکھانا معلم کے بلند اور اعلیٰ فرائض سے فروتر ہے - یہ قدیم

تعصب آج تک پوری طرح دور نہیں ہوا اور ہندوستان میں خاص طور پر پھیلا ہوا ہے - اس بارے میں پروفیسر ڈیوئی کی راے غور طلب ہے -

" اگر کسی نئے ہنر کے سیکھنے سے طالب علم بہت سے نئے خیالات سے روشناس اور متاثر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے خود انسانی زندگی کے مقصد اور منشا پر روشنی پڑتی ہے تو اس کو یقیناً علمی لحاظ سے بہت قابل وقعت سمجھنا چاہئیے - حقیقت میں ہر فن اور ہنر کی علمی قدر کا معیار یہی ہے کہ آیا وہ فن طالب علم کی دلچسپیوں کا حلقہ وسیع کرتا ہے اور نئے حل طلب مسائل اور بحث مباحثے کے مواقع پیدا کرتا ہے یا نہیں "۱

ممکن ہے کہ غلط اصولوں کو اختیار کرنے کی وجہ سے صنعت اور دستکاری کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ اس سے نہ طلبہ کی دلچسپیوں میں وسعت پیدا ہو ' نہ ان میں ذہنی کاوش اور جد و جہد کا ملکہ بیدار ہو ' نہ زندگی کے منشا پر کوئی روشنی پڑے بلکہ انسان محض نقل اور مشق کے ذریعے مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص کام کرنا سیکھ لے - لیکن یہ بات کچھ صنعتی تعلیم ہی پر موقوف نہیں - نظری اور کتابی تعلیم کی بھی یہ صورت ہو سکتی ہے - ممکن ہے (بلکہ بالعموم ہوتا یہی ہے) کہ استاد طلبہ کو مختلف علوم اس طرح پڑھائے کہ سوائے حافظے کے ان کی اور کوئی دماغی قوت کام میں نہ آئے اور وہ باوجود اعلیٰ امتحانات پاس کر لینے کے

Dewey : Democracy and Education — I

دماغی نشو و نما کے ابتدائی مدارج سے آگے نہ بڑھ سکیں - لہٰذا اصلی فرق طریقۂ تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے - مضامین کی نوعیت کو اس میں زیادہ دخل نہیں - اگر مدرسوں میں عملی مضامین کی تعلیم یعنی ان مضامین کی جن کا رجحان پیشہ‌آموزی کی جانب ہے اس طرح دی جائے کہ اس کے دوران میں طلبہ نئے نئے مسائل سے دو چار ہوں جن کو حل کرنے کے لیے جسمانی اور دماغی کاوش کی ضرورت ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ تمدنی زندگی کے وسیع‌تر اغراض و مقاصد سے ان کا کیا تعلق ہے تو یہ مضامین بھی علمی اور معاشرتی اعتبار سے ایسے ہی قابل قدر ثابت ہوں گے جتنے خالص علمی مضامین - بلکہ ہمارے خیال میں مخصوص پیشہ‌ورانہ تعلیم میں بھی، جو پیشہ‌آموز تعلیم گاہوں میں دی جاتی ہے، یہی اصول کارفرما ہے -

اس بحث سے عام تعلیم کے مسئلے پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اس سے بعض مفید نتائج مترتب ہوتے ہیں جن کو ماہرین تعلیم نظرانداز نہیں کر سکتے - نوجوانوں کی نفسی ارتقاء کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مدرسوں کی نظری اور کتابی تعلیم ان کی مکمل تربیت اور ان کی شخصیت کی نشو و نما کی ضامن نہیں ہو سکتی - بہت سے نوجوانوں کی دلچسپیاں اور جبلی شوق زیادہ تر عملی ہوتے ہیں - ان کو یہ تعلیم بےکار اور مصنوعی معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ ان کے عملی شوقوں کو اظہار کا موقع نہیں دیتی - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ کو اس پر صرف نہیں کرتے، اس کے مقاصد کو اپنا نہیں بنا سکتے، اس کے مشاغل اور درس و تدریس میں اپنی شخصیت اور مخصوص ذاتی رجحانات کے اظہار کا موقع نہیں

پاتے - ان نوجوانوں کے لیے تو خالص نظری تعلیم صریحاً بےسود ہوتی ہے - لیکن باقی طلبہ میں بھی اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعت پر گو عملی دلچسپیاں حاوی نہ ہوں پھر بھی ان کی زندگی کا ایک اہم جزو ضرور ہوتی ہیں - ان سب کے لیے اس نازک اور اہم دور میں پیشے کا تصور اور اس کی رہنمائی کرنے والے مشاغل بہت کشش رکھتے ہیں اور مفید ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ انہیں اپنے بہت سے نئے تجربات اور خیالات کا مرکز بنا سکتے ہیں - اگر معلم اس امر کی احتیاط رکھے کہ ان مشاغل کی وجہ سے نوجوانوں کی نظر اور ان کی ذہنی دلچسپیاں تنگ اور محدود نہ ہونے پائیں تو ہم تعلیم میں اس عنصر کو شامل کر کے تخلیقی قوتوں کو دعوت عمل دے سکتے ہیں جو موجودہ حالات میں نامناسب ماحول کی وجہ سے مرجھا کر رہ جاتی ہیں -

ہم نے جو مفہوم پیشے کی تعلیم کا پیش کیا ہے وہ اس مفہوم سے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے بہت زیادہ وسیع ہے - ہماری مراد اس سے محض یہی نہیں کہ ہر شخص کو ایک خاص کام یا صنعت سکھا دی جائے مثلاً ایک آدمی کو درزی ' دوسرے کو جلاہا ' تیسرے کو انجینیر ' چوتھے کو معلم بنا دینے سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا - کسی شخص کو دنیا میں صرف وہی ایک کام کرنا نہیں ہوتا جس کی علت غائی حصول معاش ہو بلکہ اس کے اور بھی بہت سے کام اور فرائض ہوتے ہیں - اگر درزی کا پیشہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر اپنی روزی پیدا کرے تو اس کا دوسرا " پیشہ " یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان کی تعلیم و تربیت اور آسائش کا اہتمام کرے -

اس کا تیسرا " پیشہ " یہ ھے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں ' اپنے شہر یا گاؤں کے رھنے والوں کے حقوق ادا کرے اور اس پر تمدنی فرائض بحیثیت معاشرے کے ایک رکن کے عائد ہوتے ھیں ان کو پورا کرے یعنی لوگوں کے رنج و راحت میں شریک ھو ' اپنی بساط کے موافق ان کی امداد کرے ' ہر قسم کی اصلاحی تحریکوں کا ساتھ دے اور خراب رسموں اور روایتوں کو دور کرنے کی کوشش کرے - لہذا ہر شخص صرف ایک ھی پیشہ نہیں رکھتا بلکہ بہت سے پیشے رکھتا ھے جن میں سے ہر ایک کے خاص فرائض اور ذمہ داریاں ھیں جنھیں پورا کرنا اس پر فرض ھے - وہ یہ نہیں کر سکتا کہ صرف ایک پیشے کو جس کا تعلق حصول معاش سے ھے اپنی توجہ اور جد و جہد کا مرکز بنائے اور باقی سب کی طرف سے غافل رھے - اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی شخصیت اور اس کی ترقی کے امکانات بہت محدود ہوکر رہ جائیں گے اور وہ نہ خود کامیابی حاصل کر سکے گا نہ معاشرے کے لیے مفید ثابت ھوگا - اس میں شک نہیں کہ ھر شخص کا معاشی پیشہ " وہ مخصوص گوشہ " ھوتا ھے جہاں سے وہ ' بقول اسپرانگر (Spranger) کے " دنیا کا مشاہدہ کرتا ھے " اور ایک لحاظ سے وھی اس کی روزمرہ کی جد و جہد اور سوسائٹی کی خدمت کا مرکز بن جاتا ھے - لیکن وہ مرکز جس کے گرد کوئی دائرہ نہ ھو بالکل بےمعنی اور مہمل ہوتا ھے - اور اس کی معاشی جد و جہد کا صحیح منشا اور مفہوم بھی اس وقت واضح ھوتا ھے جب وہ اس کو معاشرتی زندگی کے وسیع تر مقاصد کے ساتھ ربط دیتا ھے - جس قدر کسی شخص کے معاشرتی تعلقات زیادہ ھوتے ھیں ' اس

کی تعلیم اعلیٰ ہوتی ہے، اس کے عمل کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، اسی نسبت سے اس کے فرائض اور "پیشے" بھی زیادہ ہوتے ہیں - اس کو مقامی، ملکی اور بعض اوقات بین‌الاقوامی معاملات میں دلچسپی اور حصہ لینا پڑتا ہے، اپنے حقوق سے مناسب طریقے پر فائدہ اٹھانا اور فرائض کو مناسب طریقے پر انجام دینا پڑتا ہے - وسیع انسانی نقطۂ نظر سے پیشہ‌ورانہ تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ انسان کو ان تمام پیشوں اور فرائض کے لیے تیار کیا جائے تاکہ وہ محض اقتصادی پیداوار کا ایک آلہ نہ بن جائے بلکہ ایک مفید اور کارکن شہری اور ذمہ‌دار فرض شناس انسان ثابت ہو -

یہ ہے پیشے کی تعلیم کا وسیع مفہوم - لیکن اگر ہم اس کے محدود اور معروف معنی پر غور کریں تو اس کے لحاظ سے بھی اس کا مفہوم یہ نہیں کہ ہر شخص کو ایک خاص کام سکھا دیا جائے اور بس - ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام کام کرنے والوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ ذہنی تربیت اور بیداری کے ان مواقع اور امکانات سے فائدہ اٹھا سکیں جو زمانۂ حال کی صنعت و حرفت کے نظام میں موجود ہیں - ممکن ہے بعض سرے سے اس کے قائل نہ ہوں کہ اس مشین کے عہد میں صنعت و حرفت کے مشاغل میں اس قسم کے کوئی امکانات پائے جاتے ہیں - ہم نے خود بھی اوپر اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عام لوگوں کے موجودہ مشاغل سے وہ عنصر مفقود ہو گیا ہے جو ان کی شخصیت کی تربیت میں مدد دیا کرتا تھا - لیکن اصل میں صورت حال یہ ہے - کہ اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد سے کام کی نوعیت

بدل گئی ھے - یہ سچ ھے کہ موجودہ حالات میں اکثر لوگوں کو نہ اپنے کام میں دلچسپی ھے ' نہ اس کے نتائج اور عام اثرات سے واقفیت - لیکن اس کی وجہ یہ ھے کہ صنعتی انقلاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے تعلیم میں جو تبدیلیاں ھونی چاھیے تھیں وہ نہیں ھوئیں - زمانۂ حال کے صنعتی کاروبار میں سائنس کو بہت زیادہ دخل ھو گیا ھے بلکہ یوں کہنا چاھیے کہ اس کی بنیاد تمام تر سائنس ھی پر قائم ھے - اس وجہ سے پہلے کی نسبت اس میں علمی اور عقلی عنصر بہت بڑھ گیا ھے یعنی اسے سمجھداری اور قابلیت سے انجام دینے کے لیے بہتر اور وسیع تر تعلیم کی ضرورت ھے - موجودہ صنعتی نظام کا اثر تمدنی ترقی پر پڑا ھے اور اس کا جو تعلق انسان کی فلاح اور خوش حالی سے ھے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے ذھنی بیداری اور ھمہ گیر دلچسپی درکار ھے - یہ بات اسی وقت حاصل ھو سکتی ھے جب نظام تعلیم میں ایسی اصلاح کی جائے کہ وہ کاری گروں ' مزدوروں اور مشین چلانے والوں کو ان نئے تعلقات اور حالات کے لیے تیار کرے - کوئی کاری گر جس کو ابتدائی تعلیم اور ذاتی مطالعے نے یہ نہیں سکھایا کہ سائنس کی حیرت انگیز نشو و نما اور وسائل آمد و رفت کی ترقی نے جماعتوں اور قوموں اور ملکوں کو ایک نئے مضبوط اور قریبی رشتے میں منسلک کر دیا ھے اور لوگوں کے مفاد اور مقاصد میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کر دی ھے ' یا کم از کم اس کے پیدا ھونے کا امکان بڑھ گیا ھے ' اور زندگی کو کامیابی اور خوش حالی سے بسر کرنے کے لیے افراد اور اقوام اور فطرت کی تمام قوتوں میں اشتراک عمل کی

ضرورت ھے، وہ شخص نہ معاشرت اور معیشت کے جدید نظام میں مفید طریقے سے حصہ لے سکتا ھے نہ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ھے اس لیے بقول پروفیسر دیوئی (Dewey) کے -

"ایسی تعلیم کی شدید ضرورت اور تقاضا ھے جو کاری گروں کو ان مشاغل کے معاشرتی اور علمی نتائج اور اثرات سے آگاہ کرے کیونکہ جو لوگ اس تعلیم سے محروم رھیں گے وہ محض ان مشینوں کے پرزے بن کر رہ جائیں گے جن کو وہ چلاتے ھیں "۱ -

لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ کاری گروں کو مختلف پیشوں کا یا کارخانوں کا کام سکھا دیا جائے یا مدرسوں میں وھی اقتصادی اور صنعتی نظام رائج کر دیا جائے جو عملی دنیا میں پایا جاتا ھے - ھمارے سامنے یہ سوال ھرگز درپیش نہیں کہ مدرسوں کو تجارت، کاروبار اور صنعت و حرفت کی ایک شاخ یا شعبہ بنا دیا جائے بلکہ تعلیمی مسئلہ یہ ھے کہ "صنعت و حرفت کے مشاغل کو کس طرح کام میں لایا جائے کہ مدرسوں کی زندگی زیادہ معنی خیز اور طلبہ کی موجودہ ضروریات اور مدرسے سے باھر کے تجربات کے ساتھ زیادہ مربوط اور ھم آھنگ ھو جائے" لہذا ھمارے ماھرین تعلیم کو خاص طور سے اس مسئلے پر غور کرنا چاھیے کہ موجودہ نظری تعلیم میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ھے جو اس کو ملکی حالات کے لیے مناسب اور ملکی ضروریات کے لیے مفید بنا دیں - ھندوستان میں مفلسی اور بےروزگاری

---

۱ - Dewey: Democracy and Education. صفحہ ۳۶۷

کا مسئلہ ایک نہایت اہم اور اندیشہناک مسئلہ ہے اور اس
کی ذمہداری ایک بڑی حد تک ہمارے نظام تعلیم پر عائد
ہوتی ہے جو فارغ التحصیل طلبہ پر کسب معاش کی بہت
سی راہیں بند کر دیتا ہے جن میں ترقی کرنے اور دولت پیدا
کرنے کے مواقع ہیں - اور تعلیم یافتہ جماعت کے افراد کا ضرورت
سے زیادہ ہجوم چند محدود اور مقابلتاً کم مفید پیشوں میں
ہو جاتا ہے - ابتدائی مدارس میں دستکاری اور عملی مشاغل
کو اس لیے شامل کرنا چاہیے کہ وہ بچوں کی آرزوے تخلیق
و خواہش عمل کو پورا کرتے ہیں اور جسم و دماغ سے بیک
وقت کام لیتے ہیں - اور ثانوی مدارس میں ایسے مضامین ،
علوم اور مشاغل کو داخل کرنا چاہیے جن کا تعلق نوجوانوں
کی آئندہ پیشے کی زندگی سے ہو تاکہ یہ تعلیم نہ صرف ان کے
لیے زیادہ مفید ثابت ہو بلکہ ان کے شوقوں اور دلچسپیوں کا
مرکز بھی بن جائے - لیکن شرط یہی ہے کہ یہ پیشہورانہ
رجحان عام ذہنی بیداری اور تہذیب نفس کے امکانات کو
مسدود نہ کرے بلکہ ان کو رفتہ رفتہ زندگی کی عملی ضروریات
کے ساتھ مربوط اور منسلک کر کے اور زیادہ مستحکم اور مستقل
بنا دے - اگر طلبہ میں علمی اور عملی مشاغل کے استمزاج
سے اپنے مشاغل کی صحیح تمدنی اہمیت کا احساس پیدا
ہو جائے گا تو وہ انسان‌نما مشینوں کے درجے سے گزر کر ذمہدار
اور آزاد انسانوں کے مرتبے پر پہنچ جائیں گے جن کو اپنے کام
میں خوشی تہذیب نفس اور اظہار خودی کے موقعے حاصل
ہیں - ہم اس کتاب کے مختصر حدود میں پیشہورانہ تعلیم
کا کوئی نظام نہیں پیش کرسکتے نہ یہ بحث چھیڑ سکتے ہیں

کہ ہندوستان میں کس قسم کی صنعتی اور فنی تعلیم درکار ہے اور اس کے لیے بہترین انتظامات کیا ہو سکتے ہیں - لیکن مختصراً یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس نظامِ تعلیم کی بنیاد کن اصولوں پر رکھنی چاہیے - ہمیں اندیشہ یہ ہے کہ کہیں رفتار زمانہ اور روزگار کے مسئلے سے پریشان اور ضرورت سے زیادہ متاثر ہو کر ہمارے مدارس اصلی تعلیمی مقاصد کو نظرانداز نہ کردیں اور محض مخصوص پیشہ‌ورانہ تعلیم میں منہمک ہوکر نہ رہ جائیں ' کیونکہ یہ ظاہر اس میں فوری فائدہ اور مالی نفع زیادہ معلوم ہوتا ہے اور فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے قریب کی راہ ڈھونڈتی ہے خواہ آگے چل کر یہ جلد بازی نقصان کا باعث ہو - ایک حد تک یہ مطالبہ بعض جماعتوں اور ذمہ‌دار افراد کی طرف سے تحریر و تقریر کے ذریعے کیا بھی جا رہا ہے - اس لیے ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ اس معاملے میں رائے عامہ کی صحیح رہنمائی کریں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور لوگوں کو سمجھادیں کہ ابتدائی مدارج میں عام تعلیم اور پیشہ‌ورانہ تعلیم کے مقاصد میں حقیقی تناقض نہیں ہے - اس منزل میں تعلیم کے عام مقاصد کو جن میں دماغ اور مختلف انسانی قوتوں کی صحیح نشو و نما اور استعمال شامل ہیں ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے لیکن اسی کے ساتھ ان عام مقاصد کے واسطے نصاب کی تدوین و تعلیمی وسائل اور مدرسے کے مشاغل کی تنظیم اسی طرح کرنی چاہیے کہ طلبہ میں عمل اور ذہنی اجتہاد کی قوتیں بیدار ہوں جو دنیا کے تمام کاروبار اور پیشوں میں مفید ہیں - پیشہ‌ورانہ تعلیم کے

لحاظ سے بھی تاریخ، جغرافیا، ادب، سائنس، زبانیں اور دستکاریاں سکھانا فضول نہیں بلکہ مفید اور لازمی ہے کیونکہ ان سے جو عام ذہنی بیداری پیدا ہوتی ہے اور جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ہر قسم کے پیشے کے لیے مفید ہیں - مگر شرط یہی ہے کہ یہ تمام مضامین اس طرح نہ پڑھائے جائیں کہ بچوں کی عملی قوتیں اور جسم و دماغ بالکل معطل ہوجائیں اور وہ محض حافظے کی مدد سے واقعات اور غیرمفید معلومات کا ذخیرہ دماغ میں ٹھونس لیں جو بجائے محرک عمل ہونے کے ذہن پر بار ہوکر رہ جائے - طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ طلبہ کو اپنی جدت اور اپچ کے اظہار کا موقع ملے، ان میں اشتراک عمل کی صلاحیت اور کاموں کی تقسیم و ترتیب کا ملکہ پیدا ہو اور وہ عملی اور نظری مشکلات سے عہدہ برآ ہونا سیکھیں اور رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن جائیں -

ثانوی تعلیم میں پیشے کا رجحان مقابلتاً زیادہ نمایاں ہونا چاہیے اور اس کے نصاب اور مشاغل میں ایسے مضامین شامل کرنے چاہییں جو آگے چل کر پیشوں میں براہ راست مفید ہوسکیں مثلاً عملی سائنس، تجارتی جغرافیہ، کاروباری واقفیت وغیرہ - لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ طلبہ کو انتخاب مضامین کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے اپنے مذاق اور طبیعت کے موافق بعض مضامین کو اختیار اور بعض کو ترک کر سکیں - ہمیں یہاں نصاب کی مفصل بحث منظور نہیں مگر جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ثانوی مدارس میں بعض مضامین تو لازمی ہوں گے کیونکہ ان کے بغیر طلبہ کی تعلیم

ادھوری اور نامکمل رہ جائے گی - بعض مضامین ایسے ہیں
جنھیں لازمی قرار دینا مذاق اور طبائع کے اختلاف کی وجہ سے
قرین مصلحت نہیں - مثلاً اگر ایک طالب علم صریحاً ادبی
ذوق رکھتا ہے اور اس کو زبانوں سے ' فنون لطیفہ سے ' تاریخ سے
دلچسپی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ اس کو ہندسہ اور جبر و
مقابلہ سیکھنے پر مجبور کیا جائے - یا اگر ایک طالب علم
فطرتاً سائنس کے عملی پہلو کی طرف زیادہ متوجہ ہے اور اس
کی دماغی جدت اور جولانی کا اظہار اس کے ہاتھوں کے ذریعے
ہوتا ہے تو کیا ضرور ہے کہ اس کا وقت اور محنت زبانوں کی
تحصیل پر صرف کی جائے - ابتدائی مدارس میں وہ اپنی
مادری زبان سیکھتا ہے اور کسی قدر انگریزی جو اس وقت
ہمارے ملک میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے - ثانوی مدرسے
میں وہ ان زبانوں کا مطالعہ جاری رکھتا ہے لیکن اونچی
جماعتوں میں اس کی توجہ زیادہ‌تر ایسے مضامین کی جانب
رہنی چاہیے کہ بحیثیت مجموعی اسے سائنس سے زیادہ
گہری دلچسپی اور واقفیت پیدا ہو - مثلاً ایک طالب علم
حساب اور طبیعیات کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کو مشینوں اور
آلات سے دلچسپی ہے - وہ اپنے آپ کو انجینیری کے کسی شعبے
کے لیے تیار کرتا ہے - یا ایک دوسرا طالب‌علم کیمیا اور حیاتیات
سے شوق رکھتا ہے اور اُن علوم کو حاصل کرتا ہے جن کا تعلق
اجسام نامیہ سے ہے - اس کے لیے آئندہ چل کر موقع ہے کہ وہ
زراعت یا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے - کیا ان طلبہ
کے نصاب میں بہت سے غیر ضروری مضامین اس خیال سے
داخل کرنا مناسب ہوگا کہ ان سے " دماغ کی تربیت " ہوتی

ہے؟ ایسا کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ ہم ان کے مخصوص اور نمایاں رجحان کو بھی کمزور یا معدوم کردیں گے - ان طلبہ کو ایسے مضامین پسند کرنے کا موقع دینا چاہیے جن میں باہمی ربط ہو اور وہ سب ان کے خاص مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہوں اور ان کے لیے ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ ان چند مضامین کا مطالعہ وسیع اور گہری نظر سے کر سکیں - ہماری موجودہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی کمزوری اور پیشوں کی تعلیم کی خرابی کا بڑا سبب یہی ہے کہ طلبہ تمام مضامین کا بالکل سرسری مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی واقفیت بہت سطحی ہوتی ہے - وہ کسی مضمون پر بھی پورا عبور اور مہارت نہیں رکھتے - وہ مجبوراً محض امتحان کی ضرورت سے مر کھپ کر سب مضامین یاد کر لیتے ہیں - اس قسم کی تعلیم نہ ان میں علمی قابلیت پیدا کر سکتی ہے نہ عملی صلاحیت جو اکثر پیشوں میں درکار ہوتی ہے - اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ جب تک ثانوی تعلیم کی تنظیم نو اس طرح نہ کی جائے کہ طلبہ چند مضامین کا گہرا مطالعہ کر کے ان میں واقعی قابلیت حاصل کریں فنی تعلیم میں کامیابی نہیں ہو سکتی - تعلیمی مقصد اس وقت بھی معلم کی نظر میں پیش پیش رہنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی معلم اور متعلم دونوں کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایک عملی دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے جہاں محض لفظی اور سطحی علم سے کام نہیں چلتا بلکہ کم از کم کسی ایک چھوٹے سے شعبے میں ٹھوس معلومات اور مہارت کی ضرورت ہے -

اسی ضمن میں ایک بات ماہرین تعلیم سے زیادہ ارباب

حکومت اور اہل سیاست کی توجہ کی محتاج ہے - پیشوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص اہتمام کی ضرورت ہے - ایک طرف جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں طلبہ کی صلاحیتوں اور رجحانات کا امتحان کرنا لازم ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ وہ کن مشاغل اور پیشوں کے لیے فطرتاً موزوں ہیں - اس تفتیش میں ہمیں ان " آزمائشوں " (Tests) سے مدد ملے گی جو گزشتہ سالوں میں ماہرین فن نے ترتیب دی ہیں - اس کام کو نظم اور ترتیب سے کرنے کے لیے جا بجا ایسے ادارے قائم کرنے چاہییں جن میں وہ تمام مواد جمع کیا جائے جس کا اس مسئلے سے تعلق ہے - یعنی تمام مقامی طلبہ کے متعلق ان کے والدین اور اساتذہ کی رائیں، ان کے مدرسوں کی رپورٹیں، آزمائشوں کے نتائج وغیرہ - پھر ان اداروں کا یہ فرض ہو کہ ان تمام چیزوں کی بنا پر طلبہ کو پیشہ اختیار کرنے کے بارے میں معقول اور معتبر مشورہ دیں - لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے - ہم کسی ملک کی معاشی تنظیم محض افراد کی صلاحیتوں کی بنا پر نہیں کر سکتے - ہمارا دوسرا فرض یہ ہوگا کہ ہم باقاعدہ تحقیق کر کے معلوم کریں کہ ملک میں مختلف پیشوں اور کاروبار میں کہاں کہاں اور کس قدر گنجائش ہے - کہاں ایک خاص پیشے کے امیدواروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے اور کس شعبے میں ایسے مواقع ہیں جن سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا - ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اس کا انتظام کرنا یقیناً بہت مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور ممکن ہے کہ ان لوگوں کو جو تمام مفید تحریکوں کا مضحکہ اڑایا کرتے ہیں یہ ناممکن معلوم ہو - لیکن اب جب کہ تعلیم کا مسئلہ تمام

و کمال صوبجاتی حکومتوں کے سپرد کر دیا گیا ہے ہر صوبے کے تعلیمی اور مالی محکموں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے صوبے میں اس قسم کا عام معاینہ کرائیں اور وقتاً فوقتاً اس کا اعادہ اور تصحیح کرتے رہیں اور مناسب تعلیم اور وسائل معاش کی تنظیم کے ذریعے رفتہ رفتہ کام کرنے والوں اور کسب معاش کے مواقع میں صحیح نسبت قائم کریں - موجودہ صورت حال کسی طرح قابل اطمینان نہیں ہے کیونکہ مروجہ تعلیمی پالیسی کا حال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھی مشین بغیر بازار کی طلب اور خریداروں کی ضروریات کا خیال کئے کسی ایک قسم کی چیز بے تحاشا بنائے چلی جائے ' اور اس سے بحث نہ ہو کہ یہ تمام پیداوار کس مصرف میں آئے گی - لہذا اس حالت کی اصلاح کے لیے اولاً صوبوں کو علحدہ علحدہ کوشش کرنی ہوگی اور اس کے بعد تعلیم کے لیے وفاقی نظام میں جو محکمہ بھی قائم کیا جائے اس کو ان انفرادی کوششوں میں ربط اور تعاون قائم کرنا پڑے گا کیونکہ اگرچہ بہت سے معاشی وسائل ایسے ہیں جن کا تعلق محض علحدہ علحدہ صوبوں سے ہوگا لیکن بعض ایسے مسائل اور مشکلات بھی ہوں گی جن کا حل تمام ہندوستان کے لیے ایک ہی طرح پر سوچنا پڑے گا - آج کل نہایت سرعت کے ساتھ تمام صوبوں میں یہ پالیسی مروج ہوتی جاتی ہے کہ روزگار کے معاملے میں پنجاب پنجابیوں کے لیے ہے ' بنگال بنگالیوں کے لیے ' بمبئی بمبئی والوں کے لیے اور علیٰ ہذا القیاس - ایک حد تک یہ نقطۂ نظر صحیح اور جائز ہے اور ہر صوبے کو حق ہے کہ وہ اپنے باشندوں کو اپنے یہاں کی ملازمتوں اور پیشوں کے لیے ترجیح دے لیکن اندیشہ

یہ ہے (بلکہ یہ بات اندیشہ کی حد سے آگے بڑھ چکی ہے اور واقعہ بن گئی ہے) کہ مختلف صوبے ریوڑی بانٹنے والے اندھے کی طرح اس پالیسی پر اس قدر سختی کے ساتھ عامل ہوں کہ اس سے ملک کے بہترین تعلیمی مفاد اور ترقی کو نقصان پہنچے - بعض کام اور پیشے ایسے ہیں جن میں معمولی قابلیت ذہانت اور تعلیم کی ضرورت ہے یا جن میں کوئی خاص فنی مہارت درکار نہیں ہوتی - ان کے لیے تقریباً تمام امیدوار صوبے کے اندر سے حاصل ہو سکتے ہیں - لیکن ان پیشوں اور نوکریوں میں جن کے لیے مخصوص قابلیت اور تربیت کی ضرورت ہے یا جن میں شخصیت کا عنصر سب سے زیادہ اہم ہے حلقۂ انتخاب کو محدود کر دینا اور تنگ نظری اور صوبجاتی تعصب سے کام لینا سراسر حماقت اور نادانی ہوگی - ظاہر ہے کہ وہاں انتخاب کا صحیح معیار سکونت نہیں بلکہ قابلیت ہے - بہترین امیدوار جہاں سے ملیں بلا کر مقرر کرنا چاہیے - اس کے مصداق سول سروس سے زیادہ تعلیم کے عہدے ' علمی تحقیق و تفتیش کے کام ' صنعت و حرفت کے ماہروں کی جگہیں ' غرض وہ تمام خدمات ہیں جن کے لیے موجد ' مخترع ' محقق اور غیر معمولی طور پر ذہین لوگ درکار ہیں -

ہم نے پیشوں کے متعلق جس قسم کے عام معائنے کی ضرورت بتائی ہے وہ یورپ اور امریکا کے بعض ممالک میں بارہا کیا جا چکا ہے اور روز بہ روز زیادہ احتیاط کے ساتھ کیا جاتا ہے - وہاں ایسے ادارے قائم ہیں جن میں ماہرین نفسیات ' ارباب صنعت و تجارت اور سرکاری محکموں کی مدد سے طلبہ کو ان کے مستقبل کے متعلق مفید مشورہ دیتے ہیں - اس کا نتیجہ

نہ صرف طلبہ کے لیے اچھا ہے کہ وہ بے روزگاری اور پریشانی سے محفوظ رہتے ہیں اور غیر موزوں کاموں میں اپنی صلاحیت اور زندگی کو برباد نہیں ہونے دیتے، بلکہ ملک کے لیے بحیثیت مجموعی یہ بات بہت اطمینان بخش ہے کہ اس کے افراد کی قوتیں صحیح مصرف میں لائی جائیں اور انہیں تخریبی مشاغل میں پڑنے سے بچا لیا جائے - کسی ملک میں بےروزگاری کا بڑھ جانا مرض کی علامت ہے اور اس کے تدارک کے لیے مناسب وسائل اختیار کرنا حکومت اور جمہور دونوں کا فرض ہے - حال ہی میں جرمنی نے استادوں کی تعلیم کا جو جدید نظام رائج کیا ہے اس کا ایک جزو لازم یہ ہے کہ ہر علاقے کا ٹریننگ کالج مقامی حکام کی مدد سے یہ اندازہ کرے کہ مثلاً آئندہ پانچ سال میں کتنے نئے معلموں کی ضرورت ہوگی - کالج میں ہر سال طلبہ کو اسی اندازے سے داخل کیا جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معلموں کی تعداد ضرورت سے بہت بڑھ جائے اور محکمۂ تعلیم میں ان کے لیے گنجائش نہ نکل سکے - حال ہی میں ہندوستان کے ایک صوبے میں ٹریننگ کالج کو اپنی معمولی تعداد دفعتاً نصف کر دینی پڑی کیونکہ ٹریننگ کے بعد معلموں کے لیے مدرسوں میں اسامیاں نہیں نکلتی تھیں - لیکن فوری حالات میں بالکل مجبور ہوکر یہ طرز عمل اختیار کرنا اور بات ہے اور دور اندیشی کے ساتھ مستقبل پر نظر ڈال کر ایک مناسب شاہ راہ عمل اختیار کرنا دوسری بات ہے - ہندوستان میں آج کل تعلیم یافتہ طبقے میں بےروزگاری اور بےکاری کا مسئلہ روز بروز زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے - اس کی اصلاح کے لیے ہر صوبے میں وسائل معاش اور پیشوں کے امکانات

کا ایک باقاعدہ جدول تیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے مطالبات اور مواقع کے مطابق لوگوں کو مختلف راستوں پر لگایا جائے - اس میں یقیناً ایک حد تک انفرادی آزادی کی روک ضرور ہے لیکن یہ روک افراد اور معاشرے دونوں کے فائدے کے لیے ہے اور موجودہ زمانے میں ہر متمدن حکومت ایک حد تک افراد کی آزادی کو روکتی ہے تاکہ اجتماعی زندگی کے نظام میں فرق نہ آئے - اس کی وجہ سے افراد کا باہمی بےقید مقابلہ بھی کم ہو جائے گا جو ممکن ہے انتخاب طبیعی کے ناسمجھ حامیوں کو برا معلوم ہو لیکن ہر تمدنی نظام کا کام انتخاب طبیعی کے سخت‌گیر اور نقصان‌دہ اصول کی ترمیم کرنا ہے - لہذا ان کا اعتراض قابل توجہ نہیں - ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کیوں ملک کی تمام یونیورسٹیاں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں وکلا پیدا کر رہی ہیں جب ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس پیشے میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ لوگ بھرے ہوئے ہیں اور تعداد کی یہ روزافزوں اور غیرمناسب زیادتی نہ صرف اس پیشے کے اراکین کے لیے مضر ہے بلکہ ان کی اندرونی زندگی اور باہمی مسابقت پر ایسا اثر ڈالتی ہے جو اخلاقاً اور عقلاً ہر طرح قابل اعتراض ہے - اس بدنظمی کا ایک ادنیٰ سا نتیجہ ہے کہ آئے دن کئی کئی سال کا تجربہ رکھنے والے وکلا ناکامی سے عاجز آکر معلمی اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور معلم جو اپنے پیشے میں زیادہ توقعات نہیں پاتے وکالت کا امتحان پاس کر کے اس اُمید موہوم پر عدالتوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں کہ شائد وہ وہاں کامیاب ہو سکیں - ایسی ہی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی

ہیں لیکن ان سب کا ماحصل یہی ہے کہ ملک کی معاشی تنظیم نہایت ابتر ہے - یہ ابتری نہ صرف بےانتہا اقتصادی نقصان اور عام افلاس کا باعث ہے بلکہ اس کی وجہ سے بےشمار افراد مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم ہوگئے ہیں - ہمارے نظام تعلیم کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں سب سے اہم غالباً یہی مسئلہ ہے کہ یہ تنظیم کس طرح درست کی جائے تاکہ پیشہ شخصیت کی تربیت میں سد راہ ہونے کے بجائے اس میں معین ہو -

باب پنجم

حکومت اور تعلیم

ہم اب تک کئی تمدنی اداروں سے بحث کر چکے ہیں جو بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم اور ان کی زندگی کی تشکیل پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالتے ہیں اور جن کی وجہ سے بہت سے اہم تعلیمی مسائل پیدا ہوتے ہیں - اب ہم ایک ایسے منظم ادارے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان سے زیادہ وسیع ہے اور جس میں یہ مقابلتاً چھوٹی جماعتیں شامل ہیں ' یعنی کسی ملک کی حکومت کا نظام جس کے ذریعے سے کوئی قوم یا جماعت اپنی عمرانی زندگی کی تنظیم کرتی ہے اور افراد کے لیے مشترک اور متمدن زندگی بسر کرنے کے اسباب اور وسائل مہیا کرتی ہے - ہمیں یہاں حکومت کے عام مقاصد اور اغراض سے بحث نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ تعلیم کی اشاعت اور رہنمائی کے ضمن میں حکومت پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور حکومت اس میں کس طرح اور کس حد تک دخل دے سکتی ہے - اس زمانے میں جب حکومت کا اثر اور مداخلت بڑھتی جاتی ہے اس کے اور تعلیم کے باہمی تعلقات

کو سمجھنا اور ان کی مداخلت کے حدود معین کرنا نہایت ضروری ہے -

حکومت افراد کی زندگی میں کیوں دخل دیتی ہے؟ اس کو انفرادی آزادی میں حائل ہونے کا کیا حق ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حکومت کے قیام کی غرض یہی ہے کہ وہ افراد کی کوشش کو مجتمع اور منظم کرکے ان کے مقاصد کے حصول میں امداد دے جو ان سب میں مشترک ہیں - افراد کا دائرۂ عمل جدا جدا رہے تو وہ بہت سے بڑے بڑے کام مثلاً ذرائع آمد و رفت، وسائل معاش کی فراہمی وغیرہ کے انجام دینے سے قاصر رہیں گے - لہذا اس قسم کے کاموں کو حکومت خود اپنے ہاتھ میں لیتی ہے یا ان کے انجام دینے میں امداد کرتی ہے - اس کے علاوہ جب افراد میں یا جماعتوں میں باہم اشتراک عمل یا مسابقت ہو تو ان کے اغراض و مقاصد میں اکثر اختلاف پیدا ہوتا ہے اور ان میں انصاف کرنے اور سمجھوتا کرانے کے لیے کسی ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو ان سب پر حاوی ہو اور قوی کو محض قوت کی وجہ سے کمزور پر غالب نہ آنے دے - اسی لیے حکومت افراد کے معاملات اور کار و بار میں دخل دیتی ہے اور ان کو باقاعدگی اور انتظام کے ساتھ چلانے کے لیے قوانین بناتی ہے، سزائیں معین کرتی ہے، افسر اور حکام مقرر کرتی ہے جو قانون کی پابندی کراتے ہیں اور امن قائم رکھتے ہیں - غرض اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ افراد اور جماعتوں کی زندگی کا ایسا نظام بن جائے جس کے ماتحت وہ اطمینان کے ساتھ اپنے جائز مشاغل میں مصروف رہیں اور ان کی جائز انفرادی جد و

جہد میں دقتیں اور مجبوریاں حائل نہ ہوں - مگر شرط یہ ہے کہ حکومت کا یہ دخل انہیں مشاغل اور کار و بار تک محدود رہے جو ہماری مشترکہ زندگی پر اثر ڈالتے ہیں اور اس میں معین یا سد راہ ہیں - وہ افعال جو ہمارے ذاتی افعال ہیں ' جن کا تعلق اور اثر ہماری ذات تک محدود ہے ان سے عموماً حکومت کو براہ راست نہ کوئی واسطہ ہوتا ہے نہ ہونا چاہیے - ہمارے خیالات اور جذبات ' ہمارا مذہب اور عقیدہ ہماری اپنی چیز ہیں - ان میں حکومت کا کوئی حصہ نہیں اور جب تک ہم ان کے اظہار میں یا ان پر عمل کرنے میں دوسروں کے ساتھ بےجا تعرض نہ کریں حکومت ان میں کسی طرح دخل نہیں دے سکتی - اگر حکومت اس شعبۂ زندگی میں بھی دست‌اندازی شروع کر دے گی تو افراد کی جائز آزادی سلب ہو جائے گی اور حکومت کی مداخلت صحیح حد سے ' جو صرف اس قدر ہے کہ افراد اور جماعتوں کی ترقی میں جو رکاوٹیں حائل ہوں انہیں دور کرے ' تجاوز کر جائے گی - پروفیسر اسمتھ (Smith) اپنی کتاب "Nation's Schools" (قوم کے مدرسے) میں لکھتے ہیں -

" حکومت کی مداخلت کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ ہماری آزادی میں اضافہ ہو نہ یہ کہ اس میں اور کمی ہو جائے - اس کی بدولت ہمیں (اپنے کاروبار کے لیے) ایک ایسا ماحول ملنا چاہیے جس میں بےکھٹکے ' بےتکلف رہنا سہنا چلنا پھرنا ممکن ہو - مثلاً ایک منظم حکومت میں تمام افراد کو سیاسی آزادی حاصل ہوتی ہے - علاوہ بریں چونکہ حکومت کے تمام افعال کا مقصد یہ ہے کہ

ملک کے باشندوں کی اخلاقی قدر میں اضافہ ہو ' اس کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ خود ایسے کام انجام دے کر ' جو افراد اس کے برابر یا اس سے بہتر انجام دے سکتے ہیں ' ان کی قوتوں کو معطل کر دے - حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کی ذاتی کوششوں کے لیے مناسب مواقع فراہم کرے نہ یہ کہ ان کے بجاے کام کرے یا ان کی کارکردگی اور حوصلے کو پست کردے'' ۱ -
یہ اصول حکومت کی مداخلت کی جائز حدود کا تعین کرتا ہے لیکن تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ دراصل حکومتوں نے کبھی خود کو ان حدود کے اندر نہیں رکھا بلکہ ہمیشہ اپنے امکان بھر یہ کوشش کی ہے کہ افراد کے افعال اور خیالات دونوں کو اپنے قابو میں رکھیں - چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف قوانین حکومت کا استعمال کیا بلکہ تعلیم پر حاوی ہو کر اس کے ذریعے لوگوں کے خیالات کو خاص سانچوں میں ڈھالنا چاہا - اس کی بہت سی مثالیں قدیم زمانے سے لے کر آج تک تاریخ میں مل سکتی ہیں - سپارٹا (Sparta) کی تعلیم کا نصب‌العین علانیہ طور پر یہ تھا کہ ایسے شہری پیدا کئے جائیں جو اپنی جسمانی طاقت اور تربیت کی بدولت ملک کے لیے مفید ثابت ہوں اور اس کی سیاسی حکومت کو مستحکم کریں - اسی وجہ سے اسپارٹا میں بچپن ہی سے لڑکوں کی تربیت خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی تھی اور اس میں والدین کا حصہ محض براے نام

---

۱ Nation's Schools— صفحہ -

ہوتا تھا - اس طرح قرون وسطیٰ میں جب یورپ میں تعلیم کا نظام ملکی حکومتوں کے ماتحت نہ تھا بلکہ عیسائی کلیسا، جو اس زمانے میں صرف مذہبی قوت کا مرکز ہی نہ تھا بلکہ بہت زبردست سیاسی اقتدار بھی رکھتا تھا، اکثر ملکوں کے تعلیمی نظام پر حاوی تھا، اس کی بھی یہی کوشش تھی کہ اپنے خاص مقاصد تعلیم کے ذریعے حاصل کرے - اس کی سب سے زیادہ موثر اور کامیاب مثال یسوعیوں (Jesuits) کا نظام تعلیم ہے جس نے ایک زمانے میں تقریباً تمام یورپ میں اپنا سکہ بٹھا دیا تھا اور ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کی سرکردگی حاصل کر لی تھی - اس کے بعد رفتہ رفتہ اس فرقے کا مذہبی اقتدار کم ہوگیا اور تعلیم بھی بڑی حد تک ان کے قبضے سے نکل گئی - اس زمانے میں مختلف اسباب ایسے جمع ہوگئے جن کی وجہ سے جماعتوں اور افراد کی متفرق تعلیمی کوشش قومی مقاصد کے لیے ناکافی ثابت ہوئی اور اس نظام تعلیم کی بنیاد پڑی جس کو اب ہم تقریباً تمام متمدن ممالک میں رائج پاتے ہیں - یعنی تعلیم کا انتظام حکومتوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا - لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حکومت کا یہ فعل خود مطلبی سے خالی نہ تھا - خصوصاً ابتدا میں اکثر ملکوں کے مطلق العنان بادشاہوں نے مدرسے اسی غرض سے قائم کیے تھے کہ اپنی رعایا کے خیالات کو اپنی رائے اور مقاصد کے مطابق ڈھالیں - نپولین نے اس خیال کو صاف صاف ظاہر کر دیا تھا :—

"اس نظام تعلیم قائم کرنے سے میری سب سے بڑی غرض یہی ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک ایسا ذریعہ ہو جس سے

سیاسی اور اخلاقی معاملات میں میں لوگوں کی رائے پر
اثر ڈال سکوں "

اس تحریک پر جرمن فلسفہ اور خیالات کا خاص طور پر اثر پڑا اور تعلیم ایک ملکی مسئلہ تسلیم کر لی گئی - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اس صورت حال سے اپنی کتاب میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس کی تاریخی وجوہ کیا تھیں - جرمنی کو نپولین کے ہاتھوں شکست ہو چکی تھی - اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اپنی سیاسی قوت دوبارہ حاصل کرنے اور اپنی بگڑی حالت کو سدھارنے کے لیے تعلیم کو آلۂ کار بنائے اور مدرسوں کا ایک وسیع اور منظم سلسلہ قائم کرے - چنانچہ اس سیاسی صورت حال کا اثر نہ صرف تعلیم کے عملی نظام پر پڑا بلکہ تعلیم کا فلسفہ اور مقاصد بھی اس سے متاثر ہوئے - " جب ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک سارے نظام تعلیم کا مقصد یہی ٹھہرا کہ وطن دوست شہری اور سپاہی اور حکام اور افسر تیار کیے جائیں اور ملک کی فوجی صنعتی اور سیاسی تحفظ اور استحکام کا اہتمام ہو تو لازماً نظریۂ تعلیم میں بھی " اجتماعی افادے " (Social Efficiency) کے اصول کو اہمیت دی گئی " ۱ -

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ " اجتماعی افادے " کو بہت تنگ اور محدود معنی پہنائے گئے اس سے مراد " انسانی " فرائض کی ادائگی نہ تھی بلکہ ان خاص فرائض کی ادائگی جو ایک انسان پر مثلاً بحیثیت ایک جرمن یا

---

۱ - جمہوریت اور تعلیم صفحہ ۱۰۹ -

فرانسیسی یا انگریز شہری کے عادی ہوتے ہیں - تعلیم کا مفہوم بجائے نوجوانوں کی شخصیت اور انفرادی قوتوں کی آزاد نشو و نما میں مدد دینے کے یہ قرار پایا کہ وہ بنے بنائے سانچوں میں ڈھالے جائیں خواہ ان کی نوعیت شخصیت ارباب سیاست کے پسند کیے ہوئے سانچوں میں سمائے یا نہ سمائے - یہی طریقہ جمہوری حکومتوں نے اختیار کیا ' جو شخصی حکومتوں کے بعد قائم ہوئیں اور اب جن ملکوں میں جمہوری حکومتیں ہیں ان کی بھی یہی کوشش ہے کہ ہر نئی نسل کو ان خیالات اور روایات کے مطابق تربیت دیں جن پر جمہوری حکومت کا قیام ہے - اس کی ایک عمدہ مثال ممالک متحدہ امریکا کی ہے جہاں حکومت نے تمام باشندوں کے لیے عام اس سے کہ ان کا تعلق کسی مذہب یا طبقے سے ہو ' ایک ہی نظام مدارس قائم کر دیا ہے تاکہ امیر اور غریب ' عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کو دودھ بدودھ تعلیم دے کر تمام لوگوں میں ایک مخصوص جمہوری ذہنیت پیدا کی جائے - یہاں ہمیں اس امر سے بحث نہیں کہ انہیں اس کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اور یہ نظام تعلیم کہاں تک تعصب اور دوسرے نقائص سے پاک ہے - ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ جمہوری حکومت کو بھی اپنے شہریوں کی تعلیم سے کم از کم اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کسی اور نظام حکومت کو - بلکہ ایک وجہ سے ' بہت زیادہ دلچسپی ہے کیونکہ یہاں ملک کے کار و بار اور فلاح کی ذمہ‌داری خود جمہور پر ہے - اگر ان میں معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی کمی ہوگی تو تمام کام درہم برہم ہو جائیں گے - پس فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے زمانے میں بادشاہ بالعموم

اپنے ذاتی یا خاندانی مفاد کی خاطر تعلیم میں دلچسپی لیتے ہے اور اب جمہوری حکومت ان مقاصد کی خاطر تعلیم کی رہنمائی کرتی ہے جنھیں وہ اپنے خیال میں عام رعایا کے لیے مفید اور عمدہ سمجھتی ہے اور جن کے بغیر اس کی بنیادیں مستحکم نہیں ہو سکتیں - مگر بہر حال مدرسہ پروپگینڈا کا ایک ذریعہ پہلے بھی سمجھا جاتا تھا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے - موجودہ زمانے میں اس کی نہایت واضح مثال روس جدید کا نظام تعلیم ہے جس کے بنیادی اور صریحی اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ مدرسوں کے ذریعے سویٹ کے خیالات اور عقائد کی اشاعت کی جائے - پروفیسر پنکےوچ (Pinkevitch) جو موسکو یونیورسٹی کے صدر اور روس کے جدید تعلیمی ماہرین میں سے ہیں مدرسے کے فرائض سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں [۱] -

> " مزدور بچوں کے مدرسۂ جدید کی ایک اور خصوصیت امتیازی ' اس کا مقصد یہ ہے کہ آنے والے انقلاب کے لیے جنگجو شہریوں کی ایک جماعت تیار کرے اور نئے معاشرے کی تعمیر کے لیے معماروں کی ' قابل منتظموں ' اور انقلاب پسندوں کی تربیت کرے " -

دوسری جگہ وہ اسی ضمن میں لکھتے ہیں :—

> " تعلیم عامہ سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کا کام یہ ہوگا کہ وہ نوخیز نسلوں میں اشتمالی (Communist) خیالات

۱— New Education in Soviet Republic (ریاست سوویٹ میں تعلیم جدید) صفحہ ۱۵۲ -

پھیلائیں اور اس طرح ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ کریں جو اشتمالی حکومت کے قیام کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں یعنی مقصد یہ ہے کہ پرولتاری (Proletarian) فلسفہ کا بیج نوجوانوں کے دل و دماغ میں بویا جائے...... اس کا ایک ذریعہ یہ ہوگا کہ نظام تعلیم کی رہنمائی ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اشتمالی اور اشتراکی ہیں اور مزدوروں کے انقلاب سے ہمدردی رکھتے ہیں - دوسرے یہ کہ اخباروں اور بچوں کی کتابوں کے ذریعے اشتمالی خیالات کی اشاعت کی جائے اور تیسرے تعلیم عامہ کی تمام درسگاہوں کی تنظیم اسی اصول پر کی جائے "[1] -

اسی معاملے میں روسی پالیسی اور دوسرے ملکوں کی پالیسی میں یہ فرق ہے کہ روس میں علی الاعلان یہ مقصد تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں میں اس پر عمل کیا جاتا ہے لیکن یہ نظریہ ، تعلیم میں صراحت کے ساتھ داخل نہیں کیا گیا -

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے ہے کہ زمانۂ قدیم میں حکومت نے تعلیم کے نظام کو اس طرح اپنے مقاصد کا تابع نہیں بنایا جس طرح اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے - ہندوؤں اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں تعلیم سے زیادہ تر اہل علم کو سروکار تھا جو کبھی بغیر کسی خاص مالی امداد کے اور کبھی اہل ثروت کی سرپرستی میں مدرسے چلاتے تھے - بادشاہ اور رؤسا اکثر تعلیم گاہوں اور عالموں

۱- صفحہ ۱۵۱ -

کی سرپرستی کرتے تھے شاہی عطیوں سے ان کی امداد کرتے تھے - بعض اوقات ان لوگوں کو با قاعدہ سالانہ وظائف بھی ملتے تھے لیکن حکومت نہ نظام تعلیم قائم کرنے کی ذمہ دار تھی نہ اس کے تمام مصارف کی کفیل - مختلف علوم کے عالم اور ماہر اپنی اپنی جگہ پر اپنے خاص فن میں درس دیتے تھے - ان کا حلقۂ درس اعلیٰ تعلیم گاہ کا کام دیتا تھا، جہاں علم کے پیاسے دور اور نزدیک سے آکر جمع ہوتے تھے اور ان کے آگے زانوے ادب تہ کرکے اپنی پیاس بجھاتے تھے - ان درسگاہوں اور یورپ کی قرون وسطیٰ کی یونیورسٹیوں میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے کہ وہاں بھی شائقین علم ملک ملک پھرا کرتے اور جہاں کہیں کوئی جید عالم ہوتا اس کے درس سے مستفید ہوتے - یہاں تمام لوگوں کے لیے تعلیم کا انتظام نہ تھا لیکن مفلسی تعلیم کی راہ میں زیادہ حارج نہ ہوتی تھی اور سچا شوق رکھنے والوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھلے رہتے تھے - مذہبی جماعت کو مدارس پر اقتدار ضرور حاصل تھا کیونکہ اکثر علوم میں وہی لوگ اُستادی کا درجہ رکھتے تھے جنھیں علوم دین میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی - لیکن چونکہ ان بزرگوں کو سیاست اور حکومت سے کوئی گہرا اور بلا واسطہ تعلق نہ تھا اس لیے حکومت تعلیم کی آزادی میں سد راہ نہ تھی -

انگریزی عہد حکومت میں تعلیم اور حکومت کے درمیان ایک نیا اور مضبوط رشتہ قائم ہوگیا ہے اور کمپنی کے عہد کی ابتدا سے اب تک کم و بیش واضح طور پر حکومت کی یہی کوشش رہی ہے کہ تعلیمی مدارس کے ذریعے طلبہ کو اپنے مقاصد

کے لیے تیار کرے - اس زمانے سے قطع نظر کرلیجیے جب
عیسائی مشنریوں کی تعلیمی کوششیں "کفر اور جہالت میں
بھٹکے ہوئے دیسیوں کو راہ ھدایت دکھانے" کے لیے وقف تھیں -
ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں جو مراسلات اور
تعلیمی ریکارڈ ملتے ھیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ھے کہ
انگریزی تعلیم کا نفاذ اس غرض سے کیا گیا تھا کہ کمپنی کے
روز افزوں کاروبار کو چلانے کے لیے معرر اور چھوٹے درجے کے افسر
تیار کیے جائیں تاکہ ذرا ذرا سے کام کے لیے کمپنی کو انگلستان
سے لوگ نہ لانے پڑیں جو بیش قرار تنخواھوں کے طالب ہوتے
تھے - پھر یہ مصلحت بھی تھی کہ کچھ ایسے لوگ کمپنی کے
پاس رھیں جو تجارت اور ملک‌داری دونوں کے معاملات میں
ان کے اور ھندوستانیوں کے درمیان واسطے کا کام دیں - اس کے
ساتھ ھی لارڈ میکالے (اور بعض اور نیک نیت لوگوں) کو یہ فکر
بھی تھی کہ اس وسیع بر اعظم کے لاتعداد باشندوں کو اس
جہالت سے نکالا جائے جس کی تاریکی میں یہ بچارے' ان
بزرگ کے نزدیک شہد اور مکھن کے سمندر میں غوطے کھا رھے
تھے! اس وقت سے اب تک اگرچہ تعلیمی نقطۂ نظر میں
بہت کچھ تبدیلی ھو چکی ھے اور سرکاری بیانات' مراسلوں
اور تحریروں میں دوسرے اور بہتر مقاصد کی جھلک بھی نظر
آتی ھے لیکن عمل کے لحاظ سے تعلیم بحیثیت مجموعی
اب بھی متوسط طبقوں کو نوشت و خواند سکھانے اور ان کو
سرکاری نوکریوں کے واسطے تیار کرنے تک محدود ھے - علاوہ اس
کے سرکاری اور نیم سرکاری دونوں قسم کے مدارس کی تعلیم اور
پالیسی حکومت کی دست‌نگر ھے کیونکہ حکومت ھی بڑی

ف کی ذمہ‌دار ہے - انگریزی مثل ہے " جو
وہی راگ کی لے بتائے " اگر ملک میں
ی جائیں جن کے مقاصد اور پالیسی
بالکل یا بہت کچھ مختلف ہو تو ان کا
بہت مشکل ہے - کیونکہ وہ نہ صرف
داد اور ملک کے اہل ثروت کی سرپرستی
ہ ان کے فارغ التحصیل طلبہ کو ' جن
مہر نہ ہوگی ' وسائل معاش تلاش کرنے
ں آئیں گی - یہی دقت ان " قومی
آ رہی ہے جو گذشتہ پندرہ بیس سال
ں ہیں -

، تبصرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از
یہ ناممکن ہے کہ کوئی حکومت تعلیم
، نہ کرے یعنی اس کی پالیسی اور
کی کوشش نہ کرے - لیکن اس ناگزیر
ہ سے یہ اور بھی ضروری ہے کہ ہم اس
د کا تعین کریں - ایک حد تک ہر
حفاظت کے لیے اس دست‌اندازی کی
لیکن حکومت کا اقتدار اور غلبہ جتنا
س نسبت سے اندیشہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے
ہو جائیں گے - اگر حکومت بہترین قومی
صفات کا مجسمہ ہوتی تو اس کی مداخلت
، ضروری ہوتی - لیکن یہ محض ایک
ں کا وجود کہیں نہیں - دراصل حکومت

ہمیشہ ان مختلف جماعتوں اور ہمغرض طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے جو کسی خاص وقت میں ملک پر حاوی ہوتے ہیں - یعنی جو جماعت یا طبقہ برسر حکومت ہوتا ہے وہ لازمی طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں اپنے خیالات اور مقاصد کی اشاعت کرے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئی نسلوں کے خیالات اور دماغوں پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش میں تعلیم کے اولین اور اعلیٰ ترین مقاصد نظر انداز ہو جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ مدرسہ بچوں کے قوائے ذہنی کی تربیت کرے اور ان کو " صحیح انسانی " زندگی کے قابل بنائے استادوں اور شاگردوں کی محنت اور توجہ دور از کار چیزوں میں صرف ہوتی ہے - تعلیم کا ایک مقصد جیسا کہ ہم پہلے باب میں بتا چکے ہیں ' یہ ہے کہ وہ خود بچوں میں تعلیم اور نشو و نما کو جاری رکھنے کی صلاحیت پیدا کرے یعنی اس کے پیش نظر فرد کی صحیح اور مکمل ارتقا رہتی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تعلیم کا عمل آزاد ہو لیکن حکومت کی دست‌اندازی کی وجہ سے آزادی کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے ' تعلیم خارجی مقاصد کی مطیع ہو جاتی ہے ' اور موضوع تعلیم بجائے ایک آزاد اور ارتقا پذیر ہستی کے ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے جو دوسروں کے ارادے سے چلتی ہے -

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کو تعلیم کے میدان میں کس حد تک اور کن کن امور میں دخل دینا چاہیے ؟ جہاں تک تعلیم کی غایت کا تعلق ہے ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ حکومت کو اس پر کوئی دسترس نہیں

ہونی چاہیے کیونکہ اس کا انحصار دو ایسے امور پر ہے جو حکومت کے اثر سے بالکل باہر ہیں - ایک طرف تو قومی روایات، قومی سیرت اور قومی ضروریات اور دوسری طرف خود متعلم کی نفسی زندگی، اس کی طبیعت، اس کی نشو و نما کے قوانین - انہیں دونوں کے باہمی تعامل اور اثر سے تعلیم کے مقاصد کا تعین ہوتا ہے - اگر حکومت ایک منظم اور بااختیار جماعت ہونے کی حیثیت سے تعلیم کے مقاصد کو جزوی و کلی طریقے پر معین کرے گی تو اس سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ خالص تعلیمی مقاصد سیاسی اور خارجی مقاصد کے لیے قربان کر دینے پڑیں گے - عملاً اس خرابی کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ ملک کے تمام مختلف مدارس جن کے ماحول اور روایات اور ضروریات مختلف ہیں حکومت کے مقرر کئے ہوئے یکساں مقاصد کے حصول میں کوشاں ہوتے ہیں اور ان میں آزادانہ نشو و نما کی فضا پیدا نہیں ہوتی - اسی طرح مدرسے کے اندرونی معاملات یعنی طریقۂ تعلیم اور نظم و نسق میں استادوں اور تعلیمی جماعتوں کو آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق کام کریں اور نئے تجربوں کے ذریعے تعلیمی ترقی اور اصلاح ہوتی رہے - جب کبھی مدرسے کے تعلیمی معاملات میں حکومت کی دلچسپی، مشورے، ہمت‌افزائی، عام نگرانی اور انفرادی کوششوں کی تنظیم کی حد سے آگے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم بےجان اور بےروح ہو کر رہ جاتی ہے - اس کی ایک جدید مثال یہ ہے کہ انگلستان میں جس قدر تعلیمی ترقی گزشتہ عرصے میں ہوئی وہ سب اس وقت سے

جب حکومت کے تعلیمی محکموں اور افسروں نے مدرسوں پر سے اپنی آهنی گرفت ڈھیلی کر دی - اس وقت مدرسوں کو ایک گونه آزادی نصیب هوئی که خود اپنی تعلیم اور زندگی کی تعمیر کریں اور " بورڈ آف ایجوکیشن " کی حیثیت محض ایک مشورتی ادارے کی قرار پائی - همارا مطالبه یه نهیں هے که حکومت ' جو قومی زندگی کا سب سے منتظم اور زبردست اداره هے ' نظام تعلیم سے بالکل سبکدوش هو جائے - رفتار زمانه کا تقاضا تو اس سے بالکل مختلف هے یعنی یه که حکومت ان تمام تعمیری کاموں میں پہلے سے زیاده حصه لے جو ملک کی بہبودی کے لیے ضروری هیں - لیکن جہاں تک تعلیم کے میدان کا تعلق هے همارا عقیده یه هے که اس مداخلت کی نوعیت بہت مختلف هونی چاهیے اور حکومت کے لیے لازم هے که اسے معقول اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے چند مخصوص فرائض انجام دے -

حکومت کا پہلا فرض یه هے که وه تعلیم کے لیے هر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائے اور وه تمام انتظامات کرے جو ایک وسیع نظام تعلیم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری هیں - ایک نہایت ضروری کام مدرسوں کے لیے موزوں عمارتیں اور وه سامان مہیا کرنا هے جس کے ذریعے بچوں کی تعلیم موثر اور خوشگوار بنائی جا سکے - گزشته سو سال میں اس لحاظ سے اکثر متمدن ممالک میں نہایت زبردست ترقی هوئی هے کیونکه حکومت اور ماهرین تعلیم دونوں نے اس کوشش میں شرکت کی هے که مدرسے کو ایک ایسا ماحول بنائیں جہاں بچے خود به خود خوشی سے کام کریں ' کھیلیں '

مختلف مشاغل میں شریک ہوں اور اس طرح ان کی جسمانی اور دماغی نشو و نما آزادی کے ساتھ ہوسکے - مدرسے کے ماحول کی تشکیل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے لیے طرح طرح کے اہتمام کی ضرورت ہے - اس کا ایک جزو طبیعی ماحول کی درستی ہے "مدارس عمل" (Activity Schools) قائم کرنے کی جو تحریک گزشتہ چند سال میں یورپ اور امریکہ کے بعض ملکوں میں جڑ پکڑ چکی ہے اِس کا ایک نمایاں عنصر ان مدرسوں کا طبیعی ماحول ہے - ڈاکٹر فیریر (Ferriere) نے جو سوئٹسٹان اور وسطی یورپ میں اس تحریک کے قائدین اعظم میں سے ہیں اپنی کتاب "L'Ecole Active" (مدرسۂ عمل) میں پورا ایک باب اس بحث کی نذر کیا ہے کہ مدارس جدید کا طبیعی ماحول کیسا ہونا چاہیے - اسی طرح بلجیم کے ایک مشہور ماہر تعلیم واس کونسلو (Vasconcellos) جنھوں نے جنگ یورپ سے چند سال پیشتر ایک تجربی مدرسہ قائم کیا تھا اپنی کتاب ۱ میں اسی مدرسے کا حال لکھتے ہوئے نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ مدرسے کی عمارت ' ساز و سامان آلات تعلیم اور گرد و پیش کی فضا بچوں کے جسم اور سیرت کی نشو و نما پر کیا اثر ڈالتی ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی چھوٹی سی کتاب "مدرسہ اور معاشرہ" (School and Society) میں ایک واقعہ

---

۱ — Une Ecole Nouvelle in Belge جس کا ترجمہ انگریزی میں "A New School in Belgium" کے نام سے شائع ہوا ہے -

بیان کیا ھے جس سے اسکول کے فرنیچر کی اھمیت معلوم ھوتی ھے - بہت سال گزرے ایک معلم نے نیویارک کی تمام بڑی بڑی دوکانوں کا گشت لگایا جہاں اسکول کا فرنیچر فروخت ھوتا تھا - اور ایک خاص قسم کے ڈسکوں اور کرسیوں کی تلاش کی لیکن کامیابی نہ ھوئی - ایک دکاندار نے جو دوسروں سے زیادہ سمجھدار تھا معلم موصوف کا مطلب سمجھ کر جواب دیا - " اچھا آپ کو ایسے ڈسکوں کی تلاش ھے جس پر طلبہ کام کرسکیں لیکن ھم لوگ جو ڈسک بناتے ھیں وہ تو اس لیے ھوتے ھیں کہ طلبہ ان پر بیٹھ کر اُستاد کے لکچر سن سکیں " - اس قصے سے پروفیسر موصوف یہ نتیجہ نکالتے ھیں کہ کچھ عرصے پہلے مدرسوں میں اس کا امکان ھی نہیں تھا کہ طلبہ خود کوئی عملی کام کرسکیں بلکہ وہ اُستاد کی سزا کے خوف سے چپ چاپ اور بےحس و حرکت بیٹھ کر اس کے سبق کو سنتے تھے یا سوالات کا جواب دیتے تھے اور جب موقع ملتا تھا تو اس خلاف فطرت خاموشی کے بدلے میں بےتحاشا اودھم مچاتے تھے بہر حال اس وقت سے اب تک امریکا کے مدرسوں میں بہت کچھ تبدیلیاں ھوگئی ھیں اور ان کے فرنیچر تک میں اس قدر ترقی ھو گئی ھے کہ ایک ناواقف شخص کو، جو نئے تعلیمی خیالات سے آگاہ نہیں ھے، کسی جدید مدرسے کو دیکھ کر یہ پہچاننے میں بھی دقت ھوگی کہ یہ عمارت کسی تعلیمگاہ کی ھے یا بچوں کے کھیلنے، تفریح کرنے اور دستکاریاں سیکھنے کے لیے ھے - اس لحاظ سے ھمارا ملک بہت پیچھے ھے کیونکہ ھمارے مدرسے کیا بہ لحاظ عمارت کے اور کیا بہ لحاظ سامان کے بالعموم نہایت ابتر حالت میں ھیں - اس کی ایک وجہ

تو یقیناً ملک کا افلاس ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کی ذمہ‌داری پبلک اور محکمۂ تعلیم کی بےحسی پر بھی عائد ہوتی ہے کیونکہ ان کو یہ احساس ہی نہیں کہ بچوں کی نشو و نما میں ایک موزوں ماحول کو کس درجہ دخل ہے - ورنہ باوجود روپئے کی کمی کے بھی یہ ممکن ہے کہ شہری اور دیہاتی مدرسوں میں بہت کم خرچ سے ایسی چیزیں مہیا کی جائیں جو طلبہ کے لیے مفید اور آرام‌دہ ثابت ہوں - مگر بالعموم سوائے خال خال خوش‌قسمت مدرسوں کے، اور کہیں ہمیں سوائے ٹوٹے پھوٹے ڈسکوں، بنچوں اور چند نقشوں اور سیاہ تختوں کے کچھ بھی نہیں ملتا - پھر ہم کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ ایک ایسی عمارت میں بچے دلچسپی کے ساتھ ہر روز کئی گھنٹے گزار سکیں اور ان مدرسوں کے گرد ایسی روایات مجتمع ہو جائیں جن کو نوجوانوں کی نسلیں یکے بعد دیگرے عزیز رکھیں؟ وہاں ان کے مذاق کی اصلاح اور تربیت کیسے ہو سکتی ہے؟ تعلیم اصلاح کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ مدرس اور محکمۂ تعلیم دونوں اس جانب توجہ کریں اور مدرسوں کی مادی حالت کو بہتر بنائیں اور حکومت کا فرض ہے کہ اس کوشش میں ان کی مدد کرے -

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت کے فرائض میں قومی تعلیم کے مصارف کا مہیا کرنا بھی شامل ہے - گزشتہ دو صدیوں کے اندر اندر اکثر حکومتوں نے یہ ذمہ‌داری قبول کر لی ہے اور ان کے سالانہ بجٹ کا مطالعہ کرنے کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تعلیمی اخراجات سال بہ سال نہایت تیزی کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں کیونکہ انھوں نے محسوس کرلیا

ھے کہ تعلیم پر خرچ کرنا ایک ضروری مصرف ہونے کے علاوہ قومی کفایت کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ھے - اگر صحیح قسم کی تعلیم ملک میں رائج ہو تو اس بےشمار رقم میں بہت کفایت ہو سکتی ھے جو اس وقت مختلف قسم کے جیل خانوں' اسپتالوں' مجرموں کی بستیوں اور دیگر تعزیری انتظامات پر صرف ہوتی ھے - پہلی نظر میں یہ دعویٰ بہت مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ھے اور اس کی تردید میں ایسے اعداد و شمار پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ھے کہ بعض ملکوں میں تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ تعداد اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے جرائم بہت بڑھ گئے ہیں - لیکن اس اضافے کی ذمہداری ناقص اور نامکمل تعلیم پر ھے اور اس غفلت پر ھے جو تربیت کی طرف سے برتی جاتی ھے نہ کہ نفس تعلیم پر ! ڈاکٹر کرشن اشٹائنر (Kerschensteiner) نے جو جرمنی کے ایک نہایت زبردست تعلیمی مفکر اور منتظم تھے اور جن کا انتقال حال ہی میں ہوا ھے اپنی کتاب "Schools and the Nation" (مدرسے اور قوم) میں تعلیم کے اس اصلاحی اور کفایتی پہلو پر زور دیا ھے - ہندوستان میں بھی گزشتہ پچاس سال میں مقابلتاً تعلیمی بجٹ میں بہت اضافہ ہوا ھے لیکن ضروریات کے لحاظ سے موجودہ تعلیمی بجٹ بالکل ناکافی ھے اور ہندوستانیوں کو حکومت سے ایک عام شکایت یہ ھے کہ وہ فوجی مصارف میں ملک کے مداخل کا تقریباً نصف خرچ کر دیتی ھے اور تعلیم پر اس کا بہت تھوڑا حصہ صرف ہوتا ھے - مالی دقتوں کی وجہ سے حکومت نے اب تک نہ تعلیم کی توسیع کے لئے

کافی وسائل بہم پہنچائے ہیں نہ موجودہ تعلیم کی اصلاح، بہتری اور استحکام میں اسے کامیابی ہوئی ہے - اس ذمہ دار ہندوستانی حکومت کو جو جدید آئینی اصلاحات کے نافذ ہونے پر وجود میں آئے گی بہت جلد اس مسئلے سے سابقہ پڑے گا اور بجٹ بنانے کے تمام پرانے اصولوں کو بدلنے کے بعد اس میں تعلیمی مصارف کو وہ نمایاں حیثیت حاصل ہوگی جس کے وہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستحق ہیں - یہ سوال قومی زندگی اور فلاح کے لیے نہایت درجہ اہم ہے اور اگر ہمیں ترقی کی دوڑ میں معاصر اقوام سے پیچھے رہنا گوارا نہیں تو ہمیں بھی تعلیم کی اشاعت اور ترقی کے لیے اسی مستعدی اور یکجہتی کے ساتھ جد و جہد کرنی پڑے گی جس طرح مثلاً روس میں انقلاب کے بعد سے ہو رہی ہے - ہم اپنی موجودہ حالت کا مقابلہ تیس چالیس برس پہلے کی حالت سے نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس زمانے میں دوسرے ملک جن کے دوش بدوش ہمیں چلنا ہے، کیا کر رہے ہیں اور تعلیم پر کس قدر صرف کر رہے ہیں - لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حکومت کے تعلیمی مصارف میں محض یہی خرچ شامل نہیں کہ اعلیٰ اور ثانوی مدارس قائم کیے اور چلائے جائیں اور غیر سرکاری مدرسوں کو امداد دی جائے - تمام متمدن ممالک میں لازمی ابتدائی تعلیم کا اجرا ہو چکا ہے یا ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ یہ تعلیم مفت دی جائے تاکہ ملک کے تمام بچے اس سے مستفید ہو سکیں - اس خرچ کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے - مگر یہ ذمہ داری یہیں ختم نہیں ہو

جائے - ایک فرض‌شناس حکومت کا کام یہ بھی ہے کہ مالی امداد کے ذریعے سے جہاں تک ممکن ہو ان رکاوٹوں کو دور کرے جو غریب طلبہ کی راہ میں حائل ہیں تاکہ وہ اپنی تعلیم کے زمانے میں اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہ سکیں اور امیر و غریب کا فرق کم سے کم مدرسے میں ان کو حتی‌الامکان محسوس نہ ہو - اکثر متمدن حکومتوں نے اس ذمہ‌داری کو قبول کر لیا ہے اور اپنی اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق ایسے انتظامات کئے ہیں جن سے غریب طلبہ اور ان کے والدین کی مشکلات میں کمی ہو گئی ہے - چنانچہ یورپ اور امریکا کے بعض ملکوں میں جو تعلیمی قوانین حال میں نافذ ہوئے ہیں ان میں یہ امر بھی شامل ہے کہ حسب ضرورت حکومت طلبہ کو خوراک اور لباس کے مصارف میں امداد دے گی تاکہ ناقص یا ناکافی خوراک اور لباس کی وجہ سے ان کی صحت پر برا اثر نہ پڑے - اسی طرح محکمۂ حفظان صحت کا تعلق مدرسوں سے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ طلبہ کی نگہداشت کرے اور وقتاً فوقتاً طبی معائنہ کر کے بیماریوں کی روک تھام اور صحت کے قیام کے لیے مناسب تدابیر عمل میں لائے - بےروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار سے لگانے کے لیے بھی حکومت نے کوششیں کی ہیں اور جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں بعض ملکوں میں ایسے دفتر (Employment Bureaus) قائم کئے گئے ہیں جن کا تعلق ایک طرف مدرسوں، ہیڈ ماسٹروں اور والدین سے ہے اور دوسری طرف صنعت و حرفت کے نظام اور مختلف پیشوں سے، اور وہ اپنی واقفیت اور

تحقیق کی بنا پر طالبہ کو مناسب کام حل کرنے میں مدد دیتے ہیں - علاوہ بریں غریب طالبا کو معقول وظائف دیے جاتے ہیں جس سے نہ صرف ان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں بلکہ ایک حد تک ان والدین کی بھی دستگیری ہو جاتی ہے جو اپنے بچوں کو مدرسے بھیجنے کی وجہ سے اُن کی مالی امداد سے محروم ہو جاتے ہیں اور خود معذور ہونے کی وجہ سے اپنی روزی نہیں کما سکتے -

حکومت کے ذمے یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ نظام تعلیم کی عام نگرانی اور رہنمائی کرے تاکہ مختلف مدارس کے تعلیمی معیار میں یکسانی رہے - اگر مناسب نگرانی نہ کی جائے گی تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ بعض تعلیم گاہیں اپنے تعلیمی فرائض کو محنت اور دیانتداری کے ساتھ انجام نہ دیں گی اور ان کا معیار بہت گرجائے گا - محکمۂ تعلیم کو ایسی مناسب تجاویز اختیار کرنی چاہییں جس سے معلموں کے دل میں اپنے فرائض کا احساس تازہ رہے اور انہیں بجا لانے کی ترغیب ہو اور نئے تعلیمی تجربوں اور تحریکوں سے واقف ہونے کا موقع ملے - اسے ایسی عام ہدایت اُستادوں کی رہنمائی کے لیے شائع کرنی چاہییں جن پر اُستاد اپنے اپنے مقام پر عمل کر سکیں لیکن ان کی جائز آزادی میں فرق نہ پڑے - گزشتہ صدی تک انگلستان میں بورڈ آف ایجوکیشن (مرکزی مجلس تعلیم) اور اس کے کارکن گورنمنٹ انسپکٹر اُستادوں اور مدرسوں پر جابر جاسوسوں کی طرح مسلط تھے - اُن کے لیے صدر دفتر سے تفصیلی احکام جاری کئے جاتے تھے جن پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا اُستادوں کا کام تھا - وہ

امتحانوں کے نتیجے کی کسوٹی پر کسے جاتے تھے اور ان کا مستقل ہونا اور ترقی پانا سب کچھ اس بات پر منحصر تھا کہ کسی طرح امتحانوں کا نتیجہ خاطر خواہ رہے اور اس طرح تعلیمی دیوتا خوش رکھے جائیں - لیکن یہ صورت حال اب بالکل بدل چکی ہے - بورڈ کا کام مشورہ دینا اور رہنمائی کرنا قرار پایا ہے - وہاں سے استادوں کے لیے مختلف تعلیمی مباحث پر رپورٹیں اور رسالے شائع ہوتے ہیں جو ان کو نئے راستے سمجھاتے ہیں - بورڈ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایک عام معیار تجویز کر دیتا ہے جس سے مدرسوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں ایک مقررہ مدت میں کم و بیش اس قدر کام کرنا ہے اور پھر وہ اس کے لحاظ سے اپنے کام کی تنظیم کر سکتے ہیں - اس اصول پر انسپکٹر بھی کام کرتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کا نقطۂ نظر بہت کچھ اس کی طبیعت اور خیالات پر منحصر ہوتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی اب انسپکٹروں کی جماعت کا کام پولیس کے سپاہیوں کی طرح معلموں کے جرائم اور کمزوریوں کی تفتیش کرنا اور سزا دینا نہیں بلکہ ان کو مدد دینا اور ان کو نئے تعلیمی طریقوں سے اور تجربوں سے روشناس کرنا ہے - بقول زمانۂ حال کے ایک مصنف کے " محکمۂ تعلیم کا انسپکٹر ہیڈ ماسٹر کے پاس بیٹھ کر سگرٹ کا کش لگائے گا اور دوستانہ گفتگو کے دوران میں اپنا وسیع تر تجربہ اس کے سامنے پیش کر دے گا " -

ممکن ہے ہندوستان کے بعض " دفتری " ذہنیت رکھنے والے انسپکٹر اور تعلیمی افسروں کو اس تصور سے غش آ جائے

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ محکمۂ تعلیم کے نگران افسروں اور معلموں میں جب تک اس قسم کے امداد باہمی کے تعلقات قائم نہ ہوں گے ملک میں تعلیمی اصلاح ممکن نہیں کیونکہ تعلیم بالخصوص ان مشاغل میں سے ہے جن میں دفتری ذہنیت اور بندشیں نقصان‌دہ ثابت ہوتی ہیں -

اُستادوں کی تعلیم کی ذمہ‌داری بھی حکومت کے سر ہے کیونکہ اس اہم کام کو تمام‌تر افراد اور جماعتوں کی مرضی پر نہیں چھوڑا جا سکتا - مدتوں تک لوگوں کا یہ خیال رہا کہ ہر شخص بچوں کو پڑھانے کا کام انجام دے سکتا ہے جو خود تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہو - اس کے لیے کسی خاص تعلیم و تربیت یا انتخاب کی ضرورت نہیں - جب تک تعلیم خاص طبقوں تک محدود تھی اور افراد اپنی مرضی اور طبیعت سے تعلیم کے فرض کو اپنے ذمے لیتے تھے اس طرح کام چلتا رہا - طالب‌علموں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور معلمی کا فرض اکثر وہ لوگ انجام دیتے تھے جو کم از کم اپنے خیال میں اس سے کچھ طبعی مناسبت رکھتے تھے - علاوہ بریں اس وقت مدرسے یا معلم کا کام یہی تھا کہ اپنے شاگردوں کو علم سکھائے یعنی ان کو درسی کتابیں پڑھا دے - تعلیم کے دوسرے پہلوؤں یعنی کسب معاش اور تمدنی زندگی کی تیاری کی طرف معاشرہ خود توجہ کرتا تھا - بچے مختلف قسم کے عملی کاموں اور معاشرتی مشاغل میں شرکت کرتے تھے اور اس طرح ان کی درسی تعلیم کی تکمیل زندگی کے مدرسے میں ہوتی تھی - لیکن اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے - تعلیم عام ہو گئی ہے اور کم از کم ابتدائی مدارج تک ہر بچے

کے لیے مدرسے جانا ضروری ہے - زندگی کا نظام بہت پیچیدہ ہو گیا ہے اس لیے والدین اور پیشہ‌ور لوگ براہ راست اکثر کاموں کی تعلیم نہیں دے سکتے - اور بعض ملکوں میں جہاں صنعت و حرفت کی بےاندازہ ترقی نے انسانوں کو مشین اور زندگی کو ایک بندھا ہوا معمول بنا دیا ہے گھر کی زندگی کا قدیم نقشہ بھی بالکل بگڑ چکا ہے ۔ حالانکہ یہی بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مرکز اور ان کی تربیت کا موثرترین ذریعہ تھا - اس لیے یہ نئے فرائض بھی اب مدرسے کے ذمے پڑ گئے ہیں - اور ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ہر کس و ناکس اس اہم فرض کو بجا لائے گا خواہ وہ اس کام کے لیے باقاعدہ طور پر تیار کیا گیا ہو یا نہیں - جب اس تخصیص اور مہارت فن کے دور میں ہم معمولی کاموں کے لیے بھی باقاعدہ تعلیم یافتہ ماہرین کی تلاش کرتے ہیں اور اس امر پر مصر ہوتے ہیں کہ ڈاکٹری ' انجینیری ' زراعت غرض ہر قسم کے کام کے لیے ایسے آدمی مقرر کئے جائیں جنہیں ان شعبوں میں خاص مہارت ہو تو یہ کیسے جائز رکھا جا سکتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کو ایک ایسی جماعت کے سپرد کردیں جو اس اہم فرض کی اہلیت نہ رکھتی ہو - ہم جانوروں اور انسانوں کی جسمانی صحت کی نگہداشت اور پھولوں اور پودوں کی نشو و نما کا انتظام جاہل اور ناواقف لوگوں کے سپرد نہیں کر سکتے - مگر یہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ صدیوں تک انسانوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں رکھا جن کو اس فرض کی ادائگی کی کوئی تعلیم نہیں دی گئی تھی - اگر ان میں

سے کوئی اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے اچھا معلم نکلتا تو
یہ طلبہ کی خوش قسمتی تھی ورنہ بالعموم وہ لوگ جو دوسرے
کاموں میں ناکامیاب رہتے یا ابتداً ہی سے اور کاموں کے لیئے
ناقابل ہوتے وہ بچوں کو پڑھانے کے لیئے مدرسہ کھول دیتے تھے۔
انگلستان میں گزشتہ صدی تک یہ حالت دیکھنے میں آتی تھی
اور مشہور ناول نویس چارلس ڈکنس (Charles Dickens)
نے اپنے سحرنگار قلم سے سکویرز (Squeers) کے مدرسے کی جو
تصویر کھینچی ہے اس میں مبالغے کی چاشنی ضرور ہے لیکن
نہ وہ خلاف واقعہ ہے نہ غیر معمولی - ہمارے ملک میں
بدقسمتی سے اب بھی بےشمار چھوٹے چھوٹے مدرسے ایسے ہیں
جن میں بالکل ناقابل اُستاد نہایت کم مشاہرے پر بچوں کو
پڑھاتے ہیں - بلکہ پڑھاتے کیا ہیں اپنا وقت اور ان کی عمر
ضائع کرتے ہیں - ہر وہ شخص جو کسی شہر یا قصبے میں
مقامی اہمیت اور حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے چندے سے
تھوڑا بہت روپیہ اکٹھا کر کے ایک مدرسہ کھول دیتا ہے اور اس
میں کم سے کم تنخواہ پر اکثر ایسے اُستاد "معلم" رکھ لیتا ہے
جو معلمی تو کیا کسی کام کے لیے بھی موزوں نہیں ہوتے -
حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے مدرسوں کی تعداد کو بڑھنے
نہ دے کیونکہ ناقص تعلیم ' جو ایک خراب ماحول میں دی
جائے ' ہرگز جہالت سے بہتر نہیں - اس میں شک نہیں کہ
ایک غیر ملکی حکومت کے لیئے افراد کی تعلیمی کوششوں کو
روکنا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ اس میں یہ بھی اندیشہ
ہے کہ تعلیمی جد و جہد اور تجربوں کی جائز آزادی میں فرق
آجائے اور ملک میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی

جائے - لیکن اب کہ تعلیم کا شعبہ بہت کچھ ھندوستانیوں کے ھاتھ میں آ گیا ھے اور تھوڑے دنوں میں اس کی تمام‌تر ذمہ‌داری انھیں پر عائد ھوگی ' ھمیں اس معاملے میں جرات کے ساتھ ایک سخت پالیسی اختیار کرنی چاھیے تاکہ محض جذبات سے متاثر ھوکر اور مروت میں آکر لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کو برباد نہ ھونے دیں - محکمۂ تعلیم کو اس بات پر اصرار کرنا پڑے گا کہ بالعموم مدرسوں میں ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جائے جو باقاعدہ معلمی کے کام کے لیے تیار کیے گئے ھیں - اس شرط سے ھمارا یہ مطلب نہیں کہ ھر سند یافتہ معلم لازمی طور پر قابل ھوتا ھے اور جو شخص کسی ٹریننگ اسکول یا کالج کی چکی میں سے نہیں گزرا وہ معلمی کا کام کر ھی نہیں سکتا - یہ امر مشاھدے اور تجربے کے خلاف ھے - کیونکہ ھم دیکھتے ھیں کہ بعض لوگوں کے دل و دماغ اور سیرت میں قدرتاً وہ خصوصیات ھوتی ھیں جو معلم کے لیے لازم ھیں اور بعض لوگ باوجود اعلیٰ درجے کی فنی تعلیم کے معلمی کے لیے بالکل نااھل ثابت ھوتے ھیں - لیکن بحیثیت مجموعی یہ امر مسلم ھے - کہ اچھا معلم فنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنا کام اور زیادہ خوبی کے ساتھ اور برا معلم اپنا کام قدرے بہتر کر سکتا ھے - محکمۂ تعلیم کو یہ حق ھمیشہ حاصل ھونا چاھیے کہ خاص صورتوں میں بہت اچھے معلموں کو فنی تعلیم کی شرط سے بری کر دے لیکن بالعموم حکومت کو محکمۂ تعلیم کے توسط سے تمام معلموں کے لیے یہ لازم کر دینا چاھیے - جن ملکوں میں گزشتہ پچاس سال میں تعلیمی ترقی ھوئی ھے اور یہاں تعلیمی ترقی سے

ہمارا مطلب محض تعلیم کی توسیع نہیں بلکہ تعلیمی اصلاح بھی ہے' وہاں معلموں کی تعلیم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور اس کی مدت بھی ہمارے ملک سے بہت زیادہ ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ اس تعلیم کو لازم قرار دینے سے پہلے اس کی اصلاح اور تنظیم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ وہ بےروح تعلیم جو عموماً ہمارے نارمل اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے ہرگز اس عظیم‌الشان فرض کے شایاں نہیں جو انہیں انجام دینا ہے - اس لیے کہ استادوں کا کام اس زمانے میں محض بچوں کو چند علوم و فنون سکھا دینا نہیں بلکہ نئی نسلوں کی دماغی نشو و نما اور سیرت کی تربیت کے ذریعے قومی تنظیم میں حصہ لینا ہے - مگر یہ مبحث بجائے خود اس قدر وسیع ہے کہ اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں -

حکومت کو ایک حق یہ بھی حاصل ہے کہ وہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ کرے - اس حق کا جواز کس بنا پر ہے؟ اگر گھوڑے کو اس کی مرضی کے خلاف گھاٹ پر لے جانا اور مجبور کر کے پانی پلانا جائز نہیں تو کیا انسانوں کو جبری طور پر تعلیم دلانا جائز ہو سکتا ہے؟ حکومت کا فرض اس پر ختم نہیں ہوجاتا کہ وہ ملک میں اِبتدائی مدارس کا ایک نظام قائم کر دے اور لوگوں کو آزادی ہو کہ خواہ وہ اس سے مستفید ہوں یا نہ ہوں - حکومت معاشرے کے مقاصد اور اغراض کو عمل میں لانے کا ایک آلہ ہے - اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ تمام ایسے ذرائع اختیار کرے جو معاشرے کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری ہوں - اگر حکومت تعلیم کو اختیاری رکھے اور اس بات کو لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دے کہ وہ تعلیم حاصل

کریں یا نہ کریں تو اندیشہ ھے کہ بعض لوگوں کی غفلت اور
بےپروائی کی وجہ سے تمام معاشرے کے لیے خطرات پیدا
ہو جائیں گے - تعلیم نہ صرف افراد کے لیے ضروری ھے کہ وہ
اپنی زندگی کی باقاعدہ تنظیم کریں بلکہ حکومت اور معاشرت
کے قیام کے لیے بھی وہ ناگزیر ھے خصوصاً جمہوری حکومتوں کے
لیے کیونکہ وھاں ملک کا کاروبار چلانے کی ذمہ‌داری تمام تر
لوگوں پر ھے - اگر ملک کے ہر باشندے کو کم از کم اتنی تعلیم
نہ دی جائے جو اس کو اپنے شہری اور ملکی حقوق و فرائض
سمجھنے میں مدد دے سکے تو اس کو ایک ذمہ‌دار شہری کا
رتبہ کیسے دیا جا سکتا ھے اور وہ اپنے راے دھندگی وغیرہ کے
حقوق کا صحیح استعمال کیسے کرسکتا ھے؟ اس صورت میں
ملک میں جاھل اور ناواقف لوگوں کی ایک ایسی جماعت
پیدا ھوجائے گی جو باقی لوگوں کے لیے خطرے کا باعث ہوگی -
ھندوستان میں آج کل یہ حالت بہت عام اور اندیشہ‌ناک ھے
ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد نہایت کم ھے اور آبادی
کا بہت بڑا حصہ ان لوگوں کا ھے جو خواہ اپنے کام میں مستعد
اور اچھے ھوں لیکن ابھی ان حقوق و فرائض سے پوری طرح واقف
نہیں جو ھندوستانی شہری کی حیثیت سے انہیں اس وقت
حاصل ھیں یا بہت جلد حاصل ھونے والے ھیں - اس
وجہ سے وہ بہت آسانی سے مختلف قسم کی نامعقول
تحریکوں کا شکار ھو جاتے ہیں - ہر طرف سے سختیاں
اور حق تلفیاں سہتے ھیں اور کچھ نہیں کرسکتے - اس صورت
حال کو جمہوری نظام حکومت کے قیام کے خلاف دلیل کے طور
پر استعمال کرنا درست نہیں - بلکہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا

چاہیے کہ ملک میں بہت تیزی کے ساتھ صحیح تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ جمہور اپنے نئے فرائض کو عمدگی کے ساتھ انجام دے سکیں - یہ مقصد جمہوری حکومت کے قائم ہو جانے سے جلدتر حاصل ہوگا - عملی طور پر سیاسی اور مدنی تعلیم پانے کا موقع اسی صورت میں مل سکتا ہے -

تعلیم اور حکومت کا باہمی تعلق مندرجۂ بالا بیان سے واضح ہوگیا ہوگا - ہم نے بتا دیا ہے کہ بالعموم حکومت پر تعلیم کے متعلق کیا فرائض عائد ہوتے ہیں - لیکن علاوہ اس ظاہری تعلق کے حکومت اور تعلیم کی ماہیت میں بھی ایک گہرا رشتہ ہے جس کو نظام تعلیم سے زیادہ تعلیم کی روح اور غایت سے سروکار ہے - ہم نے پہلے باب میں صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ تعلیم کو اپنے ماحول کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا ہے ' خواہ وہ سیاسی ماحول ہو یا معاشرتی اور اگر اس ماحول میں تبدیلیاں واقع ہوں تو تعلیم کے منشا اور مفہوم پر اس کا اثر یقیناً پڑتا ہے - گزشتہ دو صدیوں میں حکومت کے نظام اور فلسفۂ سیاست میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ' جن کو انقلاب فرانس نے استحکام اور قبول عام بخشا ہے ' انھوں نے تعلیم کے نئے نئے مسائل پیدا کردیے ہیں اور اب ہمیں اس پر غور کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ ان سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے تعلیم میں کیا تبدیلیاں لازم ہو گئی ہیں - ہندوستان میں اس مسئلے کی فوری اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ہمیں عنقریب نظام حکومت میں ان تبدیلیوں اور ذمہ‌داریوں سے سابقہ پڑنے والا ہے جو دنیا کے بیشتر ملکوں میں اس وقت پائی جاتی ہیں -

حکومت کا جو تصور آج کل ہمارے ذہن میں ہے وہ اس مفہوم سے بہت مختلف ہے جو پرانے زمانے میں سمجھا جاتا تھا - افلاطون نے نظام حکومت کا جو تخییلی خاکہ اپنی ریاست میں پیش کیا ہے اس میں اور موجودہ فلسفۂ سیاست میں یہ بات ضرور مشترک ہے کہ دونوں حکومت کو افراد کی فلاح اور بہبود کا ضامن سمجھتے ہیں - لیکن افلاطون کے نظریۂ حکومت میں ملک کے تمام افراد کے حقوق یکساں نہیں ہیں - وہ جنگ آزماؤں اور حکمرانوں کے لیے تعلیم کا ایک نظام پیش کرتا ہے جس کے ذریعے ان میں اپنے مخصوص فرائض کی ادائگی کی اہلیت پیدا ہو لیکن اس سب سے بڑے طبقے کا کوئی ذکر نہیں کرتا جس میں مزدور اور دولت کمانے والے لوگ شامل ہیں - وہ تعلیم کو حکومت کے اہم‌ترین فرائض میں شمار کرتا ہے اور ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانتا ہے - ڈاکٹر ذاکرحسین خاں افلاطون کی '' ریاست '' کے مقدمے میں لکھتے ہیں -

'' افلاطون سے پہلے بھی عام طور پر یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کی مالک ہو - اس لیے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترک متاع روحانی میں اپنے سب اراکین کو حصہ‌دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ بنا دے جس میں رہ کر ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاع روحانی کے ذریعے دوسرے افراد سے رشتۂ اتحاد پیدا کرے - اس متاع مشترک سے مراد وہ لکھے اور

بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیدا ہونا جماعت کی
فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا -
افلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے
وہ بھی مانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے
اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا
اور انہیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا ہے " ۱ -

لیکن ریاست کے افراد کو اس نے دو مختلف جماعتوں
میں تقسیم کر دیا ہے - اس میں ایک جماعت " فلسفی
حکمرانوں " یا " فلسفی بادشاہوں " کی ہوگی جن کو بہترین
معاشرتی اور انفرادی تعلیم دی جائے گی ' جو عقل‌مند ' فیاض
اور باخبر ہوں گے اور رعایا کی ضرورت اور بہتری کو بخوبی
سمجھ سکیں گے - ان کا فرض یہ ہوگا کہ وہ قانون بنا کر
ریاست کے لیے انہیں نافذ کریں اور باقی لوگوں کا فائدہ اس
میں ہے کہ وہ بے چون و چرا اس قانون کی پابندی کریں -
کیونکہ وہ عقل کل فلسفی جو قانون بھی بنائیں گے ان کی
اطاعت لوگوں کے لیے سراسر بہتری کا باعث ہوگی - اس
معاشرے کے لیے اس نے وہی نظام تعلیم تجویز کیا جو
قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - یعنی کچھ لوگوں کو جن میں
اعلیٰ صلاحیت ہو منتخب کر کے ان کو ایسی تعلیم دی
جائے کہ وہ حکمرانی کے قابل بنیں اور باقی لوگوں کو اطاعت
اور فرماں‌برداری سکھائی جائے تاکہ ریاست کے سب کام عمدگی

۱ — افلاطون کی Republic کا ترجمہ "ریاست" کے نام سے انجمن
ترقی اردو' اورنگ‌آباد نے شائع کیا ہے - دیکھو صفحہ ۱۸ -

کے ساتھ چل سکیں - یہ کہنا غلط ہے کہ فلاطون کو تعلیم کی تمدنی اہمیت کا احساس نہیں تھا - اس کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کے ماہرین تعلیم کی نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ معاشرے کے قیام اور اس کی اصلاح میں تعلیم کا کیا درجہ ہے - لیکن وہ وقتی اور مقامی حدود سے باہر نہیں نکل سکا اور اس کے خیالات قدرتی طور پر ان سے متاثر ہوئے جو اس زمانے کے معاشرے میں پائے جاتے تھے - اس لیے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے ان جماعت بندیوں اور معاشرتی اور اقتصادی اختلافات کو مستقل اور دائمی سمجھ لیا تھا جن کی وجہ سے اس کے زمانے میں یونانی معاشرہ مختلف طبقوں میں منقسم ہو گیا تھا - یہی وجہ تھی کہ اس نے مختلف جماعتوں کے لیے مختلف قسم کی تعلیم تجویز کی جس کی بنیاد محض نفسی اختلافات پر نہ تھی -

اُس زمانے کے حالات اور نظام معاشرت کے لحاظ سے ہم اس نظام تعلیم کو غیر مناسب نہیں کہہ سکتے گو ہمارے اخلاقی اُصولوں کے مطابق وہ قرین انصاف نہ ٹھہرے ' لیکن اس وقت سے اب تک جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں انھوں نے ہماری زندگی کے سیاسی ماحول میں کایاپلٹ کر دی اور اس کے لیے یہ نظام تعلیم کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا - یہ صحیح ہے کہ اب تک ہماری معاشرت اور تعلیم دونوں میں ایسے اثرات موجود ہیں جنھوں نے معاشرے کو علحدہ علحدہ طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اس میں پوری طرح یکجہتی اور باہمی ربط موجود نہیں - لیکن جوں جوں

جمہوری نظام مستحکم ہوتا جاتا ہے اور لوگ اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے جاتے ہیں یہ تفرقے کم ہو رہے ہیں اور مروجہ رسمی اختلافات بھی مٹ رہے ہیں - سیاسی نقطۂ نظر سے تعلیم کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اس تحریک کو قوت پہنچائے اور جمہوریت کو سطحی معنوں میں نہیں بلکہ حقیقی اور گہرے معنی میں ملک میں رائج کرے -

جمہوری حکومت کا تصور سیاست کی تاریخ میں کوئی جدید تصور نہیں - انقلاب فرانس سے پہلے بھی اس کی مثالیں مختلف زمانوں میں بالخصوص اسلام کے ابتدائی دور میں ملتی ہیں لیکن بحیثیت ایک عملی سیاسی نظام کے اس نے انقلاب فرانس کے بعد ہی رواج پایا ہے - اس کی نمایاں سیاسی خصوصیت اور پہچان کیا ہے ؟ شخصی حکومت میں فرماں روائی کی قوت جو کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے قوم سے بالکل آزاد ہوتی ہے اور فرماں روا قوم سے برتر یا جدا سمجھا جاتا ہے - ممکن ہے یہ بادشاہ یا فرماں روا لوگوں کی مرضی اور رضاجوئی کا خیال کرے لیکن اس پر ایسا کرنا لازم نہیں - اُسے اختیار ہے کہ وہ ایسا کرے یا نہ کرے - برخلاف اس کے جمہوری نظام میں کم از کم نظری طور پر قوم کی متفقہ رائے اور ارادے کی حکومت ہوتی ہے یعنی حکومت بجائے ایک خارجی ارادے کے ایک داخلی قوت بن جاتی ہے جس کی حامل قوم کی نمائندہ جماعتیں ہوتی ہیں - اور ان کے مشورے سے اور ان کی نگرانی میں حکومت کے کاروبار انجام پاتے ہیں - سیاسی آزادی کا موجودہ تصور یہ ہے کہ لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتوں

کو بے روک ٹوک نشو و نما کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے تربیت یافتہ ارادے اور آزاد رائے سے وہ راہ اختیار کریں جو اپنے لیے اچھی سمجھتے ہیں - اُن پر جبراً ایسے قاعدے اور قوانین عائد نہ کئے جائیں جو دوسرے لوگ اُن کے حق میں اچھا سمجھیں - البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اس آزادی کے استعمال میں دوسروں کی جائز آزادی میں مداخلت نہ کریں - جب ہم اس اصول کا اطلاق تعلیم پر کرتے ہیں تو اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام لوگوں کو اس طرح تعلیم دی جائے کہ وہ خود اپنا برا بھلا سمجھیں اور اپنے ذاتی اور معاشری فائدے کو اچھی طرح پہچان کر اس کے حصول کی کوشش کریں - بہ الفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ جمہوری حکومت کا کاروبار قوم کے تمام بالغ افراد کی رائے دهندگی پر منحصر ہے اور اس میں براہ راست یا بذریعۂ نیابت سب لوگ شریک ہیں ' اس لیے اس میں ہرگز اُس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک جمہور میں ذمہ داری اور سیاسی اور معاشرتی معاملات کی سمجھ پیدا نہ ہو - یہ ممکن ہے کہ شخصی حکومت بغیر رعایا کے تعاون کے ' بغیر ان کو تعلیم دیے ایک حد تک کامیاب ہو جائے لیکن جمہوری حکومت کی کامیابی کے لیے ایک وسیع ہمہ گیر اور مناسب نظام تعلیم شرط لازم ہے - انیسویں صدی کے ایک مشہور انگریز مدبر نے کہا تھا کہ " اب ہمیں اپنے آقاؤں کی تعلیم کی فکر کرنی چاہیے " - اس کا مطلب یہ تھا کہ اب سیاسی انقلاب کی وجہ سے جماعتوں کی قوت کا توازن درہم برہم ہو گیا اور حکومت کے اختیارات رفتہ رفتہ چند

لوگوں کے ھاتھ سے نکل کر عوام کے ھاتھ میں آگئے ھیں جو صدیوں سے جہالت یا بےحسی میں گرفتار ھیں اور اپنی طاقت سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتے - یہ نقطۂ خیال محض جمہوریت کا پیش خیمہ ھے اصل جمہوریت اس وقت شروع ھوتی ھے جب "آقاؤں" اور "نوکروں" کا یہ امتیاز جس میں استہزا کی جھلک نظر آتی ھے بالکل اُٹھ جائے -

ایک تعلیمی اصول مدت سے یہ چلا آتا ھے کہ "تعلیم کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ھونا چاھیے" اور اس اصول کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مقصد کے لیے حسب ضرورت استعمال کیا ھے، لیکن اس اصول کے سمجھنے میں اکثر لوگ ایک غلطی کرتے ھیں جس کا صاف کرنا ضروری ھے - ھم یہ پہلے ھی بتا چکے ھیں کہ ایسا زمانہ تو کوئی بھی نہ ھوا جب تعلیم کو سیاست سے نہایت قریبی تعلق نہ رھا ھو - قدیم زمانے سے اب تک ھمیشہ حکومت کی غالب جماعتوں نے یہی کوشش کی ھے کہ مدرسوں کی تعلیم کے ذریعے نوجوانوں کے سیاسی خیالات پر اثر ڈالیں - اس قسم کی اثراندازی کو ھم تعلیمی لحاظ سے جائز قرار نہیں دے سکتے - نوعمر لڑکوں کے دماغ میں قبل از وقت جب ان کی قوت فیصلہ میں پختگی نہیں آتی کسی قسم کے سیاسی خیالات ٹھونسنا سراسر نامناسب ھے، کیونکہ وہ ان کی آزادی فکر اور دماغی نشو و نما کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ھے - لیکن یہ اعتراض اس سیاست پر عائد ھوتا ھے جس کا تعلق کسی خاص پارٹی یا جماعت سے ھوتا ھے اور جو بجائے سیرت کی تربیت میں معین ھونے کے عقل اور دماغ کو چند یکطرفہ

اور محدود خیالات میں جکڑبند کردیتی ھے - سیاست کا ایک مفہوم زیادہ وسیع اور عام ھے جس کا تعلق تمام قوم سے ھے - اس مفہوم کے مطابق سیاسی احساس صحیح حب وطن کی بنیاد ھے - وہ بچوں اور نوجوانوں کو اُن کے حقوق و فرائض سے آگاہ کرتا ھے اور ان کے دلوں میں انحصار باھمی اور ذمہ‌داری کے احساس کو تازہ رکھتا ھے - یہ وہ قوت ھے جو کسی ملک یا قوم کے افراد کو ایک رشتے میں منسلک کردیتی ھے اور اُن اثرات کو جو انتشار کا باعث ہوتے ھیں روکتی ھے - اس سیاست کو کسی حالت میں تعلیم اور مدرسے سے علحدہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ مدرسوں کا فرض ھے کہ وہ اپنے طلبہ کو شہریت کی تربیت دیں اور اُن کی تعلیم کو محض رسمی اور نظری علوم تک محدود رکھنے کے بجاے انھیں معاشرت اور سیاست کے زندہ مسائل سے روشناس کریں جو آج کل کی متمدن دنیا میں عموماً اور خود اُن کے ملک میں خصوصاً نہایت درجہ اھمیت رکھتے ھیں - شخصی حکومت کے دور میں سیاست کو مدرسے میں دخل دینا غیر ضروری اور غیرمفید ھے - کیونکہ اس حالت میں بے غرضی کے ساتھ اس کام کو انجام دینا تقریباً ناممکن ھے - مگر جمہوری حکومت کے قیام اور استحکام کے لیے صحیح قسم کی سیاسی تعلیم کے بغیر چارہ نہیں، کیونکہ اسی کے ذریعے سے آئندہ شہری ان تمام مسائل اور فرائض سے واقف ہو سکتے ھیں جو انھیں پیش آنے والے ھیں - اس میں بھی یہ اندیشہ ضرور ھے کہ اگر معلموں کا انتخاب اور نصاب تعلیم کی تدوین بہت احتیاط سے نہ کی جائے گی تو شہریت کی تعلیم کے بھیس

میں فرقہ وارانہ سیاست کے اثرات طلبہ پر ڈالے جائیں گے -
لیکن اول تو ہر کام میں جو کرنے کے قابل ہوتا ہے خطرے ہوتے
ہیں - مگر ان کی وجہ سے کوئی دانشمند اس کام کو ترک
نہیں کرتا بلکہ ان خطرات کو دور کرنے کی تدبیریں کرتا ہے -
دوسرے اگر جمہوری حکومت صحیح اصولوں پر قائم ہو اور
رفتہ رفتہ لوگوں میں جمہوری ذہنیت پیدا ہو جائے تو اُن کے
اغراض و مقاصد میں اس درجہ ہم‌آہنگی پیدا ہو جاتی ہے کہ
سیاسی فرقہ بندیوں کے مضر اثرات مقابلتاً کم ہو جاتے ہیں اور
سیاست کو مدرسوں میں دخل دینے میں نقصان کا زیادہ
امکان نہیں رہتا - مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ کی
وجہ سے ' جو کسی نہ کسی شکل میں آج کل ہر ملک میں
جاری ہے ' ابھی تک صحیح جمہوری ذہنیت پیدا نہیں
ہو سکی اور مثلاً انگلستان میں جہاں کم از کم جمہوری ادارے
مدتوں سے قائم ہیں ' آئے دن یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ
مختلف پارٹیاں مدرسوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے
کی کوششیں کرتی ہیں - مگر باوجود اس کے بھی بعض مقاصد
تمام جماعتوں میں مشترک ہیں جو باسلوب مناسب شہریت
کی تعلیم کے ضمن میں مدرسوں میں سمجھائے جا سکتے ہیں -
اور جب ان زبردست سیاسی حریفوں میں ایک حد تک
اغراض کی ہم‌آہنگی پیدا ہوگی تو صورت حال بہت بہتر
ہو جائے گی - ہندوستان میں باوجود تمام اختلافات کے بھی
یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ شہریت کی تعلیم کا انتظام کرنا
ضروری ہے اور ابھی گزشتہ چند سال کے اندر مختلف تعلیمی
محکموں نے اسے مدرسوں میں رواج دیا ہے - صوبجات

متحدہ میں ہائی اسکول کی اعلیٰ جماعتوں میں حال ہی میں مدنیات (Civics) نصاب میں داخل ہوئی ہے -

جمہوری حکومت محض اسی وجہ سے دوسری حکومتوں سے مختلف نہیں کہ اس میں ملک کے انتظام کا طریقہ ، حکمرانوں کا تقرر ، اور اختیارات کی تقسیم مختلف ہوتی ہے بلکہ اس کے ماتحت جو معاشرہ نشو و نما پاتا ہے اس کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی ہے - اس معاشرے کے لیے لازم ہے کہ اس کے افراد اور جماعتوں میں باہمی ربط اور میل جول ، تبادل خیالات اور شرکت عمل بہت زیادہ ہو اور وہ تمام بندشیں اور حدود جو انسانوں سے علحدہ رکھتی ہوں اور ان کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف طبقوں میں تقسیم کرتی ہیں توڑ دی جائیں - یعنی یہ معاشرہ زیادہ متحرک ہوتا ہے ، تبدیلیوں کو اور جدید اثرات کو جلد قبول کرتا ہے اور اس کے ماحول میں جو نئے حالات اس کی اپنی کوششوں یا خارجی اسباب سے پیدا ہوتے ہیں ان کے مطابق خود کو ڈھالتا رہتا ہے تاکہ وہ زمانے کے دوش بدوش ترقی کرے ، اس سے پیچھے نہ رہ جائے - پروفیسر جیمز وارڈ (James Ward) نے اپنی قابل مطالعہ کتاب " نفسیات تعلیم "[۱] میں دو قسم کے ماحول میں تمیز کی ہے - ایک ماحول وہ ہے جس کی حالت کم و بیش یکساں رہتی ہے - اس میں ایک ایسا مستقل سکون پایا جاتا ہے کہ اس میں زندگی بسر کرنے والے اپنی عادتوں اور افعال میں صدیوں تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے - اس

---

۱ - Psychology applied to Education

قسم کے افراد اور جماعتوں کو وہ ساکن مثالیں (Stationary types) کہتے ہیں - برخلاف اس کے بعض افراد اور جماعتیں ایسی ہیں جو اپنے ماحول کے ساتھ اتنی ہم‌آہنگ نہیں ہیں کہ اُن کے نظام اور افعال میں تبدیلی کی ضرورت ہی نہ ہو - ان کو مسلسل نئے تجربوں اور تبدیلیوں سے سروکار رہتا ہے - اور یہ جماعتیں اپنی کوشش اور جد و جہد سے ایک طرف تو اپنے ماحول کو زیادہ پیچیدہ اور معنی خیز بناتی ہیں اور دوسری طرف اس ماحول کے ساتھ ہم‌آہنگ ہونے کی کوشش میں افراد کی نشو و نما کے سلسلے کو جاری رکھتی ہیں - اس طرح ان "متحرک جماعتوں" (Dynamic Types) میں ایک حرکت پیہم پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے تمام اداروں اور نظام زندگی میں تبدیلی اور نشو و نما ہوتی رہتی ہے - جمہوری معاشرہ، اس قسم کی متحرک جماعت کی بہترین مثال ہے کیونکہ اس میں افراد اور جماعتیں برابر اوپر نیچے آگے پیچھے حرکت کرتی رہتی ہیں - اس کی زندگی مقررہ راستوں پر اور تنگ حدود کے اندر مقید نہیں رہتی بلکہ آزادی کی فضا میں پرورش پانے کی وجہ سے اس میں نئے راستے تلاش کرنے کی آرزو اور نئے تجربے حاصل کرنے کا جوش ہوتا ہے - اس لیے اس معاشرے میں جو تعلیم دی جائے وہ لازماً ایسی ہونی چاہیے جو نوجوانوں میں جدت اور اپج کا مادہ پیدا کرے، ان کو نامناسب قدامت پرستی سے بچائے اور ان کی تمام مخفی قوتوں کے لیے نشو و نما اور اظہار کے مواقع پیدا کرے - شخصی حکومت کی کامیابی کے لیے رعایا کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ وہ آنکھیں بند کر کے

حاکم کے حکم کی تعمیل کرے اور اپنی سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت کو معطل رکھے - لیکن جمہوری حکومت جس کا دار مدار افراد کی ذاتی جد و جہد اور کاوش پر ہے ایسے لوگوں کی طالب ہے جو اپنی عقل اور قوت عمل دونوں سے کام لیں اور اپنے شوق اجتہاد کی بدولت نئے راستوں اور نئے تجربوں کی تلاش میں رہیں - اس قسم کے معاشرے میں جمود پیدا ہوجانا اس کی خرابی کی صریح علامت ہے - مشہور انگریزی مفکر برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی کتاب "تعلیم" (On Education) میں دونوں قسم کے معاشروں کی مثالیں دیتے ہیں - وہ کہتے ہیں [۱] کہ چین کا معاشرہ اور چین کی تعلیم اب سے کچھ عرصے پہلے تک سکون اور جمود کی نہایت عمدہ مثال تھی - وہاں کی تہذیب نے اپنی انتہائی ترقی کے زمانے میں دو چیزیں پیدا کیں یعنی سکون و استقلال اور آرٹ - لیکن وہ نہ سائنس پیدا کر سکی نہ ترقی کی خواہش اور قابلیت - اس کا ذہنی میلان ایک قسم کے فلسفۂ تشکیک (Scepticism) کی جانب تھا جس میں عقائد کی پختگی اور جوش و خروش نہ پایا جاتا تھا - جہاں کہیں یہ جوش اور حرکت پائی جاتی ہے وہاں اس کا نتیجہ یا تو انتہائی ترقی ہوتا ہے یا تباہی ' سکون ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا - پرانی یونانی تعلیم بالخصوص ایتھنز (Athens) کی تعلیم میں یہ بات پائی جاتی تھی - کیونکہ یونانی لوگ چینیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ صاحب قوت اور صاحب حوصلہ تھے -

---

۱ — دیکھو صفحہ ۳۰ -

وہ ان پیرونوں کا فرق سمجھانے کے لیے ایک دلچسپ مثال دیتے ہیں "سیاست اور حب وطن کے جوش میں یونانیوں کو اپنی قوت کے اظہار کے عملی موقعے ملتے تھے - جب کوئی سیاسی لیڈر اپنے وطن سے نکال دیا جاتا تھا تو وہ ایک چھوٹی سی فوج جمع کر کے اپنے وطن پر حملہ کر دیتا تھا - برخلاف اس کے اگر کوئی چینی افسر معزول کر دیا جاتا تھا تو وہ پہاڑوں میں کوئی جائے پناہ ڈھونڈھ لیتا تھا اور وہاں دیہاتی زندگی کی مسرتوں اور لطف کے متعلق نظمیں لکھتا تھا" موجودہ زمانے میں متحرک سوسائٹی کی مثال امریکا اور یورپ کی بعض اقوام ہیں جنھوں نے سائنس کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیا ہے اور اس کے ذریعے سے وہ قوت حاصل کی ہے جس کے بغیر آج کل کی دنیا میں جہاں مقابلہ اور جنگ و جدل کا دور دورہ ہے بسر ہونی مشکل ہے - موجودہ زمانے میں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے بقول رسل کے اس قسم کے آدمیوں کی ضرورت نہیں جیسے انگلستان کے پبلک اسکول اور پرانی یونیورسٹیاں پیدا کرتی رہتی ہیں - یہ درسگاہیں اعتماد نفس' اعتقاد راسخ' مضبوطی اور حوصلہ‌مندی پر زور دیتی تھیں اور عقل' ہمدردی اور انسانی احساس کو ان صفات پر قربان کر دیتی تھیں - اس زمانے میں ایسے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہے "جن میں تخیل اور ہمدردی زیادہ ہو' جن کی عقل میں زیادہ رسائی ہو' جو معاملات کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکیں' جن کو کٹے کی سی بہادری اور استقلال پر کم اور فنی معلومات پر زیادہ بھروسا ہو" -

ہمارے لیے اس وقت یہ سوال درپیش ہے کہ ہندوستان

میں اس وقت کس قسم کے حالات پائے جاتے ہیں اور ان سے ہمارے تعلیمی مسائل کے متعلق کیا نتیجہ نکلتا ہے ۔ ہندوستان سیاسی لحاظ سے اس وقت تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے ۔ شخصی غیرملکی اور دفتری حکومت کا باب اب ختم ہوا چاہتا ہے اور دیر سویر ختم ہوکر رہے گا اور اس کے بجائے ملک میں بہت جلد یا کچھ عرصے کے بعد جمہوری نظام اور ادارے قائم ہونے والے ہیں ۔ اس تبدیلی اور تغیر کے زمانے میں قدیم رسوم و عقائد اور جدید خیالات اور اداروں میں کشمکش ہو رہی ہے ۔ ایک طرف وہ سکون اور قدامت‌پسندی لوگوں میں باقی ہے جس کی مثال میں رسل نے چینی تہذیب کو پیش کیا ہے اور دوسری طرف زمانے کے حالات اور تقاضے سے متاثر ہو کر ملک میں حرکت اور قوت‌عمل پیدا ہو گئی ہے جو نئے سیاسی اور تمدنی تجربوں کے لیے تیار اور آمادہ ہے ۔ اس کشمکش کے عرصے میں تعلیم کو نہایت اہم فرائض انجام دینے ہیں ۔ اگر تعلیم کا اثر اور رجحان جمود اور قدامت‌پرستی کی طرف ہوگا تو نہ صرف آنے والی جمہوری حکومت کا تجربہ ناکامیاب ثابت ہوگا بلکہ علاوہ سیاست کے میدان کے ہمارا ملک زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ترقی نہ کر سکے گا اور دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائے گا ۔ برخلاف اس کے اگر تعلیم‌گاہیں اور معلم اپنا تمام اثر جمہوری حکومت اور جمہوری معاشرے کے مناسب ذہنیت پیدا کرنے میں صرف کریں تو اس کے نتائج بہت گہرے اور وسیع ہوں گے کیونکہ ان کی مدد سے نوخیز نسلیں ان معاشرتی اختلافات اور تعصبات کو دور کرسکیں گی جو

سوسائٹی میں حرکت اور تموج کو روکتے ہیں اور افراد کی مفید صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتے - موجودہ ہندوستانی سیرت کی ایک قابل افسوس کمزوری یہ ہے کہ اس میں حوصلہ، ہمت، اپچ اور مشکلات کو استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کی قوت کم ہے - وہ اپنی ذمہ‌داری پر بڑے بڑے کاموں کو شروع کر کے ان کو انجام تک نہیں پہنچاتے - ہندوستانیوں کے لیے یہ بات باعث ننگ ہے کہ غیرملکوں کے لوگ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچیں اور ان میں سے ایسے جان پر کھیلنے والے سیاح موجود نہ ہوں جن کے نصیب میں یہ سرخروئی آئے - ان کے لیے یہ شرم کا موجب ہے کہ ان کے یہاں کی بیماریوں اور امراض کا علاج معلوم کرنے کے لیے یورپ اور امریکا کے ماہرین فن جد و جہد کریں، اپنا روپیہ صرف کریں، اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالیں اور وہ خود اس جہاد میں پیش پیش نہ ہوں - ان باتوں کے تاریخی وجوہ جو کچھ بھی ہوں اور اس کی ذمہ‌داری اور الزام جس کسی پر بھی عائد ہو تعلیم کو بہرحال اس خرابی کا علاج کرنا ہے اور ملک کے افراد کو ان دشواریوں اور ذمہ‌داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت دینی ہے، جس سے ان کو آگے چل کر سابقہ پڑے گا، اور ان میں سائنس کی تعلیم کے ذریعے تسخیر فطرت اور ترقی کی صلاحیت پیدا کرنی ہے - جب تک تعلیم میں ایک نئی روح نہ پھونکی جائے اور اس کو ان جدید میلانات سے روشناس نہ کیا جائے جو جمہوری معاشرے کا خاصہ ہیں، اس وقت تک ہندوستان کی آئندہ حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی -

ان میلانات میں ' جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہیں - ایک تو یہ کہ افراد میں تمام صلاحیتوں کو ابھارا جائے جو ترقی اور حرکت کے لیے ضروری ہیں - دوسرے یہ کہ افراد اور جماعتوں میں اغراض اور مقاصد کا ایسا اتحاد پیدا ہو جائے کہ ان میں باہمی ہمدردی اور باہمی احتیاج کا احساس ہر دم تازہ رہے - جس معاشرے میں حرکت ہو ہر جدید چیز کی اشاعت کے لیے راہیں کھلی ہوئی ہوں اس میں یہ انتظام ہونا چاہیے کہ اس کے تمام افراد میں جدت کا مادہ اور خود کو خیالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت پیدا ہو - ورنہ وہ ان تبدیلیوں کے گرداب میں پڑ کر رہ جائیں گے جو ان کے گرد و پیش ہو رہی ہیں اور جن کی اہمیت سے وہ ناواقف ہیں "[1] اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے ہر فرد کی صلاحیتوں کو پوری پوری نشو و نما کا موقع دیا جائے - تاکہ ہر طرح کی صلاحیت اور قابلیت رکھنے والے افراد مل کر معاشرے میں ترقی اور تبدیلی کی گنجائش پیدا کریں - یہ تعلیم افراد میں ایک بے رنگ اور بے روح یکسانی کو رواج نہیں دے گی بلکہ ان تمام قوتوں کو ابھارے گی جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممتاز کرتی ہیں تاکہ ان رنگ برنگ کے سروں کے میل سے ایک ہم آہنگ نغمہ پیدا ہو - جمہوری تعلیم انفرادیت پر زور دے گی لیکن انفرادیت کی تربیت ایسے معاشرتی ماحول میں کرے گی جہاں ایک دوسرے کے تجربات '

۱—Dewey ; Democracy and Education صفحہ ۱۰۲ -

خیالات اور مشاغل میں شرکت کر کے اور باہمی داد و ستد کی بدولت اس میں تمدنی قدروں اور تعلقات کا احساس مستحکم ہو جائے گا جمہوریت کا ایک طرف تو یہ تقاضا ہے کہ ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ اظہار خودی کا موقع دیا جائے لیکن دوسری طرف یہ شرط ہے کہ یہ اظہار اپنے لیے وہ وہ راستے اختیار کرے جو معاشرے کے اعلیٰ ترین مفاد کے منافی نہ ہوں' بلکہ ان کے حصول میں مدد دیں - ہندوستان کی جدید حکومت کا اولین فرض یہ ہوگا کہ وہ تمام سرکاری و غیرسرکاری تعلیمی وسائل کا جائزہ لے کر ان کو منظم اور مربوط کرے اور ایک وسیع اور مکمل نظام قائم کرے جس کے دامن میں رفتہ رفتہ ملک کی نوخیز نسل کے تمام افراد آ جائیں - جن کی تربیت اسی احتیاط اور غور کے ساتھ کی جائے جو آج کل صرف بعض اہل ثروت لوگوں کے حصے میں آتی ہے - وہ تمام رکاوٹیں جو مفلسی کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل ہیں دور کی جائیں اور انہیں بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے تعلیمی اثرات میں رکھا جائے کہ قوم کے جس طبقے میں جہاں کہیں بھی کوئی جوہر قابل پیدا ہو اس کو اعلیٰ ترین تربیت اور نشو و نما کا موقع ملے اور باقی تمام لڑکے اور لڑکیاں اپنی ذہنی استعداد اور رجحان کے مطابق تعلیم پائیں اور اپنی قوتوں کو ذاتی اور قومی مقاصد کے حصول میں صرف کریں - ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہوگا کہ وہ فلسفۂ تعلیم کی اور نظریۂ تعلیم کی تشکیل کریں اور نصاب' طریقۂ تعلیم' اصول ضبط اور مدرسوں کے داخلی اور خارجی نظم و نسق میں مناسب ترمیم کر کے تعلیم‌گاہوں کو ایسا

ماحول بنا دیں کہ جو طلبہ وہاں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلیں وہ ہندوستان کے آزاد شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دے سکیں جو اس نئے جمہوری معاشرے میں ان پر عائد ہوں گے جس کی تشکیل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے، اگرچہ کبھی کبھی باہمی اختلافات اور مناقشات کی وجہ سے فضا اِس درجہ تاریک اور مکدر ہو جاتی ہے کہ اس میں مستقبل کا روشن رخ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے -

حصۂ دوم

"درسی تعلیم"

باب اول

علم اور زندگی

موجودہ نظریۂ تعلیم اور اس کے اہم‌ترین اصولوں کو بخوبی سمجھنے کے لیئے سب سے بہتر طریقہ یہ ھے کہ ھم مدرسۂ جدید کے اس تصور پر نظر ڈالیں جو اس زمانے میں پیدا ھوا ھے اور جس نے جدید تعلیمی خیالات کو علمی جامہ پہنانے کی کوشش کی ھے - اگر ھمارا مقصد موجودہ تعلیم کے تاریخی ارتقاء کو دکھانا ھوتا تو ھم اس سے بحث کرتے کہ "جدید خیالات" سے مراد یہ نہیں کہ ان کا قدیم خیالات سے کوئی تعلق نہیں یا تعلیم میں دفعتاً کوئی زبردست انقلاب ھو گیا ھے جس کی وجہ سے تمام پرانے آثار مٹ گئے ھیں اور ان کے بجائے ایک بالکل نئی عمارت کھڑی ھو گئی ھے انسانی معاملات کی ھر تبدیلی علت اور معلول کے ایک اٹل ارتقائ

سلسلے میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے جس کا سمجھنا اور سمجھانا فلسفے کے طالب علم کا فرض ہے - یہی صورت تعلیمی تبدیلیوں کی ہے - یہ بھی ایک ایسے ہی ارتقاء کا نتیجہ ہیں - ان کی جڑیں ماضی کے واقعات اور حوادث میں پوشیدہ ہیں مگر ان کا فوری سبب وہ حالات ہیں جو اس زمانے میں ہمارے پیش نظر ہیں - لیکن اس کتاب میں ہمارا موضوع بحث تعلیم کا تاریخی مطالعہ نہیں بلکہ اصول تعلیم کا تجزیہ اور تشریح ہے اس لیے ہم اس حصے میں مختلف تعلیمی مسائل سے ان بڑے بڑے اصولوں کی ضمن میں بحث کریں گے جس پر موجودہ زمانے کے بہترین تعلیمی خیالات مبنی ہیں - یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی عملی تجویز یا انسانی ادارہ اپنے نصب العین سے پوری پوری مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ نصب العین کوئی مقررہ منزل نہیں، جہاں ہم واقعی پہنچ جائیں بلکہ ایک رہنما ستارہ ہے جو ہماری دسترس سے بلند ہوتا ہے اور ہماری کوششوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے - حصۂ اول میں ہم نے تعلیم کی جو غایت بیان کی ہے اس کی حیثیت ایک آئیڈیل (نصب العین) کی ہے، جس کو تمام و کمال حاصل کرنا امکان سے باہر ہے - لیکن مدرسۂ جدید کے تعلیمی اصولوں اور رجحانات پر غور کرنے سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری تعلیمی ارتقاء کا کیا رخ ہے اور ہماری تعلیمگاہیں کن مقاصد کو پورا کرنے میں کوشاں ہیں - مثال کے طور پر ہمیں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی طریقوں اور کوششوں کا ذکر کرنا ہوگا اور اس طرح ہمیں ان کے تعلیمی تجربات سے بھی آگاہی ہو جائے گی اور ہم یہ اندازہ کر سکیں گے

که همارے اپنے مدارس جدید تعلیمی خیالات کی رو سے کس قدر پیچھے رہ گئے ھیں -

مدرسۂ جدید کی واقعی اهمیت اور حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے همیں بطور پس منظر کے "مدرسه" یا "اسکول" کے قدیم تاریخی تصور پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاهیے تاکه هم دونوں کا مقابله کر کے سمجھ سکیں که تصور میں کون سے عناصر مستقل اهمیت رکھنے کی وجه سے قدیم زمانے سے اب تک برابر چلے آتے ھیں اور کن امور میں تبدیلی اور ترمیم هو گئی ھے - هم تعلیم اور تمدن کی ابتدائی بحث میں یه بیان کر چکے ھیں که انسانی زندگی کے نظام میں مدرسے کا آغاز کس طرح هوا - ابتدا میں لوگوں نے زندگی کی ضروریات سے مجبور هوکر اپنی اولاد کو بعض وہ چیزیں بتائیں اور سکھائیں جن کے جانے بغیر چارہ نه تھا یعنی جن پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا - مثلاً خوراک حاصل کرنے کے طریقے ، گرمی اور سردی سے محفوظ رهنے کے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کرنا یا بنانا - لباس کی فراهمی ، کاشت کرنے ، شکار کھیلنے اور دوسرے ضروری کاموں کے لیے هتھیار اور آلات تیار کرنا - اس ابتدائی دور میں ان کی توجه لازماً مادی اشیا اور ضروریات تک محدود تھی - لیکن کچھ زمانے کے بعد مختلف قبیلوں میں رسم و عبادات ، قانون ، معاشرت کے طریقوں ، گیتوں اور بھجنوں کا مجموعه تیار هو گیا - اور یه ظاهر ھے که یه چیزیں بھی والدین یا خاندان کے بزرگوں نے خود هی براہ راست بچوں نو سکھائی هوں گی - یه تعلیم کی وہ منزل ھے جس کو مورخین

نے "بےضابطہ تعلیم" [1] کے نام سے موسوم کیا ہے اور ابتدا میں تعلیم کی محض یہی ایک صورت تھی - اس وقت پیشوں اور صنعتوں وغیرہ کی تعلیم نوجوان بلاواسطہ عملی طور پر حاصل کرتے تھے یعنی سوسائٹی کے کار و بار میں براہ راست شریک ہوتے تھے - نظاری تعلیم جو ابھی تک موجود نہ تھی کہ زندگی کے عملی مشاغل سے اس کا تعلق بالکل نظر سے چھپ گیا ہو، انہیں خاندان ہی میں دی جاتی تھی - لیکن جب رفتہ رفتہ انسان نے اپنے ذوق تجسس کی وجہ سے گرد و پیش کے مظاہر اور اشیا پر توجہ کی اور ان کی خاصیتوں اور تعلقات پر غور کرنا شروع کیا تو اس کی معلومات کا ذخیرہ بڑھا اور مختلف "علوم" کی صورت میں مدون ہوا - تب سوسائٹی کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ علوم باقاعدہ طریقے پر بچوں اور نوجوانوں تک پہنچائے جائیں، کیونکہ اب کام کی وسعت اور ذمہ داری اتنی ہو گئی تھی کہ خاندان کے افراد اپنے اور لازمی مشاغل کے دوران میں ضمناً اس تعلیمی فرض کو انجام نہ دے سکتے تھے - اس ضرورت سے مجبور ہوکر "مدرسے" قائم کئے گئے جہاں بعض لوگ، جو اسی غرض سے دوسرے معاشی فرائض سے سبکدوش کر دیے گئے تھے خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے کہ انہیں نہ صرف تمام مفید ہنر اور عملی کام سکھائیں جو زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہیں بلکہ ان نظاری علوم سے بھی روشناس کریں جو برابر نشو و نما پا رہے تھے اور انسان کی واقفیت اور قوت

---

[1] Informal Education—1

میں اضافہ کر رہے تھے - اس طرح تمدنی زندگی کے نظام میں مدرسے نے اپنے لیے جگہ پیدا کی - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس صورت حال پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :—

" جوں جوں تمدن کو ترقی ہوتی ہے بچوں کی صلاحیتوں اور بڑوں کے کار و بار میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوتی جاتی ہے اور بچوں کے لیے یہ بہت مشکل ہوتا جاتا ہے کہ بجز ان مشاغل کے جو بہت سادہ اور آسان ہیں، بالغوں کے کاموں میں براہ راست شریک ہوکر کچھ سیکھ سکیں - بالغوں کے کام اکثر اتنے پیچیدہ اور بچوں کی سمجھ سے اس قدر بعید ہوتے ہیں کہ وہ کھیل میں ان کی نقل اتار کر ان کے منشا اور مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے - اس لیے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بچے بڑے ہوکر سوسائٹی کے کار و بار میں مفید طریقے پر شرکت کریں تو یہ ضروری ہے کہ انہیں پہلے سے اس مقصد کے لیے تعلیم دی جائے - اس غرض کو مد نظر رکھ کر باضابطہ تعلیم گاہیں قائم کی جاتی ہیں تعلیمی وسائل اور نصاب وغیرہ کی ترتیب عمل میں آتی ہے اور ضروری چیزوں کے پڑھانے کا کام ایک خاص جماعت کے سپرد کر دیا جاتا ہے ....جوں جوں سوسائٹی کے ذرائع اور وسائل زیادہ وسیع اور اس کا نظم و نسق زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے مروجہ باضابطہ تعلیم کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے [۱] - "

جب مروجہ مدارس قائم ہو گئے تو ان کے نصاب ر

۱— Democracy and Education صفحہ ۹ -

داخلی تنظیم میں بھی سوسائٹی کی ترقی اور پیچیدگی کے لحاظ سے تبدیلیاں شروع ہوئیں اور ان میں نئے نئے علوم اور مضامین داخل ہوتے گئے - ابتدا میں ان کی تعلیم یقیناً چند مفید دستکاریوں اور رسوم و عقائد کے سکھانے تک محدود ہوگی - لیکن جب علم انسانی میں اضافہ ہوا اور وہ ضبط تحریر میں لایا گیا تو لکھنے پڑھنے کی اہمیت زیادہ ہو گئی کیونکہ نوشت و خواند کی قابلیت اب حصول علم کی کنجی سمجھی جانے لگی - ویلن ٹائن ڈیوس (Valentine Davis) اپنی کتاب "The School Idea" (مدرسے کا تصور) میں ان عناصر کے اضافے کا ذکر کرتا ہے :—

"جب انسان کے علم و عقل میں ترقی ہوئی اور اس کو فرصت ، علمی غور و فکر ، اور تخیل کی بلند پروازی کے مواقع نصیب ہوئے تو ادب موسیقی ، آرٹ اور رقص بطور نئے فنون کے مدرسے کے نصاب میں داخل کیے گئے - اس کے بعد اس نے مروجہ ضابطۂ عمل (یعنی قانون) ، صحیح یا پسندیدہ طرز عمل (یعنی اخلاق) اور ایمان بالغیب (یعنی مذہب) کو علم و تہذیب کے دائرے میں شامل کر لیا - جب بچوں کو یہ علوم سکھائے گئے اور انہیں انسانیات کو مناسب طریقے پر سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کی تعلیم دی گئی تو مدرسے کے موجودہ تصور کی تکمیل ہوگی [۱] - "

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسے کا ابتدائی تصور

---

[۱] — صفحہ ۱۲ -

کیا تھا - اس سے مراد تھی ایک ایسی درسگاہ جہاں طالبہ وہ مفید علوم حاصل کرتے تھے جو زندگی کی بقا اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے اور جن سے ان کے ذوق تجسس کی بھی تھوڑی بہت تشفی ہو جاتی تھی - جب مدرسے کے تصور کی تکمیل ہو گئی تو اس میں طالبہ' علم کو بغیر کسی خارجی غرض کے بھی حاصل کرنے لگے کیونکہ اس سے ان کے نفس کی تہذیب اور ذہن کی تربیت ہوتی تھی اور زندگی کی معنویت میں اضافہ ہوتا تھا - مختصر یہ کہ مدرسے کی توجہ تین قسم کے علوم کی جانب تھی - ایک وہ جو طالبہ کو حصول معاش اور مادی زندگی کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے' دوسرے وہ جو ان کی عقلی اور ذہنی تربیت میں معین ہوتے تھے' تیسرے وہ جو ان کی اخلاقی تربیت اور سیرت کی تشکیل میں مدد دیتے تھے - اس تدریجی ارتقاء کے ابتدائی دور میں تعلیم کے افادی پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا کیونکہ اس سے براہ راست زندگی کی مادی ضروریات پوری ہوتی تھیں جب علوم کو ترقی ہوئی اور معلمی نے ایک مستقل پیشے کی صورت اختیار کرلی تو نظری اور ذہنی امور پر زیادہ توجہ ہونے لگی یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں "مدرسہ" کا لفظ "جائے درس" کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور درس کے معنی کتابی اور زبانی تعلیم قرار پا گئے - ہمارے ملک میں ابتک اور گزشتہ صدی کے تعلیمی انقلاب سے قبل تقریباً تمام ملکوں میں "مدرسہ" کا یہ مفہوم تھا کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں طالبہ کو چند خاص مضامین پڑھائے جاتے ہیں' جنھیں معلم

یا والدین اپنے نقطۂ نظر سے ضروری سمجھتے ہیں اور جن میں ان کے خیالات کی نشو و نما اور کسی حد تک زمانے کی رفتار کے مطابق ترمیم اور تبدیلی ہوتی رہتی ہے -

مدرسے کے اس تصور کا انحصار چند ایسے فرضوں پر ہے جن کی تنقید کرنا ضروری ہے کیونکہ موجودہ نظریۂ تعلیم کو ان سے اختلاف ہے - اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ علمی ترقیوں اور انسانی زندگی کی موجودہ تنظیم کو مد نظر رکھتے ہوئے قدیم غیرمرتب تعلیم ہماری ضروریات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی - وہ تعلیم جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں عملی زندگی میں براہ راست دی جاتی تھی اور اس کا دائرہ بہت ہی محدود تھا - اس کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجودہ تمدنی ذخیرے اور علمی اور عملی خزانے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرنا ممکن نہیں - آج کل کے باضابطہ مدارس میں جو تعلیم کتابوں اور تحریری علوم کے ذریعے دی جاتی ہے اس سے طالبہ کا تجربہ بہت وسیع ہوتا ہے - وہ نہ صرف اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے بلکہ قدیم تصانیف کے مطالعے کے ذریعے تمام عہد کے بہترین تمدنی علمی اور ادبی کارناموں سے واقف ہو جاتے ہیں - لیکن جہاں مدرسے کی اس نئی تنظیم سے تعلیم میں وسعت اور باقاعدگی پیدا ہوئی ہے وہاں بعض خطرے بھی پیش آئے ہیں - انسان نے اپنی واقفیت اور علم کو محض اپنے حافظے میں یا عمل کی صورت میں محفوظ نہیں رکھا بلکہ وہ اس کو ضبط تحریر میں لے آیا ہے - اس لیے وہ تمام حقائق اور اصول جو بڑے بڑے طویل تجربوں کا نچوڑ ہیں محض چند اصطلاحات یا علامات کی

ذریعے بیان کئے جا سکتے ھیں - جو شخص ان تجربوں کو بذات خود حاصل کر چکا ھے اور ان حقائق کا محرم ھے جنھیں یہ علامات ظاھر کرتی ھیں وہ ان سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ھے - اس کی نظر میں ان کی وھی حیثیت ھے جو ایک ماھر فن کے نزدیک مختصر نویسی کی یادداشتوں کی ھوتی ھے - وہ ان اشارات پر نظر ڈالتا ھے اور اس کے ذھن میں وہ تمام تجربات اور واقعات تازہ ھو جاتے ھیں جن کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر چند نشانات بنا لیے تھے - لیکن ھم اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ شخص جو ان تجربوں سے بالکل محروم رھا ھو اور جسے ان واقعات کے مشاھدے کا موقع نہیں ملا ان الفاظ اور علامتوں سے اتنا ھی فائدہ اٹھا سکتا ھے - ممکن ھے کہ وہ اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر قیاس سے کام لے کر لفظوں اور علامتوں کو ایک حد تک معنی پہنا سکے لیکن جب تک وہ خود ان نتائج تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرے گا جو ان الفاظ و علامات میں ظاھر کئے گئے ھیں، اس کے علم میں اصلیت کا رنگ پیدا نہیں ھوگا - اگر یہ بات صحیح نہ ھوتی تو قطب شمالی کے ایک تجربہ‌کار سیاح کو وھاں کے حالات کا جتنا حقیقی علم ھے اتنا ھی ایک نوعمر لڑکے کو ھوتا جو پڑھنا سیکھ کر اس سیاحت کا سفرنامہ غور سے شروع سے آخر تک پڑھ لے - لیکن واقعہ یہ ھے کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ سیاح کی نظر کے سامنے گوناگوں تجربات کی ایک دنیا لاکر کھڑا کر دیتا ھے اور اس کا ذھن فوراً الفاظ سے حقائق کی طرف منتقل ھو جاتا ھے - بر خلاف اس کے لڑکا کتاب کو

اسی حد تک سمجھتا ھے جس حد تک اس کا محدود تجربہ ان الفاظ میں جان ڈال سکے اور اس کے نفس میں وہ ذھنی اور جذباتی کیفیتیں پیدا کر سکے جو الفاظ کے پردے میں پوشیدہ ھیں - اگر بالفرض اس کو ان حالات کا ذرا سا بھی واقعی علم یا تجربہ نہیں ھے تو سفرنامے کے الفاظ اس کے لیے محض اتنی ھی اھمیت رکھتے ھیں کہ وہ اس کے بعض حواس کو عارضی طور پر متاثر کرتے ھیں اور بس - زیادہ سے زیادہ یہ ھو سکتا ھے کہ اگر اس کا سابق علم وسیع اور تخیل پر زور ھے تو قیاس کے ذریعے سے چند کم و بیش مبہم تصویریں اس کے دماغ کے سامنے آجائیں - اسی طرح کیمیا کی کتاب میں یہ پڑھ لینا کہ کاربونک ایسڈ گیس ' کاربن اور آکسیجن کے ایک خاص تناسب سے ملنے سے بنتی ھے بغیر عملی تجربے اور مشاھدے کے ایسا ھی ھے جیسا کوئی جادو کے منتر کو دھرائے - ان مثالوں سے واضح ھو جاتا ھے کہ ذاتی تجربے کی پشت پناھی کے بغیر لفظی تعلیم ناکافی ھے - معلومات جب تک برتی نہ جائے اور عمل کی کسوٹی پر پوری نہ اترے اسے علم کا درجہ نصیب نہیں ھوتا -

یہ بات بظاھر اتنی صاف اور سیدھی معلوم ھوتی ھے کہ شاید کوئی شخص اس سے انکار نہ کرے گا - لیکن عملاً مدرسے صدیوں سے اس حقیقت کو نظرانداز کرتے رھے ھیں - انھوں نے ذاتی اور بلاواسطہ تجربے کے بجائے الفاظ کی تعلیم کو اپنا منتہائے نظر بنا لیا ھے بلکہ بالواسطہ تجربے کو بھی اپنے نصاب سے بڑی حد تک خارج کر دیا ھے - ابتدائی بےضابطہ تعلیم کا میدان تنگ ضرور تھا لیکن اس میں فائدہ یہ تھا کہ اس

کے ذریعے بچے سوسائٹی کے مشاغل میں براہ راست شریک ہو کر، یا کھیل میں اس کی نقل اتار کر، جو معلومات بہم پہنچاتے تھے وہ مستقل طور پر ان کی ملکیت اور ان کی شخصیت کا جزو بن جاتی تھی، وہ اس کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کیونکہ وہ ذاتی کاوش اور عملی تجربے سے حاصل کی ہوئی چیز ہوتی تھی - جب کتابی تعلیم کا دور شروع ہوا تو علم کا تعلق روزمرہ کے کاروبار اور تجربات سے کم ہونے لگا، مدرسے میں الفاظ اور اصطلاحات پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور اس کا یہ اصل مقصود پس پشت ڈال دیا گیا کہ وہ طالبہ کے لیے مفیدترین اور اہم‌ترین تجربات کے مناسب مواقع بہم پہنچائے - زمانۂ حال کے بہت سے تعلیمی مفکرین نے اس خرابی کو محسوس کیا ہے اور تعلیم جدید کی کوشش یہ ہے کہ مدرسے اور زندگی کا ٹوٹا ہوا رشتہ نئے سرے سے جوڑا جائے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے فلسفۂ تعلیم کا مقصد تمام‌تر یہی ہے - وہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"ترقی یافتہ تمدن میں جو باتیں بچوں کو سیکھنی ہوتی ہیں وہ زیادہ‌تر اصطلاحی علامتوں کی شکل میں مرتب اور محفوظ ہوتی ہیں - انہیں معمولی جانی بوجھی چیزوں اور کاموں کی صورت میں تبدیل نہیں کرتے، اس قسم کا تعلیمی مواد زیادہ‌تر سطحی اور اصطلاحی ہوتا ہے اور حقیقی واقعات اور زندگی کے مقابلے میں اصلیت سے خالی نظر آتا ہے - اصلیت کا معیار یہ ہے کہ کسی چیز کو عملی معاملات سے کس حد تک تعلق ہے - اس تعلیمی مواد کی ایک علحدہ دنیا ہوتی ہے، جہاں خیال

اور اظہار خیال کے عام طریقے کام نہیں دیتے - اندیشہ یہ ہے کہ مدرسوں کے نصاب پر رسمی تعلیم کا مواد حاوی ہو جائے گا' اس کا ربط زندگی کے تجربات سے قائم نہ ہوگا' مستقل معاشرتی مقاصد نظرانداز کر دیے جائیں گے اور ان چیزوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہوگی جن کی تمدنی زندگی کے نظام میں کوئی جگہ نہیں بلکہ ان کا تعلق محض اصطلاحی علوم سے ہے - اس طرح ہمیں تعلیم کا عام مروجہ تصور حاصل ہوتا ہے جس میں اس کی معاشرتی غرض اور نتائج فراموش کر دیے جاتے ہیں اور اس کا لحاظ نہیں رہتا کہ تعلیم کا موضوع انسانوں کے وہ تمام باہمی تعلقات اور مراسم ہیں جو ہماری شعوری زندگی پر اثر ڈالتے ہیں بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم دور از کار معاملات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے اور لفظی علامتوں کے ذریعے علم سکھانے کا نام ہے - گویا وہ محض نوشت خواند تک محدود ہے - لہذا فلسفۂ تعلیم کا ایک اہم‌ترین مسئلہ یہ ہے کہ ارادی اور غیر ارادی' رسمی اور اصلی تعلیم میں کسی طرح مناسب توازن قائم رکھا جائے - محض معلومات کا ذخیرہ بہم پہنچانے اور اصطلاحی اور ذہنی مشق حاصل کرانے سے انسان کے نفس میں معاشری احساس پیدا نہیں ہوتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کے تجربات معنویت سے خالی ہوتے ہیں اور مدرسے میں طلبہ جو کچھ سیکھتے ہیں اس سے ان میں محض ایک خاص قسم کی تیزی اور ہوشیاری اور ماہرین خصوصی کی سی خودپسندی پیدا ہوجاتی ہے - جوں جوں مدرسہ محض ایک اصطلاحی

درس گاہ بنتا جاتا ہے - یہ مسئلہ زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے کہ
تعلیم کے ان دونوں پہلوؤں میں کس طرح تعلق قائم رکھا جائے،
یعنی اس چیز میں جو لوگوں نے بالارادہ کوشش کرکے سیکھی ہے
اور اس میں جو انھوں نے غیر محسوس طریقے پر دوسروں کے
ساتھ میل جول کے ذریعے اپنی طبیعت اور سیرت کی تشکیل
کے دوران میں حاصل کی ہے" ۱ -

ان الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسۂ جدید اور
مروجہ مدارس کا پہلا نمایاں فرق کیا ہے - مدرسہ محض ایک
جائے درس نہیں، جہاں ہم سوسائٹی کی زندگی اور مشاغل
سے قطع نظر کرکے طلبہ کے دماغوں میں اصطلاحی معلومات کا
ذخیرہ جمع کرتے ہیں، جس کا ان کی روزمرہ کی زندگی
پر کوئی اثر نہیں پڑتا - مدرسہ دراصل وہ ماحول ہے جہاں
بچوں کی زندگی کے گوناگوں اور پیچیدہ تجربات ایک
منتخب اور منظم شکل میں حاصل ہوسکتے ہیں - اگر
وہ ان تجربات کو براہ راست حاصل کرتے تو اس میں بہت
وقت ضائع ہوتا اور یہ باقاعدگی اور نظم پیدا نہ ہوسکتا -
مدرسہ جدید کا ایک اساسی اصول تجربے کی اہمیت کا
احساس ہے اور موجودہ تعلیمی طریقوں کی ایک نمایاں
خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم کی بنیاد ذاتی اور
بلاواسطہ تجربے پر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی مکتبی زندگی
اصلی اور عملی زندگی بن جائے -

اس نقطۂ نظر سے مدرسہ ایک ایسا ماحول ہے جس کا

---

۱ Democracy and Education— صفحہ ۱۰

مقصد اول یہ ہے کہ طلبہ اس میں عمدہ اور خوشگوار زندگی بسر کریں اور ثانوی مقصد یہ ہے کہ اس زندگی کے دوران میں بعض مفید علوم اور ہنر حاصل کریں - مدرسے میں بچہ محض پڑھنے لکھنے کے لیے نہیں آتا بلکہ اپنا وقت ایسے خوشگوار، مفید اور محنت طلب مشاغل میں صرف کرنے کی غرض سے جو اس کے شوقوں کو ابھاریں اور ان کی ابتدائی غیر منظم شکل کو بدل کر ان میں ترتیب اور نظام پیدا کریں - یہ خیال ایک تعلیمی انقلاب کا پیش خیمہ ہے - اس کو تسلیم کرنے سے مدرسے کے مروجہ طریقۂ تعلیم اور نصاب اور ضبط و نظام میں بہت کافی ترمیم لازم آتی ہے - عام طور پر مدرسوں اور تعلیمی افسروں نے مدرسوں کی تنظیم ایک محدود علمی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کی ہے تاکہ طلبہ لکھنا پڑھنا اور چند ضروری مضامین سیکھ لیں - لیکن اگر ہم مدرسے کو زندگی کے تجربات کا مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں بچے آزادی کے ساتھ مختلف قسم کے کام کریں آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے واقفیت حاصل کریں، اپنے لیے وہ مشاغل انتخاب کریں جو ان کی طبیعت کے رجحان سے موافق ہوں اور انہیں تنہا یا دوسروں کی مدد سے تکمیل کو پہنچائیں اس میں ایسے محرکات موجود ہونے چاہئیں جو خود بخود رفتہ رفتہ طلبہ کو مختلف قسم کے علمی اور عملی مقاصد کی طرف کھینچیں اور وہ وسائل اور ذرائع بھی جو ان مقاصد کو انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوں - اگر ہم یورپ یا امریکا کے کسی ''مدرسۂ جدید'' کا معائنہ کریں، (اس قسم کے

بہت سے مدارس اس زمانے میں انگلستان، جرمنی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں) تو ہمیں اس کی ظاہری حیثیت ساز و سامان اور عمارتوں ہی سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ قدیم نظام تعلیم بالکل بدل گیا ہے - جہاں پہلے سوائے چند دریوں، یا بنچوں، میزوں، کرسیوں کتابوں اور نقشوں کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی، وہاں اب حسب استطاعت سائنس اور دستکاریوں کے لیے بڑے بڑے معمل، مشینیں، جانوروں اور پودوں کے نمونے، باغات، تیراکی کے لیے حوض، ورزش کے لیے جمنازیم، عمدہ عمدہ تصویریں، طلبہ کے آرام کرنے کے لیے کمرے، جلسہ گاہیں، بڑے بڑے کتب خانے جہاں علاوہ درسی کتابوں کے مستند تصانیف، حوالے کی کتابیں فرصت میں پڑھنے کے دلچسپ قصے وغیرہ، غرض وہ تمام چیزیں ملیں گی جو مدرسوں سے باہر متمدن ممالک کے باشندوں کو نصیب ہیں یا ہونی چاہییں - اس تکلیف اور اہتمام کا مقصد نمود نہیں بلکہ یہ ہے کہ طلبہ مدرسے کی زندگی کے دوران میں اپنا وقت اس طرح صرف کریں کہ ان کی زندگی تجربات سے مالا مال ہو، جو ان کے لیے خوشی کا سرمایہ ہوں، ان کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو نشو و نما دیں اور ان کو آگے چل کر تمدنی زندگی میں شرکت کرنے کے قابل بنائیں -

ہم ایک گزشتہ باب میں اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ بچوں سے کسی مستقبل بعید کی خاطر کام کرنے کی توقع رکھنا سراسر نادانی ہے - نفسیات کی تعلیم اور روزمرہ کا تجربہ دونوں اس کی تردید کرتے ہیں - بالغ، تجربہ‌کار لوگ ہی جو اپنے برے بھلے کو سمجھ سکتے ہیں اور اپنے پختہ تجربے اور

تخیل کی وجہ سے مستقبل کا زیادہ واضح تصور کرسکتے ھیں، بالعموم بعید مقاصد اور اغراض کی خاطر کام کرنے کو تیار نہیں ھوتے - پھر بچوں سے یہ کیسے توقع ھوسکتی ھے کہ وہ اپنے فوری اور موجودہ شوق اور دلچسپیوں سے منہ موڑ کر دور و دراز مقاصد اور امیدوں کی خاطر، ایسے کاموں میں اپنا دل لگائیں جو ان کو بذات خود اچھے نہیں معلوم ھوتے "اچھے" سے ھماری مراد یہ نہیں، کہ وہ بالغوں کے نقطۂ نظر سے اخلاقی خوبی رکھتے ھوں - بچوں کے لیے ھر وہ کام "اچھا" ھے جس میں انھیں اپنی بڑھتی ھوئی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے اور اس سے انھیں خوشی اور احساس قوت حاصل ھو - تعلیم کا یہ کام ضرور ھے، جیسا کہ ھم پہلے کہہ چکے ھیں، کہ وہ بچوں کو زندگی کے لیے تیار کرے لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ھمیشہ کسی آنے والے زمانے کی یاد سے بچوں کو بہلاتی رھے - اس کی بہترین تدبیر یہ ھے کہ بچپن اور نوجوانی کے زمانے میں ان کے لیے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں کہ وہ اپنی فطرت اور جبلی خواھشات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مفید عادتیں اور علم و ھنر سیکھیں - معلم کو چاھیے کہ ھمیشہ بچوں کی زندگی اور موجودہ رجحانات کو نقطۂ آغاز بنائے کیونکہ فطرتاً ان کی دلچسپی کا مرکز زمانۂ حال ھوتا ھے - ان کی نظر میں مستقبل کی کوئی فوری اور شدید اھمیت نہیں ھوتی - اگر ان کے مطالعے اور مشاغل کے لیے ایسی چیزوں کو عمل کا محرک بنایا جائے جو ان کی نفسی کیفیت اور خصوصیات کے ساتھ وابستہ ھیں اور ان کی موجودہ زندگی کو دلچسپ اور معنی خیز بناتی ھیں تو وہ مدرسے میں

اپنی پوری جسمانی اور ذہنی قوت کام میں لائیں گےورنہ وہ پڑھنے لکھنے کا کام بے دلی سے بغیر مقصد کو سمجھے ہوئے کریں گے اور اُن کی ذہنی حالت میں انتشار رہے گا - معلم کو مجبور ہوکر ان تحریصوں اور ترغیبوں سے کام لینا پڑے گا جو مضرت سے خالی نہیں - کبھی وہ انہیں سزا کی دھمکی دے گا' کبھی امتحان میں ناکامی کی بھیانک تصویر دکھائے گا' کبھی والدین اور دوستوں کی ناراضگی اور شرمندگی اور آگے چل کر خود ان کی پشیمانی اور افسوس , کا خیال دلائے گا' یہ نہیں تو طرح طرح کے لالچ سے انہیں پھسلائے گا - نمبروں کا اور درجے کا خبط جو ہمارے نظام تعلیم پر اس درجہ حاوی ہے' انعاموں کی تقسیم اور اس قسم کی حد سے زیادہ اہمیت طلبہ کی باہمی مسابقت اور اس قسم کی تمام چیزیں جو ہمارے مدرسوں کے نظام کا جزو ہو گئی ہیں سب کی ضرورت اسی وجہ سے پڑتی ہے کہ طلبہ کو اپنے مقررہ کام سے کوئی واقعی نفسی تعلق نہیں ہوتا کیونکہ اس کی بنیاد ان کے شوق اور جبلت' ان کی خواہش عمل اور ان کے ذوق تجسس پر نہیں رکھی گئی - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں کام کو کام کی خاطر کرنے کی خواہش اور اس سے خوشی حاصل کرنے کا مادہ پیدا نہیں ہوتا - ان کی خواہش عمل مردہ ہوجاتی ہے اور وہ تمام عمر اس کا خمیازہ بھگتتے ہیں - غرض کام کو کسی خارجی مقصد کی خاطر جبراً طلبہ پر عائد کرنا تعلیمی اور نفسی اعتبار سے سراسر قابل اعتراض ہے - اگر طلبہ کا ماحول سازگار ہو' جو کام ان کے لیے تجویز کیا گیا ہے وہ اُن کے رجحانات سے مناسبت رکھتا ہو اور مقصد کار ان کی سمجھ اور استعداد

سے باہر نہ ہو تو ان کی طبیعت میں مطالعے کا شوق اور علم و ہنر حاصل کرنے کی خواہش خود بخود پیدا ہوگی۔ مدرسے کے اندر باہر کے حالات ایسے ہوں کہ ان میں بچے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اُٹھا سکیں تو مستقبل کے لیے اہتمام اور فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں - معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ اُن کے موجودہ مشاغل اور تجربات کو جس قدر پر معنی اور سبق آموز بنا سکے بنائے، یعنی ان کا سلسلہ تمدنی حالات مواقع اور محرکات عمل سے ملا دے - اور ان کی تربیت اور تنظیم اس طرح کرے کہ وہ نہ صرف بچوں کی موجودہ خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کرسکیں بلکہ آگے چل کر اپنی مکمل شکل میں افراد اور سوسائٹی دونوں کے لیے مفید ثابت ہوں -

مدرسے کا یہ جدید تصور علم حاصل کرنے کے طریقے پر بھی روشنی ڈالتا ہے - علم اور زندگی میں جو فصل پیدا ہو گیا ہے اس کی وجہ سے مدرسوں میں تحصیل علم مقصود بالذات بنائی گئی ہے اور اس کے لیے بعض اصطلاحی طریقے تجویز کیے گئے ہیں - وہاں بچوں کا کام ہے پڑھنا، لکھنا تاریخ جغرافیہ، ریاضی وغیرہ درسی مضامین کا مطالعہ کرنا - انہیں اس سے کچھ غرض نہیں کہ اس تمام محنت اور کاوش کا جو ان مضامین کے یاد کرنے میں اٹھانی پڑتی ہے ان کی موجودہ یا آئندہ زندگی سے کیا تعلق ہے - حروف تہجی کا پہچاننا بھی ان پر اسی طرح فرض ہے جیسے مثلاً پانی پت کی لڑائیوں کی تاریخ یاد رکھنا یا امریکا کے دریاؤں کے نام جاننا - ہمیں ان مضامین کی اہمیت سے انکار نہیں، بلکہ کوئی سمجھدار

انسان بھی اس سے منکر نہیں ہوگا - لیکن خرابی یہ ہے کہ یہ سب مضامین ان کی نمو پذیر زندگی اور تجسس پسند طبیعت میں خود بخود جذب ہونے کے بجائے ان پر استادوں یا محکمۂ تعلیم کی طرف سے ایک مقررہ نصاب کی شکل میں عائد کر دیے جاتے ہیں - طلبہ کے لیے ان کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے - اس صورت میں ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان علوم کو حاصل کرنے سے ان کی عملی یا ذہنی زندگی پر کوئی اثر پڑے گا یا وہ ان کی تحصیل میں اپنی خوشی اور شوق سے محنت کریں گے - موجودہ اصول تعلیم اس بارے میں یہ ہے کہ علم صرف اس صورت میں مفید اور پائدار ہو سکتا ہے جب اس کی ضرورت قدرتی طور پر زندگی کے مشاغل اور کار و بار کے دوران میں پیدا ہو اور طالب علم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسے حاصل کرے - ہماری روزمرہ کی تمدنی زندگی میں بھی اصول کارفرما ہے اور لوگ جو کچھ سیکھتے ہیں وہ انہیں حالات اور شرائط کے ماتحت سیکھتے ہیں - ہم کسی راہ چلتے شخص کو خواہ مخواہ جبر و مقابلہ یا سائنس کے مطالعے پر آمادہ نہیں کر سکتے - برخلاف اس کے اگر اس کے مشاغل زندگی ایسے ہیں کہ اسے اپنے فرائض کی ادائگی کے لیے جبر و مقابلہ یا سائنس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ خوشی کے ساتھ انہیں حاصل کرے گا - اور چاہے جتنی محنت کرنا پڑے اس سے جی نہیں چرائے گا - لیکن بغیر ان علوم کی ضرورت محسوس کیے بغیر اپنی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق پہچانے وہ ہرگز ان کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنائے گا - وہ لوگ بھی جو دراصل "علم کو علم

کی خاطر" حاصل کرتے ہیں اپنے ذوق تجسس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس منزل تک پہنچتے ہیں جہاں وہ علم کو مقصود بالذات بنا سکیں اور ان کے لیے کسی علم کے میدان میں جدید تحقیقات کرنا واقعاً ایسا ہی "مفید" اور تشفی بخش ہوتا ہے جس طرح مثلاً کسی موچی کے لیے چمڑا رنگنے کا ایک نیا اور بہتر طریقہ معلوم کرنا - ان کے لیے "افادے" کا مفہوم عام لوگوں سے مختلف ہو جاتا ہے - جب سوائے بڑے بڑے عالموں کے کسی شخص کے لیے بھی یہ بات آسان نہیں کہ تحصیل علم کو اپنا مقصود زندگی بنا سکے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بچے جن کی توجہ بہت منتشر اور نظر بہت محدود ہوتی ہے سالہا سال محض تحصیل علم کو اپنا منتہائے نظر بنا کر مدرسے کے پہلے چند سال میں جب خاص طور پر اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بچوں کے درسی مشاغل ان کے لیے دلچسپ بنائے جائیں اور وہ اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ حصول معاش کی آرزو ان کی محرک عمل بن سکے' ان کے سامنے بالعموم کوئی ایسا مقصد پیش نہیں کیا جاتا جس کو وہ سمجھ سکیں عام طور پر لوگ نئی چیزیں اور نئے ہنر اس طرح سیکھتے ہیں کہ وہ کسی کام میں مشغول ہوتے ہیں جو بنفسہ ان کو مرغوب ہے اور اس کی ضمن میں یا اس کے نتیجے کے طور پر کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی ہے - اس اصول کو واضح کرنے کے لیے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) ایک چھوٹے بچے کی مثال دیتے ہیں کہ وہ چلنا یا بولنا کس طرح سیکھتا ہے - بچہ شعوری طور پر یہ ارادہ کر کے بات چیت نہیں کرتا کہ میں گفتگو کا فن سیکھ لوں

یا یہ قصد کر کے نہیں چلتا کہ مجھے چلنا پھرنا آ جائے بلکہ اسے خود بخود دوسرے لوگوں کے ساتھ میل جول کرنے ان سے تعلقات قائم کرنے کی خواہش ہوتی ہے - وہ اس فطری خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں پہلے اپنے توتلے پھوٹے الفاظ کے ذریعے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے - اس کے بعد آهستہ آهستہ پیہم کوشش اور مشق کے دوران میں اسے بے تکلف بات چیت کرنی آ جاتی ہے - اس طرح اسے خواہش ہوتی ہے کہ بڑھ کر کھلونے کو یا کسی اور چیز کو ہاتھ میں لے' یا اپنے کسی عزیز کے پاس جائے' یا ایسی ضرورت آ پڑتی ہے کہ اپنی جگہ سے ہٹ کر کسی بہتر اور زیادہ محفوظ جگہ پہنچ جائے - اس خواہش یا نفسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ حرکت شروع کرتا ہے - پہلے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہے اس کے بعد جب مشق بڑھ جاتی ہے تو کسی قدر تیزی اور روانی پیدا ہو جاتی ہے - یہاں تک کہ چلنا پھرنا اس کا روزمرہ کا معمول ہو جاتا ہے' جس سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق کام لیتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لیے سیر و سیاحت کرنا خود ایک دلچسپ اور پر لطف مشغلہ بن جاتا ہے - ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ ہم بچوں کی نفسی کیفیات اور اعمال کا مطالعہ کریں یا بڑوں کی حرکات کو دیکھیں' دونوں صورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ کسی عمل یا مشغلے کے دوران میں بطور اس کے ضمنی نتیجے کے سیکھتا ہے - وہ کسی خاص ہنر کی تحصیل کو اپنا مقصد نہیں بناتا - برخلاف اس کے ہمارے

مدرسوں میں عام طور پر اس قدرتی اور معقول طریقے کے بجائے دور از کار اور خلاف فطرت طریقے استعمال کیے جاتے ہیں - بچے کی توجہ ہمیشہ براہ راست ان چیزوں کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے جو انہیں سیکھنی ہیں - خواہ وہ بالکل نہ سمجھیں کہ ان کی زندگی اور مشاغل سے ان کا کیا تعلق ہے - نصاب کے مضامین اور معلومات کے ذریعے ان کے ذوق عمل کی تسکین نہیں کی جاتی کہ ان میں مفید عادتیں پیدا ہوں، ان کی قوت اور بصیرت میں اضافہ ہو اور وہ اپنی دماغی ترقی اور نشو و نما کے احساس سے خوشی حاصل کریں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی معلومات بالکل سطحی اور سرسری رہ جاتی ہیں اور ان کے افعال و اخلاق پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا -

مدرسۂ جدید کی جو خصوصیت ہم نے اوپر بیان کی ہے اس کی تشریح چند مثالوں سے ہو جائے گی - بچوں کو فطرتاً کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے اور ہر گھر میں ماں یا بہن چھوٹے بچوں کو کہانیاں سناتی ہیں - جب بچہ کسی ایسے مدرسے میں داخل ہوتا ہے جو معقول تعلیمی اصولوں پر چلایا جا رہا ہے تو معلم اس شوق کو تعلیم کا محور بنا کر اسے طرح طرح کی دلچسپ کہانیاں سناتا ہے جو اس کی معلومات اور رجحانات میں غیر محسوس طور پر وسعت پیدا کرتی ہیں - پھر ممکن ہے وہ بجائے زبانی کہانیاں سنانے کے کسی کتاب میں سے کہانیاں پڑھ کر سنائے - اگر کہانیوں کا انتخاب صحیح اور موزوں ہے تو بچے کو یقیناً اس سے دلچسپی پیدا ہو گی، اور وہ خود انہیں کہانیوں کو یا

اپنی بنائی ہوئی کہانیوں کو اپنے ساتھیوں کو سنائے گا اور اس کی بدولت اس کی قوت بیان کی تربیت ہوگی - رفتہ رفتہ اس میں یہ خواہش بھی پیدا ہوگی کہ وہ خود ان کہانیوں کو کتابوں میں پڑھ سکے تاکہ نئی نئی کہانیاں سننے کے لیے وہ استاد کا محتاج نہ رہے اور اس کا کہانیوں کا ذخیرہ بہت وسیع ہو جائے - لیکن وہ اس خواہش کو اس وقت تک پورا نہیں کر سکتا جب تک پڑھنا نہ سیکھے - اگر اس کی طلب صادق ہے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ خود بخود پڑھنے کی طرف مائل ہوگا - اس کو زبردستی حروف تہجی اور ان کی ترکیبوں کی دشوارگزار منزلوں میں سے گھسیٹنا نہیں پڑے گا بلکہ وہ اپنی خوشی سے اور محنت کر کے مشکلات پر قابو پائے گا - کیونکہ ان کو سیکھ لینے سے اسے اپنے ایک ذاتی مقصد کے حصول میں مدد ملے گی - وہ قاعدے کو اور انمل بےجوڑ جملوں کی کتابوں کو اس خیال سے نہیں پڑھے گا کہ اسے پڑھنے کا فن سیکھنا ہے بلکہ اس مقصد سے کہ اس قابلیت کو حاصل کرتے ہی وہ فوراً ان قصوں کو پڑھ سکے گا جن کی خاطر اس نے یہ تمام محنت اُٹھائی ہے - اس کو معلوم ہوگا کہ میرے مطالعے کا کیا مقصد اور کیا فائدہ ہے اور وہ قدرتاً یہ محسوس کرے گا کہ میں مدرسے میں جو کچھ سیکھ رہا ہوں وہ کسی نامعلوم مصلحت یا مستقبل بعید کی خاطر نہیں، بلکہ خود اپنی موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہے - یہی حال حساب کے اور تمام مضامین کا ہے ان کے مطالعے کو چھوٹے بچوں کے لیے ایک مستقل مقصد بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بد شوق اور بے توجہ ہو جاتے ہیں

اور انھیں نصاب بالکل غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے ۔ مدرسۂ جدید کی کوشش یہ ہے کہ وہ بچوں کو ابتدا سے ایسے مشاغل میں لگائے جن کو انجام دینے میں خود بخود اور قدرتی طور پر ان مضامین کو پڑھنے اور سیکھنے کی ضرورت محسوس ہو یعنی وہ اس کے ذاتی تجربات کو وسیع تر اور با معنی بنانے میں مفید ہوں - یہی وجہ ہے کہ منصوبی طریقے (Project Method) میں مدرسے کے کام کی بنیاد ہمارے مروجہ مدارس کی طرح ''سبقوں'' پر نہیں رکھی گئی - ان سبقوں کے بجائے طلبہ مختلف قسم کے باقاعدہ مرتب کیے ہوئے اور خود ان کے پسند کیے ہوئے کاموں (Occupations) پر لگائے جاتے ہیں-ان مشاغل کے دوران میں انھیں اپنے علم اور واقفیت کو بڑھانے اور ہاتھ سے کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور منصوبے بنانے اور ان کو پورا کرنے کے وسائل سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے - مثلاً مدرسے میں دوکان چلانا، پوسٹ آفس قائم کرنا، مکان بنانا، باغبانی کرنا - بچوں کو ایسے کاموں سے فطرتاً دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ یہ اُن کی بعض اہم جبلتوں سے تعلق رکھتے ہیں - اور بالخصوص دو نمایاں نفسی وجحانات، یعنی جبلت تعمیر اور جبلت تعاون کو اظہار کا موقع دیتے ہیں - ان کاموں میں ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنے حواس، اپنے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو ایک مسلسل کام کی تکمیل میں لگاتے ہیں مثلاً کسی تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہیں یا خارجی اشیا اور ذرائع کو مرتب کرکے کوئی مفید نئی چیز تیار کرتے ہیں جس سے ان میں مسرت اور کامیابی کا احساس پیدا ہوتا ہے جو شخصیت کی تربیت میں بےحد مدد دیتا

ہے - اس میں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس قسم کے کاموں میں
ان کو اپنے دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ مل جل کر چیزیں بنانے،
معاملات پر غور کرنے اور منصوبوں کو عمل میں لانے کے موقع
حاصل ہوتے ہیں جس سے ان کی معاشری تربیت عمل میں
آتی ہے - ان تمام مشاغل کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے لیے
انہیں مختلف قسم کی معلومات درکار ہوتی ہے جسے حاصل کرنے
کے لیے وہ بڑے شوق سے اپنے اُستادوں اور دوستوں یا کتابوں کی
طرف رجوع کرتے ہیں - جس طرح ہم اپنی روزمرہ کی زندگی
میں ضرورت کے وقت اخباروں، کتابوں اور دوسرے لوگوں سے
مشورہ لیتے ہیں - اس صورت میں طلبہ کا ریاضی سیکھنا، یا
کسی ملک کا جغرافیہ پڑھنا یا دوکان کا کار و بار چلانے کے لیے
تجارتی معلومات حاصل کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی
روپے کا لین دین کرنے والا یا تھوک فروش اپنی کار و باری ضرورت
سے اخبار میں بازار کے نرخ کا مطالعہ کرتا ہے - اس پر کوئی
شخص جبر نہیں کرتا کہ وہ ان خشک اعداد میں سر کھپائے
لیکن چونکہ اسے اپنی دوکان کی کامیابی کی فکر ہے اس لیے
اس کے نقطۂ نظر سے وہ اعداد و شمار غیر دلچسپ نہیں ہوتے
بلکہ نہایت معنی خیز ہوتے ہیں اور وہ گھنٹوں ان کے مطالعے
میں دماغ سوزی کر سکتا ہے - یہ مثال ان تمام علوم اور
معلومات پر صادق آتی ہے جو لوگ عام طور پر اپنی خوشی
سے حاصل کرتے ہیں - یہ چیزیں واقعی اور حقیقی طور پر ان
کی ملکیت ہو جاتی ہیں اور چونکہ اکثر اور براہ راست
استعمال میں آتی رہتی ہیں اس لیے ان کا اثر ان کی زندگی
اور سیرت پر بھی پڑتا ہے - یہی حال نوعمر بچوں اور نوجوانوں

کا ہے جو بالطبع "مصرف پسند" (pragmatist) اور "افادیت پسند" ہوتے ہیں - وہ ہر چیز کے متعلق یہ سوال کرتے ہیں: اس سے میری ذات کو یا دوسروں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ اس کا مصرف کیا ہے؟ چھوٹے بچے تو ہمیشہ صاف صاف اس قسم کی باتیں پوچھتے ہی رہتے ہیں - یہاں تک کہ شروع میں ان کے ذہن میں ہر چیز کا تصور اسی شکل میں قائم ہوتا ہے کہ اس سے کیا کام نکل سکتا ہے - کرسی ان کے لیے کسی خاص مستقل شے کا نام نہیں وہ "بیٹھنے کے لیے" ایک چیز ہے - کالک یا قلم سرکنڈے کا ٹکڑا نہیں جو ایک طرف سے ترشا ہوا ہو بلکہ "لکھنے کے لیے" ایک آلہ ہے - جب وہ سن شعور کو پہنچتے ہیں تو چاہے صاف طور پر اس قسم کے سوال نہ کریں کہ فلاں چیز یا فلاں مضمون ہمارے کس کام کا ہے - لیکن ہر چیز کی طرف ان کا ذہنی رویہ یہی رہتا ہے - اس لیے عام مشاہدے اور نفسیات دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ابتدا میں طلبہ کے سامنے تمام مضامین اس طرح پیش کیے جائیں کہ وہ ان کا "فائدہ" محسوس کریں اور جو کچھ معلومات حاصل کریں وہ ان کی اپنی زندگی سے بعید اور بے ربط نہ ہوں بلکہ ان کی دلچسپیوں اور مشاغل کے تار و پود میں گتھ جائیں - علم اور زندگی کا صحیح باہمی تعلق صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے -

ہم نے جو نقطۂ نظر اوپر پیش کیا ہے اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ تعلیم کے سب مدارج میں تمام علوم کو اس طرح پڑھانا ممکن یا مناسب ہے کہ وہ کسی عملی مشغلے کا نتیجہ ہوں اور فوراً کسی دوسرے شغل میں یا اسی شغل

کی تکمیل میں استعمال کیے جا سکیں - جب طالب علم کی ذہنی عمر زیادہ ہو جاتی ہے' اس کا تجربہ بڑھ جاتا ہے اور ایک حد تک اس کے شوقوں کی نشو و نما ہو چکتی ہے تو اسے بعض علوم سے بنفسہ دلچسپی ہو جاتی ہے - مثلاً وہ ریاضی کو اس لیے نہیں سیکھتا کہ گھر کا حساب و کتاب لکھ سکے' یا مدرسے کی دوکان چلا سکے' یا آگے چل کر کسی محکمے میں ملازم ہو جائے بلکہ اسے ان ذہنی قوانین اور اعمال سے ذوق پیدا ہو جاتا ہے جن پر علم ریاضی مشتمل ہے - اسی طرح تاریخ میں وہ براہ راست تاریخی تحریکوں اور ان کے ارتقاء کے مطالعے میں منہمک ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے بصیرت اور عبرت حاصل کرتا ہے - ادب کے مطالعے کی بدولت اسے خیالات و جذبات اور جمالی احساسات کی ایک نئی دنیا نظر آنے لگتی ہے جو اس کو کوئی مادی "نفع" نہیں پہنچاتی لیکن اس کے تجربے میں وسعت اور گہرائی اور اس کی قوت احساس میں نزاکت اور لطافت پیدا کرتی ہے اور وہ اپنے خیال میں ان سب چیزوں سے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ "فائدہ" حاصل کرتا ہے جتنا دوسرے آدمی کسی خاص ہنر کو سیکھ کر روپیہ کمانے سے - سائنس کے ایک عالم کے متعلق' جس نے علم طبیعیات میں کوئی نیا اور اہم انکشاف کیا تھا یہ قصہ مشہور ہے کہ اس سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کی اس نئی تحقیق کا کوئی عملی فائدہ بھی ہے یا نہیں - اس نے فوراً جواب دیا "خدا کا شکر ہے کہ اس سے کسی طرح کے فائدہ کا امکان ہی نہیں" - یہ علمی محققوں کا مخصوص نقطۂ نظر ہے جس کا ہمیں احترام

کرنا چاھیے کیونکہ وہ جب تک بالکل بےغرضی کے ساتھ علم کی خدمت نہ کریں اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکتے - مگر یہ ضروری نہیں کہ اس علمی تحقیقات کو دوسرے لوگ عملی مصرف میں نہ لا سکیں - بلکہ اکثر ایسا ھوا ھے کہ محقق اپنی جگہ پر نظری انکشافات کرتا ھے اور دوسرے لوگ اس کو صنعتی کاموں میں استعمال کرتے ھیں - جہاں تک مدرسے کے طلبہ کا تعلق ھے معلم کو ان کی تعلیم کی ابتدا اس طرح کرنی چاھیے کہ ان کے درسی مشاغل ان کی موجودہ زندگی اور شوقوں میں گھل مل جائیں اور اس کے بعد ان کے شوقوں کی نشو و نما اس طرح ھو کہ وہ ان علوم میں بنفسہ دلچسپی لینے لگیں اور ان میں بعید مقاصد کی خاطر محنت اور کوشش کرنے کی قابلیت پیدا ھو جائے - ایک اوسط قابلیت کے طالب علم کے لیے شاید کبھی ایسا زمانہ نہ آئے کہ اسے بالکل مجرد اور نظری علوم سے دلچسپی اور انہماک پیدا ھو جائے لیکن پھر بھی عقلمند استاد جو فطرت اطفال سے واقف ھو' اتنا ضرور کر سکتا ھے کہ طلبہ میں درسی مضامین سے تھوڑا بہت شغف پیدا کر دے - اور اس کا طریقہ یہی ھے کہ وہ ھر منزل پر انھیں یہ محسوس کرا دے کہ ان کے لیے ان مضامین کی تحصیل اس وسیع تر معنی میں "مفید" ھے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ھے - یعنی وہ ان کے دل و دماغ اور شخصیت کی اس طرح تربیت کرے کہ ان کی معلومات زیادہ وسیع اور واضح' ان کا مذاق زیادہ شائستہ اور ان کی قوت عمل زیادہ موثر اور مستحکم ھو جائے اور وہ علم و زندگی کے باھمی تعلق کو

محسوس کرنے لگیں - لیکن اس کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ معلم خود اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ علوم تمدنی زندگی کی ضروریات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور ان کا منشاے حقیقی یہی ہے کہ وہ اس زندگی کی طرف رجوع کرکے اس کو بہتر اور زیادہ معنی خیز بنائیں اور وہ طالبہ کی زندگی میں بھی ان علوم کو انھیں اصولوں کے مطابق جگہ دے جس کے ماتحت وہ تمدنی زندگی میں وجود میں آئے ہیں ۔

باب دوم

"مدرسۂ عمل"

ہم نے گزشتہ باب میں علم اور زندگی کے باہمی تعلق کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مروجہ درسی تنظیم میں یہ تعلق بالکل منقطع ہوگیا ہے جس کی وجہ سے مدرسے کی تعلیم بےجان اور بےاثر ہو کر رہ گئی ہے - اس صورت حال کی اصلاح کے لیے مختلف ملکوں میں بہت سی تعلیمی تحریکیں وجود میں آئی ہیں جن میں بعض جزئیات اور عملی تجاویز کے اعتبار سے اختلاف ہے، لیکن اس اصول پر وہ سب متفق ہیں کہ مدرسوں کی تعلیم کو بالکل مجرد اور نظری بنانے کے بجائے طلبہ کی عملی زندگی کے ساتھ مربوط کرنے کی ضرورت ہے اور اگر ابتدائی جماعتوں کی تعلیم میں منطقی اصول پر مرتب کیے ہوئے اسباق کی جگہ عملی اور فعالی مشاغل پر زور دیا جائے تو مدرسہ بجائے ایک "انفعالی" درسگاہ کے واقعاً ایک "مدرسۂ عمل" بن جائے گا جہاں طلبہ محض کتب‌بینی یا محررّی کے کام کے لیے تیار نہیں کئے جائیں گے، بلکہ انہیں تمدنی زندگی کی گوناگوں ضروریات اور

فرائض کے لیے تربیت دی جائے گی - اس تحریک کا آغاز بھی بہت سی دوسری مفید تحریکوں کی طرح روسو (Rousseau) کے انقلاب آفریں خیالات سے ہوا لیکن اس نے اپنی فطرت کے مطابق صرف منفی اور تخریبی پہلو پر زور دیا یعنی مروجہ تعلیم کی خرابیوں کو اپنی بےپناہ تردید کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کردیا - اس کے بعد فروئبل (Froebal) اور پستالوزی (Pestalozzi) وغیرہ نے اس تحریک کو عملی جامہ پہنایا اور اس کے متعلق عملی تجاویز پیش کیں - گزشتہ پچاس سال میں مغربی ممالک کے ماہرین تعلیم نے اپنی اپنی ضروریات اور نقطۂ نظر کے مطابق اس تحریک کی تنظیم کی ہے - امریکا میں اس کی رہنمائی اور فلسفیانہ تفسیر کا کام پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے انجام دیا ہے - وہ فطرت اطفال، دماغی ارتقا کے قوانین اور اپنے ملک کے معاشری حالات کا مطالعہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب تک مدرسوں میں تعلیم کی بنیاد ان عملی مشاغل پر نہ رکھی جائے گی جو ایک مختصر پیمانے پر مفید تمدنی مشاغل کا نمونہ ہوں، اس وقت تک نہ تعلیم فطرت اطفال کے لحاظ سے موزوں ہوگی نہ تمدنی زندگی کے لیے مفید ثابت ہوگی [۱] - امریکا میں بہت سے معلموں نے ولیم جیمز (William James) کی نفسیات اور (Dewey) کے تعلیمی خیالات سے متاثر ہوکر

---

۱ ـــ ڈیوئی کی تمام تعلیمی تصانیف اسی خیال کی تشریح ہیں بالخصوص ان کی مستند تصنیف Democracy and Education جس میں انھوں نے ہر نقطۂ نظر سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور تعلیم کا ایک مکمل اور مدلل نظریہ پیش کیا ہے ۔

اس تحریک پر مختلف شکلوں میں عمل کیا ھے اور تعلیم کے طریقے اور نظم و نسق کو اس کے اصولوں پر قائم کیا ھے - تعلیم جدید کا مطالعہ کرنے والے ان میں سے بہت جدت آفریں معلموں کے نام سے واقف ھیں مثلاً پارکر (Parker) کلپٹرک (Kilpatrick) مس پارکھرسٹ (Parkhurst) واشبرن (Washburn) اور بیگ لے (Bagley) وغیرہ - پروفیسر اوڈولف فیریر (Adolphe Ferriere) نے جو سوئستان کے جدید تعلیمی رھنما ھیں اپنی مختلف تصانیف کے ذریعے اس تحریک کی اشاعت کی ھے اور بالخصوص اپنی ایک نہایت اھم تصنیف "L'Ecole Active" (مدرسۂ عمل) کی پہلی دو جلدوں میں اس کی نظری اور عملی تشریح کی ھے اور تیسری جلد میں اس کی عملی تنظیم سے بحث کی ھے اور مدارس عمل کی مثالیں دے کر اس کے اصولوں کو سمجھایا ھے ۱ - بلجیم کے مشہور معلم ڈکرولی (Decroly) نے اپنے مدرسے میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ھے ۲ - جرمنی میں ڈاکٹر کرشن اسٹائنر (Kerschensteiner) نے جو وہاں تعلیم جدید اور اصلاح مدارس کی تحریک کے بانی اور سرگروہ ھیں اور ان شاگردوں نے اس تحریک کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو بہت قابلیت کے ساتھ سمجھا اور

۱—ان کی تمام تصانیف فرانسیسی اور جرمن زبان میں ھیں - البتہ "L'Ecole Active" کی ایک جلد کا انگریزی ترجمہ (Activity of School) کے نام سے شائع ھوا ھے -

۲—اس مدرسے کے حالات کئی کتابوں میں شائع ھوئے ھیں جن میں سے (Mlle. A. Hamaide) کی کتاب جس کا انگریزی ترجمہ (Decroly Class) کے نام سے شائع ھوا ھے خاص طور پر قابل ذکر ھے -

سمجھایا ہے - اور جنگ عظیم کے بعد سے اس پر کامیابی کے ساتھ عمل کر کے مغربی تعلیم پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے [1] - انگلستان میں بھی مدارس جدید کے بانیوں اور کارکنوں نے تعلیم جدید کے اس بنیادی اصول پر عمل کیا ہے - مثلاً سینڈرسن (Sanderson) نے اونڈل (Oundle) کے پبلک اسکول میں، بیڈلے (Badley) نے بیڈیلز (Badales) کے اسکول میں، مس میکنڈر (Mackinder) نے مارل برو (Marlborough) کے اسکول میں اپنے اپنے ماحول کی مختلف ضروریات کے مطابق کتابی مدرسوں کو عملی مدرسوں میں تبدیل کر دیا ہے - ہندوستان میں ابھی تک اس تحریک کا عام رواج نہیں ہوا، کیونکہ یہاں نہ حکومت اور محکمۂ تعلیم نے اس کی سرپرستی کی ہے، نہ ایسے تعلیمی تجربے کرنے والے معلم موجود ہیں جو اپنی ذاتی کوشش اور شغف سے تجربی مدارس قائم کریں - لیکن جہاں کہیں کسی بیدار مغز معلم نے عام راستے سے ہٹ کر بچوں کی تعلیم میں اصلاح کی بنا ڈالی ہے وہاں اسی کا اثر کارفرما ہے - بعض مدارس تو ایسے ہیں جو براہ راست مغرب کے تعلیمی خیالات سے متاثر ہوئے ہیں اور کسی قدر ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ ان پر عمل کر رہے ہیں مثلاً وہ تعلیم گاہیں جن میں طریق ڈالٹن (Dalton) مروج ہے یا موگا کا ابتدائی

---

[1] جرمنی کی جدید تعلیمی تصانیف میں سے بہت کم کا ترجمہ انگریزی میں شائع ہوا ہے - کرشن اسٹائنر کی دو کتابوں کا انگریزی ترجمہ موجود ہے جن میں سے ایک (Education as Citizenship) ہے اور دوسری (School and the Nation) - دونوں میں تعلیم کے عملی مسائل سے بحث کی گئی ہے -

مدرسہ اور نارمل اسکول جس میں منصوبی طریقہ (Project Method) آزمایا جا رہا ہے - البتہ چند مدرسے ایسے بھی ہیں جن میں ہندوستانی حالات اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایک بہتر تعلیمی ماحول مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - ان میں سب سے زیادہ معروف ٹیگور کا مدرسہ 'شانتی نکیتن' ہے جہاں اس فلسفی شاعر نے بچوں کی مکمل اور ہم‌آہنگ تربیت کے لیے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جس میں انھیں فطرت کے مناظر اور اس کی پر اسرار زندگی سے ہر وقت تعلق رہتا ہے اور محنت' مزدوری باغ‌بانی اور دوسرے عملی کاموں کے مواقع نصیب ہیں :—

''جب میں کبھی کسی ایسی تعلیم‌گاہ کا تصور کرتا ہوں جس میں سب سے پہلا اور اہم سبق انسان اور فطرت کا مکمل اتحاد ہو تو میرے دل میں رابنسن کروسو کے جزیرے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے - یہ اتحاد محض محبت کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے عملی ارتباط اور ذہنی تعاون کی ضرورت ہے'' ۱ -

ان تمام مدرسوں میں جزوی اور اکثر اہم اختلافات کے باوجود یہ اصول مشترک ہے کہ ابتدائی تعلیم کی بنیاد عمل پر رکھنی چاہیے اور علم کو بچوں کے لیے شعوری مقصد نہیں بنانا چاہیے بلکہ اس کو ان کے مرغوب مشاغل کا نتیجہ ہونا چاہیے -

---

۱—ملاحظہ ہو ٹیگور کے لکچر جو Religion of Man کے نام سے شائع ہوئے ہیں -

نفسیات کی جدید تحقیقات بھی ہماری رہنمائی اسی نتیجے کی طرف کرتی ہے - پرانے علم‌النفس میں رسمی طور پر یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ انسانی دماغ بنی بنائی نفسی قوتوں کا مجموعہ ہے جن کی تربیت بعض مخصوص علوم اور درسی مضامین کے ذریعے ہو سکتی ہے اور انہیں کے مطالعے سے یہ قوتیں اس طرح تیز ہو جاتی ہیں جس طرح چاقو پتھر پر رگڑنے سے تیز ہو جاتا ہے - استاد کا محض اتنا کام ہے کہ وہ مشق اور اعادے کے ذریعے ان کی تمام مختلف اور منتشر دماغی قوتوں کو مجتمع اور مستحکم بنائے - برخلاف اس کے نفسیات کا موجودہ نظریہ یہ ہے کہ بچے میں اوائل عمر سے بہت سی مخصوص جبلتیں (Instincts) اور عام فطری رجحانات (General Impulses) ہیں جو ابتدا میں مختلف قسم کی جسمانی حرکتوں اور خواہشوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، اس کے بعد نئے کھیلوں اور تجربوں کی صورت میں، اور رفتہ رفتہ نشو و نما پا کر مربوط اور مرتب ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی شعوری نفسی زندگی پوری طرح منظم ہو جاتی ہے جس طرح انسان کی سیرت اس کو بنی بنائی نہیں ملتی اسی طرح دماغ بھی کوئی مکمل چیز نہیں - بلکہ اس کی اپنی جد و جہد اور تجربات اور اس کے ماحول کے باہمی عمل اور رد عمل سے نشو و نما پاتا ہے - یہ جبلی رجحانات جو طلبہ میں ولولۂ عمل، شوق اور تجسس پیدا کرتے ہیں مجرد اور نظری مضامین کے مطالعے سے تربیت نہیں پاتے بلکہ ان مشاغل اور افعال کے ذریعے جن کو وہ فعالی حیثیت سے اور آزادی کے ساتھ انجام

دیتے ہیں اور جن میں ان کی جسمانی اور دماغی قوتیں متحد ہو کر کام کرتی ہیں - اسی وجہ سے مدارس جدید میں بچوں کی تعلیم کی ابتدا ان کی فطری صلاحیتوں اور رجحانات سے ہوتی ہے - ان کو ایسے کھیلوں اور کاموں میں لگانے کی کوشش کی جاتی ہے جن کی جانب وہ مدرسے سے باہر بھی خود بخود غیر ارادی طور پر متوجہ ہوتے ہیں - ان مدارس نے جو تعلیمی مشاہدات اور تجربات شائع کیے ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب طلبہ کے قدرتی رجحانات کو آزادی کے ساتھ اظہار کا موقع ملتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ رسمی مضامین اور نصاب کی تحصیل میں بھی زیادہ دل لگا کر محنت کرتے ہیں ان میں ضبط نظم کا قائم رکھنا آسان ہو جاتا ہے اور مدرسہ ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتا ہے' بہ قول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے:

''ذہنی زندگی کے مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ بچوں کی زندگی میں ڈھونڈنے اور دریافت کرنے' اوزاروں اور آلات کو استعمال کرنے' چیزوں کو بنانے اور خوشی کے جذبات کو ظاہر کرنے کی جبلی خواہشوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے - جب ایسے مشاغل' جو ان رجحانات کو کام میں لاتے ہیں' مدرسے کے پروگرام کا جزو بن جائیں تو بچے کی پوری شخصیت ان میں منہمک ہو جاتی ہے اور مدرسے کے اندر اور باہر کی زندگی میں جو مصنوعی فصل پیدا ہو گیا ہے وہ دور ہو جاتا ہے - بچوں کو خود بخود یہ تحریک ہوتی ہے کہ وہ ایسے کاموں اور چیزوں کی طرف توجہ کریں جو تعلیمی لحاظ سے مفید ہیں' جن میں

باھمی اشتراک عمل کے مواقع ملتے ھیں اور جن کی وجہ سے ان کی تمام معلومات کا تعلق معاشری زندگی سے قائم ھو جاتا ھے - مختصر یہ کہ کھیلوں اور عملی کاموں کو مدرسے میں اس لیے جگہ نہیں دی جاتی کہ بچے ذرا دیر خوش ھو جائیں بلکہ اس لیے کہ وہ عقلی اور تمدنی لحاظ سے ضروری ھیں" ۱ -

امریکا کے دو ماھرین تعلیم نے حال ھی میں جرمنی کی تعلیم جدید کی تجربوں کا بہت غور سے مطالعہ کیا ھے - وہ اس اصول کی تشریح کرتے ھوئے لکھتے ھیں :—

"(تعلیم میں) فعالی اصول اور تجربے کا اصول بالکل ھمپایہ اور ھممعنی ھے اور نفسیات ترکیبی (Structural Psychology) کا جزو لازم ھے (اس کے مطابق) فرد کو تخلیقی انفعال (Creative Activity) کا سرچشمہ سمجھنا چاھیے - انھیں کے ذریعے وہ اپنے تجربات کے مجموعے کو معنی پہناتا ھے اور انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دیتا ھے - اس طرح وہ اپنے نفس کے اندر اپنی دنیا تعمیر کرتا ھے اور جو چیزیں باھر سے حاصل کرتا ھے ان کو اپنے اندر جذب اور منظم کرنے کے لیے اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لیتا ھے تاکہ وہ بعد میں ان چیزوں کو جو اس کی روح میں جاگزیں ھیں عمل میں ظاھر کر سکے - تعلیم کا سب سے اھم فرض یہ ھے کہ وہ اس تخلیقی قوت کو اُبھارے اور اس کی تربیت کرے" ۲

۱— Democracy and Education صفحہ ۲۲۹ -

۲— The New Education in the German Republic
Alexender and Parker صفحہ ۳٦۰ -

ان مشاغل کو مدرسوں میں رائج کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ طلبہ ذہنی تربیت اور تحصیل علم کی طرف سے غافل ہو کر اپنا تمام وقت "دست کاری" سیکھنے میں صرف کریں تاکہ وہ جلد سے جلد روزی کمانے کے قابل ہو جائیں اور تمدنی زندگی کے کاروباری معاملات میں حصہ لے سکیں یا "غیر مفید" مضامین کی طرف سے بےپروائی برتنے لگیں نہ اس تجویز سے ہم صرف یہ چاہتے کہ اس کے ذریعے کسی نہ کسی طرح طلبہ کو مدرسے سے دلچسپی پیدا ہو اور ان کا وقت خوشی اور تفریح کے ساتھ بسر ہو - اس میں شک نہیں کہ یہ مقاصد بجائے خود مفید ہیں اور یہ بڑی ضروری چیز ہے کہ طلبہ میں عملی کارکردگی اورسلیقہ پیدا ہو' وہ آئندہ زندگی کے کاموں کے لیے تیار ہوں اور مدرسے کے مشاغل کو دلچسپی اور خوشی کے ساتھ انجام دیں - لیکن یہ تمام چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں - اس اصول کی علت غائی نہیں ہیں - ہمارا اصل مقصد اس سے کہیں زیادہ اہم ہے - یعنی ہم ان مشاغل کے ذریعے طلبہ کو تمدنی زندگی سے روشناس کرنا چاہتے ہیں - اس لحاظ سے ان کی تنظیم اس طرح کرنی چاہیے کہ ان میں شریک ہو کر طلبہ کی عقلی اور ذہنی تربیت ہو اور ان کی طبیعت میں تمدنی فرائض کا احساس' تمدنی معاملات کی سمجھ' اور ان میں شرکت کرنے کی قابلیت پیدا ہو - یہ تنظیم صرف اس حالت میں ہو سکتی ہے جب چند ضروری نفسی اور تمدنی شرائط پوری کی جائیں - وہ شرائط کیا ہیں ؟ ان کی سب سے زیادہ مفصل اور مدلل تشریح پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے

اپنی تصانیف میں کی ہے اور ہم اس مسئلے پر ان کی رہنمائی میں بحث کریں گے -

مدرسے کے مشاغل کو تعلیمی لحاظ سے مفید بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ان کا انتخاب اس اصول پر کیا جائے کہ وہ تمدنی زندگی کے بڑے بڑے شعبوں اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے طالبہ جو علم یا ہنر حاصل کریں وہ انہیں اس زندگی کو سمجھنے اور اس میں شرکت کرنے میں مدد دے اور جب مدرسے کی چار دیواری سے نکل کر بیرونی دنیا میں پہنچیں تو ان کی مدرسے کی عادتیں اور معلومات دنیاوی کار و بار اور معاملات میں کام آئیں - سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں، جب انسانی زندگی کا نظام مقابلتاً بہت سادہ تھا، طالبہ ان مفید عادتوں اور عملی صلاحیتوں کو روزمرہ کے کار و بار اور اپنے عزیزوں اور ہمسایوں کی صحبت میں حاصل کرلیتے تھے - طباعت کا فن ابھی ایجاد نہ ہوا تھا اس لیے کتابیں کمیاب تھیں اور کتابی علوم بہت مشکل سے حاصل ہوتے تھے اور ان کی قدر بہت زیادہ تھی کیونکہ لوگوں کے لیے اپنے تنگ تجربات اور خیالات کے تنگ اور محدود دائرے سے باہر نکلنے اور ایک وسیع تر ماحول سے آشنا ہونے کا یہی ایک ذریعہ تھا - اس لیے مدرسے بجا طور پر انہیں چیزوں پر زور دیتے تھے جو کتابی اور نظری علوم کے مطالعے سے حاصل ہوتی تھیں - اور طالبہ کی ذہنی اور کسی حد تک اخلاقی تربیت میں مدد دیتی تھیں - لیکن اب یہ صورت حال بالکل تبدیل ہوچکی ہے - اب نتیجہ خیز اور پرمعنی تجربے کمیاب اور کتابیں بہت عام اور

سستی ہوگئی ہیں - ہر شخص، جسے پڑھنے کا شوق ہے وہ کتابوں، اخباروں، رسالوں وغیرہ کے ذریعے عمر بھر اپنی کتابی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے - لیکن موجودہ زندگی میں جو کشمکش اور جد و جہد سے معمور ہے کامیابی کے لیے جس، فعالیت کی ضرورت ہے وہ محض کتابی مطالعے سے حاصل نہیں ہوسکتی - لہذا مدرسۂ جدید کو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ محض کتابوں کو اپنا ذریعۂ تعلیم نہ بنائے بلکہ تعلیم میں ایسے عناصر کو داخل کرے جن کے ذریعے سے ان صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکے جو صنعت و حرفت، سائنس اور جمہوریت کے موجود دور میں افراد کی کامیابی کے لیے درکار ہیں - اس خیال کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ لوگ بالعموم جس قسم کے کام کرتے ہیں ان میں ذہنی اور اخلاقی تربیت کے وہ امکانات باقی نہیں رہے جو پہلے زمانے میں پائے جاتے تھے - اس ضمن میں اس تمام بحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں جو تعلیم اور پیشے کے متعلق کی گئی ہے - صرف اتنا یاد دلانا کافی ہے کہ صنعت و حرفت کے کاموں میں جو انقلابی تبدیلیاں یورپ اور امریکا میں ہوئی ہیں ان کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا ہے اور آئندہ چل کر اور زیادہ پڑے گا - بہت سی مشہور سودیشی دستکاریاں جو زمانۂ قدیم سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لیے وسیلۂ معاش تھیں اور جن میں انھیں اکثر ذوق جمال اور جدت طرازی سے کام لینے کا موقع ملتا تھا اب یا تو بالکل مفقود ہوگئی ہیں یا ان میں کام کرنے والوں کی کھپت کم ہوگئی ہے، کیونکہ اب ویسی ہی چیزیں بہت آسانی اور کفایت کے ساتھ مشین کے ذریعے تیار ہوجاتی ہیں - لیکن جہاں اس

طرح قوت پیداوار بڑھ گئی ہے وہاں انسانی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے کام کی قدر و قیمت بہت گھٹ گئی ہے کیونکہ جیسا ہم حصۂ اول باب چہارم میں بتا چکے ہیں کارخانوں میں مزدوروں کی حیثیت مشین کے پرزوں کی سی ہوگئی ہے جو بغیر سوچے سمجھے ایک مقررہ معمول کو پورا کرتے رہتے ہیں جس کے لیے انہیں دماغ سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی - اس مشین گردی سے بچنا مشکل اور اس کو برا کہنا فضول ہے کیونکہ وہ تمدنی زندگی کی مادی اور صنعتی ترقی کی ایک ناگزیر منزل ہے - ہمارا کام شکایت کرنا نہیں بلکہ نئے حالات پر قابو پانا اور ان کے ذریعے اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ہے - معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ تعلیم کے ذریعے ایک ایسی نسل تیار کرے جو ایک طرف صنعت و حرفت کے ایسے امکانات سے پورا فائدہ اٹھائے اور دوسری طرف اپنی امتیازی صفات اور انسانی خصوصیات کا تحفظ کرے جو اکثر دوسرے ممالک میں مادی ترقی کے شوق میں قربان کر دی گئی ہیں - مدرسۂ جدید کی یہ کوشش ہے کہ طلبہ میں کام سے محبت اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے اور اس کے ذریعے ان کی اخلاقی اور ذہنی قوتوں کی تربیت کرے - لہذا وہ ایسے مشاغل کا انتخاب کرتا ہے جو ان کو تمدنی زندگی کے کاروبار اور نظم و نسق سے روشناس کریں - اس کی غرض یہ نہیں کہ مدرسے کو صنعت و حرفت کے اغراض یا اقتصادی ضروریات کا تابع بنا دیا جائے اور قبل از وقت پیشے کی تعلیم شروع کردی جائے بلکہ اس میں معاشرتی احساس اور ذہنی قوتوں کی نشو و نما پر زور دیا جاتا ہے - مدرسے کے مشاغل میں اس بات کا لحاظ رکھا

جاتا ہے کہ ان میں عقلی تربیت اور سائنس سے واقفیت حاصل کرنے کے امکانات موجود ہوں - سائنس کی جدید ترقی نے اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ مختلف علوم و فنون مثلاً زراعت، ریاضی، طبیعیات، کیمیا وغیرہ میں ترقی اور توسیع اس طرح نہیں ہوتی کہ ہم اپنے دماغ سے منطقی دلائل کا استخراج کریں بلکہ اس کے لیے تجربے، مشاہدے اور علمی تحقیقات کے تمام فنی وسائل اور طریقوں کے استعمال کرنے کی ضرورت ہے - اس صورت حال کا اثر مدرسے کے کام پر بھی ہوا ہے - چونکہ اب تمام مفید اور ضروری فنون کی بنیاد سائنس پر قائم کی گئی ہے اور ان کے استعمال اور ترقی کے لیے سائنس سے واقف ہونا شرط ہے - اس لیے ہمیں بہت سے ایسے پیشے مل سکتے ہیں جن کے ضروری اجزا کو مناسب ترتیب کے ساتھ طلبہ کے سامنے پیش کر کے ہم مدرسوں کے لیے موزوں مشاغل تجویز کر سکتے ہیں - اس قسم کے مشاغل ہمارے چاروں طرف موجود ہیں اور وہ عقلی اور معاشرتی امکانات سے مالا مال ہیں لیکن ہم ایک تنگ درسی نقطۂ نظر کی چاردیواری میں اِس طرح محصور ہوگئے ہیں کہ ہماری نظر ان تک پہنچتی ہی نہیں -

انسان کے جتنے مشترک اور اہم‌ترین مشاغل ہیں ان کا تعلق خوراک، مکان، لباس اور مکان کے ضروری سامان سے، اشیا کے بنانے ان کا مبادلہ کرنے اور ان کو صرف کرنے کے ذرائع اور وسائل سے ہے - چونکہ یہ تمام چیزیں انسانی زندگی کی ضروریات اور آسائش سے متعلق ہیں اسی لیے وہ انسانی جبلتوں کی گہرائی تک پہنچتی ہیں - اور ان میں جو

معلومات اور اصول پنہاں ہیں وہ تمدنی لحاظ سے بہت اہمیت اور قدر رکھتے ہیں - اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ باغ بانی، پارچہ بافی، لکڑی اور دھات کا کام، کھانا پکانا اور اسی قسم کے مختلف مشاغل جو انسانی کاروبار میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں اور مدارس جدید میں داخل کیے گئے ہیں، محض روزی کمانے کا ذریعہ ہیں تو ہم ان کی واقعی اہمیت سمجھنے سے بالکل قاصر رہیں گے - مانا کہ عام طور پر لوگوں کو صنعت و حرفت کے تمام کاروبار ایک ناگزیر مصیبت معلوم ہوتے ہیں جس کو وہ محض حصول معاش کی خاطر گوارا کرتے ہیں لیکن یہ قصور ان کاموں کا نہیں بلکہ ان کے حالات کا ہے جن میں یہ کام کیے جاتے ہیں - دور حاضر کی زندگی میں اقتصادی معاملات کی اہمیت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے - اس لیے تعلیم کا فرض ہے کہ وہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ تمدنی بہبود کا انحصار ان معاملات پر ہے اور ان کا سائنس پر - مدرسوں میں یہ مشاغل کسی مالی منافع کی خاطر جاری نہیں کئے جاتے بلکہ اپنی داخلی قدر و قیمت کی بنا پر - جب یہ تمام خارجی اثرات اور روپیہ کمانے کی خواہش سے آزاد ہو جاتے ہیں تو ان کے ذریعے سے ایسے تجربات حاصل ہوتے ہیں جو بجائے خود مفید ہیں - اس وقت وہ واقعاً دماغ کی آزاد تربیت کا باعث ہوتے ہیں" ۱ -

۱ — Democracy and Education صفحہ ۲۳۵ -

اگر اس اصول پر مشاغل کا انتخاب کیا جائے تو ان سے یقیناً وہ تعلیمی فائدے حاصل ہوسکتے ہیں جو اس تحریک کے حامیوں کے مد نظر ہیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے ان مشاغل کی ایک مختصر سی فہرست بھی دی ہے جو بہت سے مدرسوں میں رائج ہو چکے ہیں اور جن میں سے اکثر کو انھوں نے اپنے مشہور ابتدائی مدرسے "شکاگو ایلیمنٹری اسکول" میں جو امریکا کے بیشتر تجربی مدارس کا پیش رو ہے، آزمایا تھا - وہ ان مشاغل میں جو بچوں کی عام تعلیم کے لیے اور دست کاری سکھانے کے واسطے مفید ہیں، مندرجۂ ذیل چیزوں کو شامل کرتے ہیں :—

مدرسوں میں طلبہ کاغذ، کارڈ بورڈ لکڑی چمڑے، کپڑے، سوت، مٹی، ریت اور دھاتوں کا کام کرتے ہیں، کبھی اوزاروں کی مدد سے اور کبھی ان کے بغیر - اس قسم کے کاموں کو کرتے وقت انھیں بہت سی چیزیں سیکھنی اور کرنی پڑتی ہیں مثلاً کاغذ کا کاٹنا، تہ کرنا، سوراخ کرنا، ناپنا، ڈھالنا، ماڈل بنانا، نمونے کاٹنا، گرم کرنا، ٹھنڈا کرنا، ہتوڑے، آری، ریتی سے کام کرنا - یہ سب کام مشق کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مختلف دلچسپ مشاغل کے دوران میں کرنے پڑتے ہیں - مثلاً علاوہ طرح طرح کے کھیلوں کے تفریحی سفر کے لیے جانا، باغبانی، کھانا پکانا، سینا، چھپائی جلدبندی، کپڑا بننا، رنگ بھرنا، تصویر کشی، ڈراما کرنا، کہانیاں کہنا، اور لکھنا پڑھنا - نہ اس خیال سے کہ ایک خاص فن سیکھنا ہے جو آئندہ چل کر مفید ہوگا بلکہ بحیثیت عملی مشاغل کے جن سے ان کے موجودہ مقاصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے - مثلاً آپس میں ایک دوسرے کو خط

لکھنے یا کہانیاں سنانے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے - اگر طلبہ یہ محسوس کریں کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر انھیں اپنے دلچسپ مشاغل میں کامیابی ہوگی تو وہ ان کو بہت شوق اور توجہ سے حاصل کریں گے -

بڑا تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان مشاغل کو یا ان میں سے بعض کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا قابل قدر جزو کس طرح بنا سکتے ہیں - اس کتاب میں ہمیں زیادہ تر عام تعلیمی اصولوں سے بحث ہے - اس لیے یہاں اس کا موقع نہیں کہ ہم ان مشاغل پر تفصیلی نظر ڈال کر بتائیں کہ ان سے مدرسے میں کس طرح فائدہ اٹھایا جائے - البتہ یہ عام اصول یاد رکھنا چاہیے کہ بحیثیت تعلیمی وسائل کے ان کی کامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک طلبہ کے مفید شوقوں کو اُبھارتے ہیں اور ان کو نئی اور پائدار دلچسپیوں سے روشناس کرتے ہیں - تعلیم کا منشا یہ ہے کہ طلبہ کی شخصیت میں وسعت اور گہرائی پیدا کرے اور مدرسے کے یہ مشاغل اس منشا میں اسی وقت معین ہو سکتے ہیں جب وہ بچوں میں صحیح قسم کی دلچسپیاں پیدا کریں اور مختلف علوم کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے دکھائیں تاکہ وہ اپنے علم سے زندگی کے مسائل پر روشنی ڈال سکیں اور زندگی کے تجربات سے علم میں وضاحت اور صحت پیدا ہو - مدرسے کے معمولی درس پر اس قسم کے مشاغل کو اس وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے کہ ان کے ذریعے سے جو معلومات طلبہ حاصل کرتے ہیں اس میں جان پڑ جاتی ہے اور مختلف مضامین ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہتے بلکہ ایک مسلسل

عملی مشغلے کے اجزا بن کر باہم مربوط ہو جاتے ہیں - عام طور پر مدرسوں کی تعلیم میں یہ خرابی ہے کہ وہاں ہر مضمون اپنی جگہ پر مکمل اور قائم بالذات سمجھا جاتا ہے جس کا نہ دوسرے مضامین سے کوئی تعلق ہے نہ طلبہ کی زندگی اور تجربات سے - تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، ادب، سائنس وغیرہ سب گویا دماغ کے علحدہ علحدہ خانوں میں بند رہتے ہیں، جو کسی خاص موقعے پر مثلاً آموختہ سنانے یا امتحان دینے کے وقت وہاں سے باہر نکلتے ہیں اور بس! برخلاف اس کے اگر طلبہ کسی بامقصد کام، مثلاً باغبانی میں، یا تعلیمی سیر و سفر میں، یا مدرسے کے میدان میں ہندوستان کا ایک بڑا اور مفصل نقشہ بنانے میں مصروف ہیں تو وہ اپنی تمام معلومات سے حسب ضرورت کام لیتے ہیں اور اپنی کوشش اور دوسروں کی مدد سے نئی معلومات حاصل کرتے ہیں - اس طرح ان نئی اور پرانی معلومات میں برابر لازمی اور قدرتی طور پر ربط قائم ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے ان کے علم میں استحکام پیدا ہوجاتا ہے اور وہ ضرورت کے وقت استعمال میں آسکتا ہے - جب ہم ان تعلیمی مشاغل کو مدرسوں میں داخل کریں یا معمولی درسی مضامین سے طریقۂ تعلیم میں منصوبی اصول پر عمل کریں تو ہمیں ہمیشہ ایسے مشاغل کا انتخاب کرنا چاہیے جن میں مختلف قسم کی معلومات کو مربوط اور منظم کرنے، ذہنی کاوش اور اجتہاد سے کام لینے اور تجربہ کو زیادہ وسیع اور بامعنی بنانے کے امکانات ہوں - یہی اصول منصوبی طریقے کی بنیاد ہے -

اس اصول کی توضیح چند مثالوں سے ہوسکتی ہے جن کا

تعلق مدرسے کے مضامین اور مشاغل سے ہے - باغبانی اُن مشاغل میں سے ہے جن کی اہمیت تمام ماہرین تعلیم نے تسلیم کی ہے اور جس کو خود تعلیم کے عمل سے ایک خاص مشابہت ہے - مدرسے میں باغبانی اس لیے نہیں کی جاتی کہ طلبہ کو آئندہ چل کر پیشہ‌ور باغبان بنانا ہے یا ان کا وقت خوشگوار طریقے پر گزارنا مقصود ہے - بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ انہیں معلوم ہو کہ انسان کے لیے کاشتکاری اور باغبانی کس قدر ضروری کام ہیں اور موجودہ نظام معاشرت میں ان کی کیا اہمیت ہے - اگر وہ سمجھ دار معلموں کی نگرانی میں اپنے مدرسوں میں کاشتکاری اور باغبانی کریں گے تو انہیں اس کے ذریعے پودوں کی نشو و نما' مٹی کے کیمیائی اجزا' روشنی' ہوا اور رطوبت کے اثرات' مفید اور مضر کیڑوں کے حالات معلوم کرنے کا موقع ملے گا - علم نباتات کے ابتدائی مسائل میں سے کوئی بات ایسی نہیں جو طلبہ کو پودوں کی نشو و نما اور ان کی غور و پرداخت کے سلسلے میں نہایت معقول اور موثر طریقے پر نہ سکھائی جاسکے - اس طرح ان باتوں کو سیکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جو کچھ واقفیت حاصل کریں گے اس کا تعلق ایک خاص مضمون ''علم نباتات'' سے نہ ہوگا بلکہ وہ ان کے روزمرہ کے مشاہدات اور مشاغل کا جزو ہوگی اور اس عام معلومات کے ساتھ مربوط ہوجائے گی جو وہ زمین کے مظاہر اور انسانی حیوانی زندگی کے متعلق رکھتے ہیں - یہ بھی ممکن ہے کہ جب ان کا شوق زیادہ پختہ اور تجربہ زیادہ وسیع ہوجائے تو بعض طلبہ کو ان میں سے بہت سے مسائل ایسے دلچسپ معلوم ہوں کہ وہ محض علمی تحقیق یا اپنے ذوق تجسس کی

رکھنے کے لیے ان کا مطالعہ کریں - مثلاً بیجوں کی نشو و نما اور پودوں کی خوراک کا مسئلہ، پھولوں کی پیداوار وغیرہ - اس طرح اکثر عملی دلچسپیاں رفتہ رفتہ ایک موزوں ماحول اور فطرت شناس معلم کی نگرانی میں علمی ذوق میں تبدیل ہوسکتی ہیں - گو بظاہر علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ طریقہ ایک طول عمل معلوم ہوتا ہے لیکن فطرت اطفال اور ذہنی ارتقاء کے قوانین کا تقاضا یہی ہے کہ تعلیم میں یہ لمبا راستہ اختیار کیا جائے - یہ ان مقامات میں سے ہے جہاں وقت اور محنت کی بیجا کفایت دراصل انتہائی اسراف ہے !

باغبانی کا تعلق مروجہ درسی مضامین سے نہیں ہے - مگر یہ اصول کہ تعلیم عمل کے ذریعے ہونی چاہیے، درسی مضامین پر بھی صادق آتا ہے - ہم مروجہ نصاب کے تقریباً ہر مضمون کو لے کر یہ بات ثابت کرسکتے ہیں کہ عقل اور تجربے دونوں کے لحاظ سے اس کی تحصیل میں بچوں کو عملی اور تخلیقی کام کرنے کا موقع دینا چاہیے اور صرف اسی طرح ہم ان کی تعلیم کو موثر اور کامیاب بنا سکتے ہیں - لیکن اس مثال کی توضیح کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مدرسۂ عمل کے نقطۂ نظر سے طلبہ کے عملی، فعالی اور فرحت بخش مشاغل مثلاً باغبانی اور مروجہ درسی مضامین میں جو فصل قائم ہو گیا ہے وہ بالکل غیر ضروری اور نقصان دہ ہے اور موجودہ نظریۂ تعلیم کی رو سے مطلق جائز نہیں - بہر حال اگر ہم مختلف علوم خصوصاً علوم صحیحہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ ان سب کی ابتدا مفید اور عملی پیشوں، صنعتوں اور دستکاریوں کی شکل

میں ہوتی ہے - علم طبیعیات (Physics) کے باقاعدہ طور پر مدون ہونے سے صدیوں پہلے لوہار اور نجار بہت سے وہ اوزار استعمال کرتے تھے جنھوں نے اس علم کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے مثلاً ہتوڑی' برما' پہیہ' بھٹی وغیرہ - پہلے انسان نے ان چیزوں کے استعمال سے عملی واقفیت حاصل کی' اس کے بعد جوں جوں اس کا تجربہ اور مشاہدہ وسیع اور منظم ہوتا گیا یہ عملی واقفیت علم کی صورت اختیار کرتی گئی - واقعہ یہ ہے کہ علم اور عمل دونوں اپنی ترقی اور تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور رہیں گے - اوزار اور آلات کے استعمال سے عملی واقفیت پیدا ہوتی ہے جو اصطلاحی معنی میں علم کا پیش خیمہ ہے اور علم کی ترقی کی بدولت بہتر اوزار اور آلات ایجاد ہوتے ہیں اور استعمال میں آتے ہیں - پھر ان بہتر آلات کے ذریعے انسان کی قوت مشاہدہ بہت بڑھ جاتی ہے تجربات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور علم میں اور زیادہ اضافہ ہوتا ہے - علت و معلول کا یہ سلسلہ یوں ہی قائم ہے - اسی طرح علم کیمیا کی ابتدا وہ بہت سے مفید اور ضروری کام ہیں جو لوگ صدیوں سے اپنے عملی تجربے کی بنا پر کرتے چلے آئے ہیں' مثلاً رنگ سازی' دھاتوں کا کام' دوائیں بنانا وغیرہ -

زراعت کو ایک مدون علم کی شکل اختیار کیے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے' لیکن بحیثیت ایک اہم‌ترین عملی مشغلے کے وہ ابتدائے تمدن سے جاری ہے - علم زراعت میں انھیں تجربوں' مشاہدوں اور دریافتوں کو ایک مرتب شکل میں پیش کیا جاتا ہے جو انسان نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کاشتکاری

کے دوران میں کی ہیں - یہی حال اور تمام علوم کا ہے جو نصاب میں پائے جاتے ہیں - اگر طلبہ ان کی تحصیل کی ابتدا مناسب عملی مشاغل کے ذریعے کریں تو گویا وہ ایسا راستہ اختیار کریں گے جس پر نسل انسانی چل چکی ہے اور جس پر چل کر اسے کامیابی حاصل ہوئی ہے - اس صورت میں مختلف سائنسوں کی حیثیت ان کے لیے مجرد اور نظری علوم یا چند ناقابل فہم اصولوں کے مجموعے کی نہ ہوگی بلکہ وہ واقعی یہ دیکھیں گے اور محسوس کریں گے کہ ان کا زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ نسل انسانی کے نقش قدم پر چلنے میں انھیں وہ تمام غلطیاں اور تضیع اوقات نہیں کرنی چاہیے جو گزشتہ زمانے میں ہمارے آبا و اجداد کو مجبوراً کرنا پڑی تھی - مدرسے کے باضابطہ ماحول کی بدولت وہ بہت سی صریحی غلطیوں سے بچ جائیں گے جن میں پڑکر بعض مرتبہ انسانوں نے چھوٹی چھوٹی دریافتوں میں صدھا برس لگادیے ہیں - اور ان کی علمی ترقی زیادہ یقینی اور اس کی رفتار تیزتر ہو جائے گی - یہی فطرت کی تعلیم اور انسانوں کی اِرادی تعلیم کا فرق ہے - مگر جہاں مدرسۂ جدید ان کے لیے ایک حد تک محفوظ ماحول مہیا کرے گا وہاں وہ اس بات پر بھی زور دے گا کہ طلبہ ان علوم کی تحصیل میں پوری پوری کوشش کریں، ان عملی مشاغل میں حصہ لیں جن کا ان علوم سے تعلق ہے، روزمرہ کی زندگی سے ان کا رشتہ پہچانیں اور یہ دیکھیں کہ نسل انسانی کس طرح آہستہ آہستہ جہالت اور عطائی واقفیت کی منزل سے گزر کر علم اور عمل کی منزل

تک پہنچی ھے - اس قسم کے عملی مشاغل کا استعمال صرف علوم صحیحہ تک محدود نہیں بلکہ معاشری علوم کی تحصیل میں بھی ان سے اسی طرح کام لیا جا سکتا ھے - مدارس جدید کا تجربہ اس خیال کی تصدیق کرتا ھے اور حال میں تعلیمی تجربات کے جو حالات شائع ہوئے ھیں ان کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ھے کہ جا بجا معلموں نے یہ کوشش کی ھے اور اس میں کامیاب ہوئے ھیں کہ تاریخ، جغرافیہ، ادب وغیرہ کو بطور "رسمی مضامین" کے نہ پڑھائیں بلکہ ان سے طلبہ کے گرد و پیش کی زندگی میں تشریح کا کام لیں اور انھیں عملی مشاغل کی شکل میں پیش کریں -

"مبتدیوں کے لیے معاشیات اور مدنیات کے علوم تک رسائی حاصل کرنے کا بہترین راستہ یہ ھے کہ انھیں نہ معلوم ہو کہ معاشری زندگی میں صنعتی مشاغل اور کار و بار کا کیا درجہ رہا ھے - بلکہ اونچے درجوں کے طلبہ کے لیے بھی ان علوم کی حیثیت بالکل مجرد اور رسمی علوم کی نہ رھے گی جیسی کہ اب ھے - اگر ہم اُن کو بجائے باضابطہ علوم کے طور پر پڑھانے کے ان کا مطالعہ اس نظر سے کریں کہ ان کے اصول اور مسائل ان تمدنی گروھوں کی زندگی میں کس طرح ظاہر ہوتے ھیں جن میں طالبہ خود شریک ھیں" -

اس عبارت سے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کی مراد یہ ھے کہ تاریخ 'معاشیات' مدنیات' انسانی جغرافیہ وغیرہ کو بھی اسی طرح نہ پڑھانا چاھیے - گویا وہ مخصوص فنون ھیں

جو ایک خاص منطقی ترتیب کے مطابق مدون کیے گئے ہیں اور جن کی تحصیل طلبہ پر کسی نامعلوم مصلحت کی وجہ سے فرض کر دی گئی ہے - بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے گرد و پیش کے انسانی مشاغل، تعلقات اور کاروبار کو اپنا نقطۂ آغاز بنائیں اور بچوں کو مشاہدے، عملی تجربے اور تقلیدی مشاغل کے ذریعے ان سے اچھی طرح روشناس کریں - اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کے تجربات اور مشاہدوں کی بنیاد پر ان "علوم" کی عمارت قائم کریں - تعلیم کے بنیادی عناصر دو ہیں - انسان اور اس کی زندگی اور طالب علم اور اس کے فطری رجحانات - علوم کی مروجہ ترتیب و تنظیم ایک ثانوی چیز ہے، جو محض بالغوں کے دماغ کی مخصوص منطق کا عکس ہے - یہ ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ خود اپنی کوشش کے ذریعے اپنی معلومات میں یہ ترتیب پیدا کرے - ابتدا ہی سے بچوں پر اس خارجی ترتیب کا عائد کرنا ان کی ذہنی تربیت کو روکنا ہے - مروجہ مدارس کی ایک بہت بڑی غلطی یہی رہی ہے کہ انھوں نے علم کے ایک غلط تصور کو بت بناکر پوجنا شروع کر دیا اور بچوں کی زندگی کی ضروریات اور ان کے شوقوں کو اس پر قربان کر دیا -

اونڈل (Oundel) پبلک اسکول کے مشہور ہیڈ ماسٹر سونڈرسن (Sanderson) نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں انگلستان کے ایک مدرسۂ عمل کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے - اُس نے اپنی بلند نظری، اپنی قوت فکر و عمل کی بدولت اپنے اسکول کو جمود کی حالت سے نکال کر ملک کے بہترین ترقی پذیر اسکولوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا - اس کے

حالات اور تعلیمی خیالات کے متعلق دو نہایت دلچسپ اور سبق آموز کتابیں حال میں شائع ہوئی ہیں - جن کا مطالعہ معلموں کے لیے بہت مفید اور ہمت افزا ہے ۱ - ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک شخص اپنے خلوص اور محنت کی بدولت ان رکاوٹوں اور مشکلوں پر قابو پا سکتا ہے جو بالعموم مصلحین تعلیم کو پیش آتی ہیں - اس میں شک نہیں کہ مالی اعتبار سے اس کو بعض آسانیاں حاصل تھیں، جو ہمارے یہاں مدرسوں کو نصیب نہیں ہیں اور محکمۂ تعلیم کی طرف سے قیود اور قوانین بھی اس قدر سختی کے ساتھ عائد نہیں کیے گئے تھے لیکن پبلک کی مخالفت اور جمود اور قدامت پسندی کے خلاف اس کو بھی بالکل اسی طرح جنگ کرنی پڑی تھی جس طرح ایک ترقی پسند معلم کو ہمارے ملک میں کرنی پڑتی ہے - اس نے ایک مرتبہ لندن میں تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کے تصور میں مدرسے کا جو نقشہ ہے اس میں کن چیزوں پر زور دیا جائے گا اور تعلیم اور قومی ضروریات میں کس طرح ربط قائم ہوگا :—

"میں جس تبدیلی کی اہمیت پر زور دے رہا ہوں - اس کے لیے ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت ہوگی - نئی قسم

۱—ان میں سے ایک کتاب ویلز (Wells) نے - The story of a great School master (ایک بڑے معلم کی کہانی) کے نام سے لکھی ہے اور دوسری جو زیادہ ضخیم اور مفصل ہے، سینڈرسن کے شرکاے کار نے اپنی متفقہ کوشش سے مرتب کی ہے اس کا نام "Sanderson of Oundle" ہے - دونوں میں سینڈرسن کی تحریروں اور تقریروں سے کافی اقتباسات دیے گئے ہیں -

کی عمارتیں بنانی پڑیں گی اور درسی مضامین کی اضافی قدر میں بہت بڑا انقلاب ہو جائے گا - سائنس جو ایک نیا مضمون ہے اور جدید صنعت و حرفت جو اس سے پیدا ہوئی ہے دونوں کو مدرسے کے تمام شغل میں ایک نمایاں اہمیت حاصل ہوگی - اب یہ کہنا کافی نہیں کہ مدرسے میں سائنس پڑھانی چاہیے اس کا وقت گزر چکا ہے - ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس کو مدرسے کی زندگی کا روح رواں بنا دینا چاہیے - سائنس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں تخلیق اور اشتراک عمل لازم ہے - اس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر یعنی ترقی اور تبدیلی کی طرف رہتی ہے - اس کے معنی ہیں تلاش حق جس کے لیے عملی تحقیق اور تجربے کی ضرورت ہے - اس کی بنیاد تقلید پر نہیں ہے - اس نئی تعلیمی روح کے زیر اثر ہمیں تمام مضامین یعنی تاریخ، ادب، آرٹ بلکہ زبانوں کو بھی از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے -

"اس تبدیلی کی وجہ سے مدرسوں میں نئے قسم کے سامان و آلات اور عمارتوں کی ضرورت پیش آئے گی جن میں صرف "پڑھائی کے کمرے شامل نہ ہوں گے بلکہ عملی کام کرنے کے لیے بڑے بڑے فراخ ہال درکار ہوں گے - موجودہ مدارس کے کمروں میں بچے محض "پڑھائے" جاتے ہیں - وہ گویا ذہنی اوزار تیز کرنے کی جگہیں ہیں جو یقیناً ضروری ہیں لیکن ان کی اہمیت ثانوی ہے - علمی تحقیق اور تخلیقی اور اشتراکی کاموں کے لیے بڑے بڑے ہال درکار ہوں گے، انجینیری اور نجاری کے لیے بہت وسیع کمرے

جن میں ہر قسم کی مشینیں اور اوزار مہیا ہوں - ایک لوہار خانہ، ایک دھاتیں ڈھالنے کا کمرا، ایک بڑھئی کی کارگاہ، ایک ڈرائنگ کا کمرا جن میں صنعت و حرفت کے مختلف کام کیے جائیں گے اور ہر عمر کے طلبہ کے لیے مناسب مشاغل مہیا ہوں گے -

''اس کے علاوہ ایک بہت وسیع ادبی اور تاریخی کارگاہ بھی ہوگی جس میں ایک بڑا کتب خانہ ہوگا جہاں جدید علوم کی کتابیں اور کتب حوالہ‌جات موجود ہوں گی - اس عمارت کے دونوں پہلوؤں میں کمروں کا ایک سلسلہ ہوگا جن میں مختلف قدیم و جدید علوم، تاریخ، اقتصادیات، ادب اور سائنس وغیرہ پر غیر زبانوں کی کتابیں فراہم کی جائیں گی - ایسی کتابیں جتنی زیادہ ممکن ہوں، مہیا کرنی چاہئیں تاکہ طلبہ کے دل میں دوسری قوموں سے ہمدردی اور ان کا احترام پیدا ہو، اُنھیں ان کے متعلق واقفیت حاصل ہو اس طرح زندگی کے ایک زیادہ وسیع اور گہرے نصب‌العین کی بنیاد پڑے - اسی طرح ایک اور گیلری میں جغرافیہ، علم موالید اور علم‌الاقوام کی کتابیں ہوں گی -

''ایک اور عمارت سائنس کے لیے مخصوص ہوگی جس میں انجینیری کا معمل ہوگا، مشینوں کا کمرا ہوگا، طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کے معمل ہوں گے، جن میں ہر قسم کے ضروری آلات اور سامان اور عملی کام کے لیے مشینیں ہوں گی جن کی مدد سے طلبہ جدید تحقیقات میں حصہ لے سکیں گے - مثلاً آلات کو جانچنے کی مشینیں

وغیرہ - (علاوہ ان کے علم نباتات کا مطالعہ کرنے کے لیے باغ اور کاشتکاری کے لیے زمین بھی ہوگی -)

"ایک اور حصے میں آرٹ اور موسیقی کے لیے کمرے ہوں گے، تھیٹر کا ہال ہوگا اور ایک ایسا کمرا ہوگا جس میں طلبہ صنعتی زندگی کے ارتقاء اور صنعت و حرفت کے نمونوں کا مطالعہ کر سکیں گے -

"یہ کوئی خیالی یا ناممکن تجویز نہیں بلکہ ہر شہر اور ملک کے مقدور میں ہے" ۱ -

"مدرسۂ عمل" کی یہ تصویر ہمارے ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے قریب قریب ناممکن العمل معلوم ہوتی ہے - اس میں شک نہیں کہ ان تمام سامان، اور آلات کا مہیا کرنا سوائے خاص خاص مدارس کے اور کہیں ممکن نہیں لیکن ایک حد تک ہر مدرسہ اس کے تعلیمی اصول پر یقیناً عمل کرسکتا ہے اور ہم آئندہ چل کر بتائیں گے کہ نصاب کی تدوین اور تعلیم کس طرح کی جائے کہ اس سے مذکورۂ بالا مقاصد حاصل ہوسکیں - فی الحال ہمیں مدرسۂ عمل کی اس امتیازی خصوصیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ وہ 'کتاب' کے بجائے تخلیقی اور اشتراکی 'کام' کو اپنی تعلیم کی بنیاد بناتا ہے اور طلبہ کو ایسے مشاغل میں لگاتا ہے جن میں اُنھیں اپنی جسمانی اور دماغی قوتوں کی ہم آہنگ تربیت کا موقع ملے - اس مدرسے میں تہذیب (Culture) کی بنیاد بھی کتابی علوم پر نہیں رکھی جاتی، بلکہ طلبہ

۱—The Story of a Great School Master صفحہ ۱۳۶ -

میں اس حقیقی تہذیب کو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی
ہے جو خود کام کرنے اور اس کے معاشری اور اخلاقی نتائج کو
سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے - یہ وہ تہذیب ہے جو ممکن ہے
ایک مستعد، خوش دل مزدور میں یا اس کاشتکار میں جو
اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مفید کام کرتا ہے پائی جائے اور
ایک عالم یا ادیب یا فنون لطیفہ کے ماہر کو اس کی ہوا بھی
نہ لگی ہو !

باب سوم

"ذھنی تربیت"

ہم نے گزشتہ باب میں مدرسۂ عمل کی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کی بنیاد عملی مشاغل پر رکھنی چاہیے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم طلبہ کو محض دستکار بنانا چاہتے ہیں اور ان کی علمی اور دماغی تربیت کو مقابلتاً غیر اہم سمجھتے ہیں - تعلیم کے عملی پہلو پر زیادہ اصرار کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہمارے مروجہ مدارس میں تعلیم دینے اور کتابیں پڑھانے کو بالکل ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے صلاحیت عمل مفقود ہوتی جاتی ہے - مگر یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہم ان میں ایسی "عملیت" پیدا کرنی نہیں چاہتے جو محض چند مقررہ افعال پر منحصر ہو جن کو وہ بطور ایک معمول کے انجام دے سکیں - ایک مزدور جو اینٹیں ڈھو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے یقیناً کام کر رہا ہے لیکن اس کام کو سکھانے کے لیے مدرسے کی ضرورت

نہیں - وہ ایک مفید خدمت ضرور ہے لیکن اس سے مزدور کو کوئی دماغی تربیت یا فائدہ حاصل نہیں ہوتا - اسی طرح اگر مدرسے میں کوئی بچہ پیشے کے طور پر نجاری کا کام سیکھے یا مشینوں کے چلانے میں یا باغبانی یا کاشتکاری وغیرہ میں ماہر ہو جائے تو گو یہ چیزیں بجائے خود مفید اور عمدہ ہیں لیکن ان سے اس کے تعلیمی مقاصد کے حصول میں مدد نہیں ملتی - ہمارے مدارس کو ہر لحاظ سے ایک تعلیمی ماحول ہونا چاہیے نہ کہ پیشہ‌آموز درسگاہیں - اور انہیں اپنے تمام مشاغل اور نصاب کی ترتیب و تدوین اس طرح کرنی چاہیے کہ ان کے ذریعے طلبہ کی ذہنی تربیت بخوبی ہو سکے - اس لیے ہمیں انتخاب مشاغل کے بعد اس مسئلے سے بحث کرنی ہے کہ طلبہ کی ذہنی تربیت کن اصولوں کے ماتحت دی جائے -

ذہنی تربیت کے لیے ایک شرط لازم یہ ہے کہ طلبہ جو کچھ کام کریں اس میں ان کو اپنی قوت فیصلہ کو استعمال کرنے، وسائل اور ذرائع کو کسی مقصد خاص کے ماتحت ترتیب دینے اور اپنی مشکلات کو ذاتی کوشش سے حل کرنے کا موقع ملے - دماغ پر زور ڈالنے اور تدبیریں سوچنے کی ضرورت ہمیں صرف اس وقت پڑتی ہے جب ہم کسی مشکل مسئلے سے دوچار ہوں اور اس کا حل ہمیں معلوم نہ ہو - ایسی حالت میں ہم پہلے ایک تدبیر سوچتے ہیں اور اسے آزماتے ہیں، اگر وہ تدبیر نہیں چلتی تو کسی اور تدبیر سے کام لیتے ہیں اور اس طرح اپنی ناکامیوں سے سبق لے کر رفتہ رفتہ کامیابی حاصل کرتے ہیں - یہ اصول چھوٹے بچوں کی معمولی

کوششوں اور بڑے بڑے عالموں کی تحقیق سب پر برابر عائد ہوتا ہے - جب چھوٹے بچے کوئی نئی بات سیکھتے ہیں خواہ وہ کوئی علم ہو یا ہنر تو وہ اس میں یہی طریقۂ عمل اختیار کرتے ہیں؛ کیونکہ یہی ان کی فطرت کے قوانین کے ساتھ ہم‌آہنگ ہے - یہ سچ ہے کہ مدرسوں کا طریقۂ تعلیم اکثر اس سے مختلف ہوتا ہے - استاد بالعموم ہر بات کو بالکل صاف اور واضح کر دیتے ہیں اور سبق کو ان کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور بچے انفعالی طریقے پر اس کو سمجھ لیتے ہیں اور یاد کر لیتے ہیں - یہ بھی ''سیکھنے'' کا ایک طریقہ ہے لیکن اس طرح سیکھنے میں ذہنی جدت اور تیزی پیدا نہیں ہوتی - اگر ہمارا مقصد طلبہ کی تعلیم سے یہ ہے کہ ان میں مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے اور مشکلات سے عہدہ‌برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو تو ہم اس قسم کی تعلیم کو کسی طرح مناسب اور تشفی بخش قرار نہیں دے سکتے - اس معاملے میں ہمیں فطرت اطفال اور ان کی نشو و نما کے قوانین سے سبق لینا چاہیے اور یہ مشاہدہ کرنا چاہیے کہ بچے مدرسے آنے سے پہلے اپنی عمر کے ابتدائی چند سال میں کس طرح بہت سی اہم‌ترین باتیں سیکھتے ہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ہوسکتی ہے - بچہ کسی کھلونے کو لینا چاہتا ہے جو ایک میز پر رکھا ہوا ہے - وہ اس کی طرف بڑھتا ہے - راستے میں پلنگ یا کوئی اور رکاوٹ حائل ہے - وہ اس سے ٹکراتا ہے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر یا تو اس چیز کو ایک طرف ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر

یہ اس سے ممکن نہیں تو اس کے گرد چکر کاٹ کر میز تک
پہنچتا ہے - وہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ
کھلونے تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس کا قد چھوٹا ہے
اور میز اونچی ہے - اب اسے یہ مسئلہ در پیش ہے کہ کھلونے
تک کیسے پہنچے - ممکن ہے وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوکر یا
اچھل کر کھلونا حاصل کر لے - اگر یہ ترکیب بھی نہ چلے
تو شاید کوئی کرسی یا مونڈھا کھینچ کر لائے اور اس پر
چڑھ کر کھلونا میز پر سے اتارے اور اس طرح اپنے مقصد میں
کامیاب ہو جائے - یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس طرح بھی
کھلونا نہ پا سکے تو کسی دوسرے شخص سے مدد مانگے یا
اپنی پہنچ اور قابلیت کی کوتاہی کا احساس کر کے اس
مقصد سے بالکل ہی دست بردار ہو جائے - اب ذرا اس
سلسلۂ حرکات کا تجزیہ کیجیے - ان کی محرک بچے کی
ایک فطرتی خواہش (یعنی کھیل) ہے جس کو وہ تشفی
کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کی تمام کوششیں اور ان کی
ترمیم اور تبدیلی ایک خاص مقصد' ایک مستقل ارادے
کی تابع ہیں - اس کو کسی نے پہلے سے یہ نہیں بتایا کہ
اگر کھلونا لینا چاہتے ہو تو فلاں طریقۂ عمل اختیار کرو -
وہ اپنے معمولی مشاغل کے دوران میں ایک مشکل کا سامنا
کرتا ہے اور اس کو حل کرنے کے لیے اپنے دماغ پر زور ڈال کر
ایک تدبیر سوچتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے - اگر اس سے
کامیابی نہیں ہوتی تو دوبارہ اُسی تدبیر کو استعمال نہیں
کرتا - یا ممکن ہے دو تین بار آزمانے کے بعد اسے یہ اندازہ
ہو کہ یہ تدبیر نہیں چلے گی اور پھر وہ اسے ترک کرے -

بہر حال اب وہ کوئی اور تدبیر سوچتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے یا اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ کامیابی ناممکن ہے - اس صورت حال میں شروع ہی سے ایسے امکانات موجود ہیں جو اس کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو دعوت عمل دیتے ہیں اور اس میں کوشش اور جد و جہد کی خواہش کو اُبھارتے ہیں - اس کو جو کچھ تجربہ اس کوشش کے دوران میں حاصل ہوتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس کی قوت عمل اور معلومات کا جزو ہو جاتا ہے - اگر اس طول عمل کے بجائے ہم شروع ہی میں اسے یہ بتا دیتے کہ کرسی پر چڑھ کر میز پر سے کھلونا اتار لو یا خود کھلونا میز پر سے لے کر اسے دے دیتے تو اس کو ہرگز وہ ذہنی تربیت حاصل نہ ہوتی جو اس صورت میں ہوئی - یہی حال علمی تحقیق و تفتیش اور پختہ کار ماہرین کی جد و جہد کا ہے - یہ صحیح ہے کہ ان کو اپنے ماحول کا زیادہ علم اور اس پر زیادہ قابو ہوتا ہے - وہ علم حاصل کرنے کے ذرائع سے واقف ہوتے ہیں اور اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ انہیں حسن اتفاق سے کوئی نیا مشاہدہ یا تجربہ حاصل ہو جائے بلکہ وہ خود ایسے حالات پیدا کرتے ہیں اور واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ نئے مشاہدے اور تجربے کرسکیں - لیکن باوجود اس تمام فرق کے ان کا تحصیل علم کا طریقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بچوں کے طریقے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں - ان کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علمی اور عملی مشاغل کے دوران میں کسی ایسے مسئلے یا مشکل

سے دوچار ہوں جس کو حل کیے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہو۔ اس حل کو دریافت کرنے کے لیے وہ اپنے سابق تجربے اور تخیل کی مدد سے کوئی فرضیہ یا نظریہ قائم کرتے ہیں اور اس کے مطابق حالات کو مرتب کر کے دیکھتے ہیں کہ ان کا متوقع نتیجہ پیدا ہوتا ہے یا نہیں - اگر وہ فرضیہ جو گویا پہلی مثال کی "تدبیر" کا قائم مقام ہے، کامیاب نہیں ہوتا تو وہ کوئی دوسرا فرضیہ قائم کرتے ہیں اور اس کے ماتحت مختلف قسم کے آلات اور وسائل کی مدد سے تجربے کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں سے سبق لے کر رفتہ رفتہ اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں جس کی ان کو تلاش تھی - سوائے ان چند بڑی علمی دریافتوں کے جن کی ابتدا کسی اتفاقی تجربے یا مشاہدے سے ہوئی ہے علم کو بالارادہ حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے اور اسی کو موجودہ زمانے میں "علمی طریقے" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو شاید دور حاضر کی سب سے اہم اور قابل قدر دریافت ہے اور جس نے انسان کی ترقی کے امکانات کا دائرہ بے حد وسیع کر دیا ہے - تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ طلبہ میں ایسی قابلیت پیدا کرے کہ وہ دوسروں کی رائے اور حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بجائے تحصیل علم میں فعالی طور پر حصہ لیں اور خود سوچ سمجھ کر اپنے افعال کی ذمہ‌داری قبول کریں اور اپنی رہنمائی کا فرض انجام دیں - عموماً ہر ملک میں جمہور ان صفات سے محروم ہیں - خصوصاً ہندوستان میں تو بدقسمتی سے یہ عالم ہے کہ لوگ ہر قسم کے معاملات میں بالخصوص معاشرتی اور اخلاقی مسائل میں، رسمی عقائد

کی پناہ ڈھونڈتے ہیں اور مروجہ طرز خیال کے سہارے اندھوں کی طرح ایک راستے پر چلتے رہتے ہیں - ان میں نئے خیالات سے متاثر ہونے اور فکر و عمل کی دنیا میں آزادی اور جرأت کے ساتھ نئی راہیں تلاش کرنے کی صلاحیت ہی نہیں - نہ اُنہیں ابھی تک تلاش حق کا شوق پیدا ہوا ہے اور نہ تجربی طریقے کی ہوا لگی ہے - اس کی جہاں اور بہت سی وجوہ ہیں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مدرسوں کی تعلیم بالعموم طلبہ کے ذہن کو معطل رکھتی ہے اس میں ہر بات کے متعلق تحکمی اور قطعی واقفیت ٹھونس دی جاتی ہے جسے حاصل کرنے میں انہیں ذہنی کاوش سے مطلق کام نہیں لینا پڑتا - یہ طریقہ نہ صرف ان مضامین کی تعلیم میں رائج ہے جن کا مقصد ایک حد تک مفید معلومات کا مہیا کرنا ہے بلکہ ان مضامین میں بھی جن کا مخصوص تعلیمی مقصد ہی یہ ہے کہ وہ طلبہ میں ذہنی اجتہاد اور قوت فکر پیدا کریں -

اس بحث سے معلم کے لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب وہ اپنے مدرسے میں تعلیمی مشاغل کو رائج کرے تو اسے یہ نہیں چاہئے کہ وقت، محنت اور سامان کی کفایت کے خیال سے بچوں کو پہلے ہی سے کام کرنے کا مفصل طریقہ بتا دے بلکہ مسائل اور مشکلات کو اُن کے سامنے پیش کرنے کے بعد ان کا حل کرنا اُنہیں پر چھوڑ دے اور خود صرف ان کی نگرانی اور ہدایت کرتا رہے اور ان کی دلچسپی کو قائم رکھے - اگر وہ ان کے سامنے ایک بنا بنایا نمونہ پیش کردے جس سے کام کے تمام مدارج ان کی سمجھ میں آ جائیں یا وہ

خود انہیں کام کرکے دکھا دے تو بچوں کے لیے بس یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ بغیر کسی دماغی جد و جہد کے انفعالی طریقے پر اس کی نقل اتار لیں - ممکن ہے کہ بار بار مشق کرنے سے اس خاص کام میں انہیں مہارت پیدا ہو جائے اور وہ اس کو آسانی اور تیزی کے ساتھ کرنا سیکھ لیں لیکن اس میں انہیں یہ موقع کہاں ملے گا کہ اپنی قوت انتخاب سے کام لے کر فیصلہ کریں کہ انہیں مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو سب سے زیادہ مناسب ثابت ہو؟ اس میں شک نہیں کہ اگر اُستاد اور شاگرد دونوں اس سہل اور محفوظ طریقے کو اختیار کریں گے تو وہ بہت سی غلطیوں سے بچ جائیں گے، سامان اور آلات کا جو صرف بچوں کے عملی کام میں ہوتا ہے اس میں بہت کفایت ہوگی اور اگر محض نمائشی تعلیم مقصود ہو تو "نتائج" بھی بہت جلد حاصل ہو جائیں گے یعنی بچے بغیر سوچے سمجھے چند مقررہ حرکات کو انجام دے سکیں گے - لیکن زندگی کی کشمکش اور جد و جہد میں ایسے "نتائج" سے کام نہیں چلتا - کیونکہ وہاں ہر ذی‌شعور انسان کو جس کی زندگی محض نقالی اور احکام کی بجا آوری تک محدود نہیں، آئے دن ایسے مسائل اور واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن میں قوت فیصلہ کی اور اپنی آزادانہ رائے قائم کر کے اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے - زندگی میں کامیابی کے لیے فعالیت کی ضرورت ہے - اس کی تربیت دینے کے لیے مدرسے کو ایسا طریقۂ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ طلبہ نئے مواقع اور نئے حالات سے دوچار ہو کر ان سے عہدہ‌برآ ہونے کی تدبیریں سوچ سکیں -

موجودہ علم نفسیات اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا کہ جو دماغی قوت انسان کسی خاص کام کو سیکھنے یا کسی خاص مضمون کے مطالعے سے حاصل کرتا ہے وہ ہر کام اور ہر مضمون میں استعمال ہو سکتی ہے - انسان کا دماغ کوئی چاقو نہیں کہ اگر اسے پتھر پر رگڑ لیا جائے تو وہ ہر چیز کو کاٹ دے گا خواہ وہ لکڑی ہو یا کپڑا یا کاغذ - پرانا نظریہ جس کو جدید نفسیاتی تحقیقات اور مشاہدے نے مسترد کر دیا ہے یہ تھا کہ اکتسابی قوت ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع میں جوں کی توں منتقل ہو سکتی ہے یہ نظریہ جس کو انگریزی میں Transfer of Training (انتقال قوت اکتسابی) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے عرصے سے ماہرین نفسیات کے درمیان ما بہ النزاع ہے - اس مسئلے کے متعلق موجودہ نقطۂ نظر بحیثیت مجموعی اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص قابلیتیں جو کسی علم یا فن سیکھنے کے دوران میں حاصل ہوتی ہیں منتقل نہیں ہو سکتیں - مثلاً اگر کوئی شخص ریاضی کی تعلیم اور مطالعے کی وجہ سے ریاضی کے مسائل کو اچھی طرح حل کر سکتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے بالکل مختلف قسم کے معاملات مثلاً سیاسی یا اخلاقی مسائل پر بھی ذہانت اور قابلیت سے بحث کرے گا - البتہ اگر مناسب طریقۂ تعلیم اختیار کیا جائے تو بعض عام ذہنی رجحانات اور صلاحیتیں' تحصیل علم کے گر' نئے مسائل پر غور کرنے کے طریقے' ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو سیکھ کر انسان نہ صرف ایک خاص کام کو اچھی طرح کر سکتا

ہے جس کو اُس نے سیکھا ہے بلکہ جس کام کو بھی کرنا چاہتا ہے اُس میں ذہنی عادتیں مفید اور معاون ہوتی ہیں - فرض کیجیے ایک شخص کو مختلف قسم کے کار و بار اور مشاغل میں یہ عادت پڑ گئی ہے کہ وہ جب کوئی نیا کام کرتا ہے تو اپنے مقصد اور ذرائع کا جائزہ لیتا ہے، اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کوئی طریقۂ عمل تجویز کرتا ہے اور اس کے مطابق اپنے وسائل اور ذرائع کی ترتیب و تنظیم کرتا ہے اور پھر اپنے عمل کے نتائج سے سبق اور تجربہ حاصل کر کے آگے قدم بڑھاتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے یہ تمام طریقۂ کار اور اس کے ساتھ جو ذہنی عادتیں وابستہ ہیں وہ مختلف قسم کے بےشمار کاموں اور مواقع میں استعمال ہو سکتی ہیں - اگر کوئی شخص جنگل میں اپنا راستہ بھول گیا ہے اور چاہتا ہے کہ صحیح راستے پر پڑ جائے تو یہ طریقہ اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا - اگر وہ سائنس یا صنعت و حرفت کے کسی مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہے تو اُس کو یہی سلسلۂ عمل اختیار کرنا پڑے گا - اگر وہ کسی بڑے تجارتی کار و بار میں مصروف ہے تو اسے اپنی تجارتی پالیسی اسی طرح معین کرنی ہوگی - اگر وہ کسی کمیٹی یا کونسل میں انتخاب کے لیے اُمیدوار ہے تو بھی اس کو لازم ہوگا کہ اپنے تمام وسائل اور ذرائع کا جائزہ لے اور ایک معین مقصد کے خاطر ان کی تنظیم کرے - غرض بہت سی صورتوں میں انسان اس طریق عمل سے فائدہ اٹھا سکتا ہے - لہذا مدرسۂ جدید کے معلم کو اس غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کسی خاص درسی مضمون کے مطالعے سے طلبہ کی

مختلف ذہنی قوتوں کی ترتیب ہو جائے گی اور وہ اسی کی بدولت ہر قسم کی مشکلات سے جو زندگی میں پیش ائیں انہیں عہدہبرآ ہو سکیں گے - مثلاً اگر ان کا دماغ منطق اور ریاضی کے پیچیدہ مسائل میں منجھ گیا ہے تو یہ مخصوص قابلیت زندگی کی عملی گتھیوں کو سلجھانے اور تمدن و معاشرت کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دے گی - بلکہ اسے یہ کرنا چاہیے کہ ان کے تمام مسائل اور اسباق کو اس اصول پر ترتیب دے کہ انہیں مختلف مضامین میں اور مختلف مواقع پر ذہنی اجتہاد اور قوت فیصلہ کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے' نئے طریقوں کو آزمانے کے لیے آمادگی پیدا ہو اور وہ ہر کام کے لیے کسی بنے بنائے راستے' کسی سیکھے سکھائے قاعدے کے محتاج نہ رہیں - اس کا ایک بہت اہم فرض یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ طلبہ کو اپنی مدد اور اپنے سہارے سے بےنیاز کر دے اور ان کو خود اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سکھائے - اچھے ڈاکٹر کی طرح' اچھے استاد کی پہچان بھی یہی ہے کہ اس کی طرف رجوع کرنے والے کچھ عرصے کے بعد اس کی امداد اور رہنمائی سے آزاد ہو کر خود اپنی نگہداشت کر سکیں - یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب استاد شروع ہی سے طلبہ کو اس طرح تعلیم دے کہ وہ آزادی کے ساتھ کام کر سکیں اور اپنی رائے اور فیصلے پر بھروسا کرنا سیکھیں - البتہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خودسری سے کام نہ لیں' اپنی رائے پر بےجا اصرار نہ کریں اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے اور ان سے سبق سیکھنے کے لیے ہمیشہ تیار رہیں - ممکن ہے کہ اس طریقے پر عمل

کرنے سے ان کو نئے مضامین پر بہت جلد قدرت حاصل نہ ہو یعنی وہ ان کو "جلد" یاد نہ کر سکیں یا ان کے ہاتھ میں بہت تھوڑے وقت میں صفائی اور سلیقہ پیدا نہ ہو اور جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ نمائشی نتائج نہ دکھا سکیں - لیکن اس کمی کی پوری پوری تلافی اس طرح ہو جاتی ہے کہ طلبہ میں ایک عام ذہنی بیداری پیدا ہوتی ہے اور ان میں تعمیر و تخلیق کا شوق اور جدت و اجتہاد کی صلاحیت تربیت پاتی ہے جو اعلیٰ فوری اور عارضی نتائج سے زیادہ قیمتی اور قابل قدر ہے - مروجہ نصاب کے درسی مضامین کی تعلیم پر اس اصول کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے بعض مضامین تو ایسے ہیں جو صریحاً اس اصول کے تحت میں آتے ہیں مثلاً وہ تمام علوم جن کو شعبۂ سائنس سے تعلق ہے - سائنس علوم انسانی کی وہ شاخ ہے جو تمام تر ہماری کوشش اور تخلیق کا نتیجہ ہے - جب انسان کا دماغ اپنے طبعی ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور مظاہر فطرت کے پوشیدہ قوانین کو دریافت کرنے کے لیے مشاہدات اور تجربات سے کام لیتا ہے تو وہ گویا سائنس کی تشکیل کر رہا ہے - اس کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اپنی تدوین اور ترقی کے لیے انسان کی دریافت اور جستجو کی مرہون منت ہے - اگر مدرسے میں ہم اس خصوصیت کو نظرانداز کر دیں اور استاد طلبہ کو ہر بات بتا دیا کرے یا زیادہ سے زیادہ انہیں چند مقررہ تجربات کر کے دیکھا دیا کرے تو سائنس کا تعلیمی مقصد بالکل فوت ہو جائے گا - ان تمام طبیعی، کیمیاوی، حیاتیاتی علوم کے پڑھانے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنے مادی ماحول کی قوتوں اور مظاہر کو

سمجھیں اور ان سے کام لینا سیکھیں؛ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ کام لینے کے ذریعے سے ان کو سمجھیں - کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی طالب علم بغیر ذاتی تجربے اور عمل کے سائنس کے کسی اصول یا حقیقت کو محض لفظی بیان اور تشریح سے پوری طرح سمجھ جائے - اس کے لیے ہمیشہ یہ ضرورت ہے کہ انھیں براہ راست سائنس کے آلات اور خواص اشیا کا تجربہ ہو، وہ ان کو مختلف حالات میں دیکھیں اور ان حالات کو بدل کر اس تبدیلی کے اثرات پر غور کریں اور اس طرح رفتہ رفتہ ان کے نتائج تک پہنچیں جو ممکن ہے ان کے استادوں اور ماہرین سائنس کے لیے بالکل پیش پا افتادہ ہوں لیکن خود ان کے لیے بڑی حد تک ایک نئی دریافت کی شان رکھتے ہیں - اسی اصول سے متاثر ہوکر زمانۂ حال میں سائنس کی تعلیم میں بہت انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں اور تمام مدارس جدید میں پرانی کتابی تعلیم کو ترک کرکے جو سوائے حافظے کے اور کسی دماغی قوت کی تربیت نہیں کرتی تھی، سائنس ایک عملی اور تجربی مضمون بنادی گئی ہے اور مدرسوں میں باقاعدہ معمل اور کارخانے قائم کیے گئے ہیں، جہاں طلبہ اپنے ہاتھ سے کام کرسکتے ہیں - وہ سائنس کی معلومات حاصل کرنے اور اس کو مرتب کرنے میں فعالی طور پر شریک ہوتے ہیں اور ایک حد تک انہیں حالات میں اور انھیں شرائط کے ماتحت کام کرتے ہیں جو سائنس کے محققین کے لیے درکار ہیں - اس کے عملی پہلو پر زور دینے کے لیے نہ صرف مدرسوں کے نصاب میں عملی کام کا عناصر بڑھا دیا گیا ہے بلکہ طلبہ کو صنعت و حرفت کے کارخانوں میں اور گرد و پیش کی زندگی

میں سائنس کی ایجادات اور ان کے استعمال کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی دیا جاتا ہے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ سائنس اور متمدن زندگی میں کس قدر قریبی تعلق ہے اور انسان نے کس طرح اپنی قوت تسخیر سے کام لے کر فطرت کی قوتوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے - معلموں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طلبہ سائنس کو محض چند اصولوں اور قاعدوں کا مجموعہ نہ سمجھیں بلکہ اس کی بدولت ان کے دل میں تسخیر فطرت کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو جائے - اس کوشش کا اظہار کہیں کہیں مخصوص اور مکمل تعلیمی طریقوں کی شکل میں ہوا ہے - مثلاً پروفیسر آرم سٹرونگ (Armstrong) کا "طریقۂ دریافت" (Heuristic Method) اور کہیں اس کا اثر عام ذہنی تربیت کی اصلاح میں نمایاں ہوا ہے، جس نے سائنس کے طریقۂ تعلیم اور اس کی داخلی روح میں انقلاب پیدا کر دیا ہے -

یہی اصول کسی قدر مختلف صورت میں دوسرے مضامین پر بھی عائد ہوتا ہے - مدرسے کے نقطۂ نظر سے جغرافیہ کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں - ایک وہ جو زیادہ تر مظاہر فطرت کے اسباب و نتائج سے بحث کرتی ہے مثلاً یہ کہ بادل کیسے بنتے ہیں، زمین کی سطح میں تبدیلیاں کیسے ہوتی ہیں، اجرام فلکی کی گردش سے زمین اور پانی پر کیا اثر پڑتا ہے، آب و ہوا اور پیداوار کا باہمی تعلق کیا ہے وغیرہ - جغرافیے کی اس شاخ کو "سائنس" کے مضامین میں شمار کرنا چاہیے - لیکن اس کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کا اصل موضوع انسان اور اس کے طبعی ماحول کا تعلق ہے یعنی اس

طرح کے مسائل کہ پہاڑ، دریا، بارش، کی پیداوار، صنعت و حرفت وغیرہ انسان کی زندگی پر کیا اثر ڈالتے ہیں اور انسان کس طرح ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کو اپنے قابو میں لاتا ہے - جغرافیے کے جتنے مسائل اس ضمن میں شامل ہیں وہ مدرسوں میں بالعموم اس طرح پڑھائے جاتے ہیں کہ ہر چیز کے متعلق جتنی واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے وہ بغیر کسی ترتیب کے بہت خشک، بےمزہ طریقے سے طلبہ کے سامنے بیان کردی جاتی ہے - مثلاً یہ کہ فلاں ملک میں کون سے پہاڑ ہیں، کتنے دریا ہیں، کس قدر بارش ہوتی ہے، کیا کیا پیداوار ہے، لوگ کس کس قسم کے کام کرتے ہیں اور ملک کی سیاسی تقسیم کس طرح کی گئی ہے - طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان تمام غیر مربوط اور بظاہر بےمقصد معلومات کو کسی نہ کسی طرح حفظ کر لیں یہ بجائے خود مستقل اہمیت رکھتے ہیں - بھلا بتائیے تو کہ حافظے پر اس طرح کا بوجھ ڈالنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ؟ فرض کیجیے طالب علم کو اپنی آئندہ زندگی میں کسی موقع پر کوئی جغرافی امر معلوم کرنے کی ضرورت آپڑے مثلاً وہ کسی غیر ملک میں سفر کرنا یا کسی پہاڑ کی سیاحت کرنا چاہتا ہے اور اس کے متعلق اسے واقفیت درکار ہے - ایسے موقع پر وہ اس سرسری واقفیت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو اس نے جغرافیے کے سبقوں یا کتابوں سے حاصل کی تھی - ضرورت کے وقت وہ ہر قسم کی معلومات کتابوں اور نقشوں سے حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ مفید مطالب واقفیت کو کتابوں سے نکال سکے - پھر ایسے

واقعات اور معلومات کو حافظے میں ٹھونس لینے سے کیا فائدہ جن سے نہ کوئی ذهنی تربیت هو، نہ ان کی بذات خود کوئی خاص اهمیت هو؟ لہذا جغرافیے کی تعلیم میں بھی همیں وهی اصول اختیار کرنا چاهیے جو هم نے اور تعلیمی مشاغل کے لیے ضروری قرار دیا هے - یعنی مدرسے میں بچوں کے سامنے مختلف قسم کے جغرافی مسائل پیش کیے جائیں جو ان کے اپنے مشاهدے میں آئے هوں اور ان کے ماحول سے تعلق رکھتے هوں، جن کے حل کرنے سے انھیں فطرتی طور پر دلچسپی هو - اس کی وجه سے بچوں کو اپنے ماحول کا زیادہ غور کے ساتھ مشاهده کرنا پڑے گا - انھیں مختلف قسم کی معلومات فراهم کرنی اور اس کی ترتیب و تنظیم کرنی هوگی جو ذهنی تربیت کا بہترین وسیلہ هے - ان کو اس مضمون میں آسانی کے ساتھ دلچسپی پیدا هو سکتی هے کیونکہ انسانی جغرافیے کی تمام معلومات ایک ایسے موضوع کے تحت میں لائی جا سکتی هے جو بچوں کے لیے فطرتاً دلچسپ هے - یعنی "انسان اور اس کی زندگی اور مشاغل" - یہ مربوط اور دلچسپ موضوع بچوں کے تمام جغرافی مطالعے کا مرکز بن جائے گا تو ان کی متفرق معلومات میں ربط اور نظم پیدا هوگا اور وہ اس کے منشا اور مفہوم کو سمجھ سکیں گے - هر سمجھدار استاد کو یہ چاهیے کہ بجائے اپنے طلبہ کو متفرق اور بے ترتیب باتیں بتانے اور یاد کرانے کے ان کے سامنے ایسے دلچسپ مسائل پیش کرے کہ مثلاً بتاؤ صحرائے افریقہ کے لوگ یا سوئستان کے باشندے کس قسم کی زندگی بسر کرتے هیں اور اس کے کیا اسباب هیں - اب اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ان کے پاس اٹلس موجود هے جس

کو مطالعہ کر کے اور اپنی قوت مشاہدے سے کام لے کر وہ بہت سے طبیعی حالات دریافت کر سکتے ہیں مثلاً زمین کی ساخت، پہاڑوں اور دریاؤں کی موجودگی یا غیر موجودگی، آب و ہوا وغیرہ - گزشتہ واقفیت کی بنا پر یا کسی جغرافیے کی کتاب کی مدد سے انہیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس آب و ہوا اور ایسے طبیعی حالات میں وہاں کس قسم کی پیداوار ہوگی اور کیا حیوانات پائے جائیں گے - اس معلومات کی بنا پر وہ وہاں کے باشندوں کے مشاغل اور طرز زندگی سے بحث کرسکتے ہیں اور استاد کے رہنمائی کرنے والے سوالوں کی مدد سے ان کی توجہ ایسے امور کی طرف رجوع ہو سکتی ہے جو اس معاملے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں - اسی قسم کی تعلیم سے جس میں ذاتی مشاہدے اور تجربے، باہمی مشورے اور کتابوں سے استفادے کا موقع حاصل ہوگا، ان کو مختلف انسانی مسائل اور مظاہر فطرت کا باہمی تعلق سمجھنے میں مدد ملے گی، ان کو غور و فکر کی قوت اور نتائج اخذ کرنے کی قابلیت نشو و نما پائے گی اور وہ جغرافیے کے مطالعے سے علم ذہنی تربیت حاصل کریں گے جو ان کی زندگی میں بہت سے موقعوں پر مفید ثابت ہوگی یہ تعلیمی اصول جس کی توضیح ہم نے ایک معمولی سی مثال کے ذریعے سے کی ہے - جغرافیے کے بہت سے مباحث پر عائد ہو سکتا ہے -

اسی طرح اگر ہم تاریخ پر بحیثیت ایک درسی مضمون کے نظر ڈالیں تو اس میں بھی اصلاح اور تبدیلی کی بہت گنجائش نظر آتی ہے - اس کی مطالعے کی ایک صورت تو وہ ہے جو ہمارے اکثر مدارس میں پائی جاتی ہے، جس میں

ضروری اور غیر ضروری ناموں اور سنوں اور تاریخی
ہو جانے کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔
مطالعے کی حیثیت اگر اس کے لیے "مطالعے"
مال کرنا جائز ہو بالکل وہی ہے جو اور بہت
(Impressions) کی، جن سے انسان کے بعض
تے ہیں لیکن اس کے دماغ یا اس کی زندگی
اثر نہیں پڑتا۔ فرض کیجیے ایک ناواقف
شخص کسی غیر ملک کے ایک بہت بڑے
یں جاتا ہے جہاں کی زبان وہ نہیں جانتا اور
، غیر مانوس آوازیں سنتا ہے اور اجنبی لوگوں،
ں اور کار و بار کو دیکھتا ہے۔ اس پر ان
اثر ہوگا؟ یہ سب آوازیں اور نظارے محض
سامعہ اور قوت باصرہ کو متاثر کرتے ہیں
وہ ان کے باہمی تعلق اور مفہوم سے واقف
س مقصد کو جو ان میں ربط پیدا کرتا ہے
یہ تمام متفرق تاثرات نہ اس کے علم میں
میں نہ اس کے عمل میں کوئی تبدیلی پیدا
ں کا ذہن انفعالی طریقے سے ان تاثرات کو
لیکن ان کا ادراک نہیں کر سکتا۔ یہی
ے طالب علم کا ہے جس کو بغیر کسی ذہنی
تجربے اور مشاہدے کے تاریخ کے ناپیدا کنار
دیا جائے کہ وہ اس کی لہریں گنا کرے
ہمی تعلق سمجھ سکتا ہے نہ اپنی زندگی کے
ندگی کو محسوس کرتا ہے۔ جب تاریخ کے

واقعات بےربط اور بےجان معلومات کی حیثیت سے طالب علم کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں جن کو کسی بیرونی دباؤ یا اثر کی وجہ سے اپنے حافظے میں محفوظ رکھنا ہے تو تاریخ کا مطالعہ نہ اس کے تجربے کو وسیع بنا سکتا ہے نہ معنی خیز ۔ وہ ماضی کے ارتقائی سلسلے کا تصور نہیں کر سکتا اور نہ یہ محسوس کر سکتا ہے کہ آج جو کچھ ہے وہ گزشتہ زمانے کے لوگوں کی متعدد کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ اس میں حال کی قوتوں اور تحریکوں سے مستقبل کے لیے کام لینے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوتی ۔ اس کی روزمرہ کی زندگی اور مشاغل کا سلسلہ ایک سطح پر جاری رہتا ہے اور ایک دوسری سطح پر وہ بہت سی ایسی باتوں کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتا ہے جو اس کے ذاتی تجربات کی دنیا سے بالکل بعید اور غیر متعلق ہیں ۔ مثلاً یہ کہ اب سے کئی ہزار سال قبل اشوک اعظم ہندوستان کا ایک شہنشاہ تھا جس نے ایک خون‌ریز جنگ کے بعد امن پسندی اختیار کر لی تھی ۔ یا علاءالدین نے دکن کے بہت بڑے حصے کو فتح کیا ۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں زندگی کی ان دونوں سطحوں کے درمیان کوئی نتیجہ‌خیز رابطہ قائم نہیں ہو سکتا یعنی تاریخ کے مطالعے سے طلبہ کے ذاتی تجربات کی معنویت اور اہمیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے کیونکہ اول تو مباحث کا انتخاب بہت مہمل اور قابل اعتراض ہوتا ہے جس میں سطحی نمائشی اور غیر ضروری چیزوں کو اہم تمدنی مسائل اور معاشری معاملات پر ترجیح دی جاتی ہے ۔ دوسرے طریقۂ تعلیم ایسا اختیار کیا جاتا ہے کہ طلبہ جو کچھ سیکھتے

بھی ھیں اس پر پوری ذھنی قدرت حاصل نہیں کر سکتے ۔ اس سے نہ ان کی دماغی تربیت ہوتی ھے نہ وہ اس واقفیت سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں کچھ فائدہ اٹھا سکتے ھیں ۔

تاریخ کے مطالعے کی دوسری صورت یہ ھے کہ اسے ھم تمدنی معاشری اور سیاسی مسائل کے سمجھنے اور حل کرنے کا ذریعہ بنائیں اور اس کی مدد سے انسان کی ادراک معانی کی قابلیت میں وسعت اور گہرائی پیدا کریں - اگر اس کے مطالعے کی بدولت ھم اپنے ذاتی اور وقتی کار و بار کی حقیقی اور مستقل اھمیت اور ان کے ارتقا کے سلسلے کو سمجھ سکیں تو تاریخ ذھنی تربیت کا موثرترین وسیلہ بن جاتی ھے ۔ تاریخ کی تعلیم کا اصل مقصد یہ ھے کہ طالب علم کو معلوم ھو جائے کہ اس کے روزمرہ کے کاموں کا تعلق وسیع تر انسانی مشاغل سے کیا ھے اور جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ھوتا جائے اس میں یہ استعداد بڑھتی جائے کہ تمدنی امور اور مسائل پر ارتقائی نظر ڈال سکے اور ماضی، حال اور مستقبل کی باھمی وابستگی اور ان کی تشکیل میں انسان کی کارفرمائی کو محسوس کرے - اگر تاریخ کے منشا کی یہ تشریح صحیح ھے تو اس سے تاریخ کے نصاب اور طریقۂ تعلیم دونوں میں ترمیم لازم آتی ھے - اس کی عملی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں لیکن بعض باتیں بالکل بدیہی اور واضح ھیں - مدرسوں کے نصاب میں بجائے تاریخ کے سیاسی اور حربی پہلو پر زور دینے کے اس کے انسانی اور تمدنی رخ کو نمایاں کرنے کی ضرورت ھے - ان لڑائیوں کے واقعات اور تفصیلات ھمارے لیے کوئی اھمیت نہیں رکھتے جو اب سے سینکڑوں سال پہلے

برتی گئی تھیں - ہمیں اس وقت صرف ان نتائج سے بحث اور سروکار ہے جنھوں نے انسانوں کی زندگی اور جماعتوں کے باہمی تعلقات پر اس طرح اثر ڈالا کہ ہماری اپنی زندگی بھی اس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ متاثر ہوئی - ہمیں کم از کم مدرسے کی تعلیم میں ان سیاسی پیچیدگیوں اور ملکی نقشوں سے بھی زیادہ تعلق نہیں جو مختلف زمانوں میں ہوتی رہی ہیں ؛ سوائے ایسی حالت کے جب ان کی وجہ سے ملکی معاشرت اور تمدن میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہوں - تاریخ کے انسانی رخ کو نمایاں کرنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ نصاب میں بعض خاص چیزوں کو زیادہ اہمیت دی جائے مثلاً بڑے بڑے مشاہیر کی سوانح زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے نہ بحیثیت افراد کے کیونکہ اس لحاظ سے ان کا تعلق تاریخ سے زیادہ نفسیات کے علم سے ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ تمدنی تحریکوں کے نمائندے ہیں اور ان کی زندگی اور کارناموں سے ان تحریکوں پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - یعنی ہمیں ان کی انفرادی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کے معاشرتی اور تمدنی حالات کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے جو ان کے خیال اور عمل کے محرک ہوئے اور جنھوں نے ایک طرف ان کی ذات پر اپنا اثر ڈالا اور دوسری طرف خود ان کی ذات سے متاثر ہوئے - دوسرے چھوٹے بچوں کے نصاب تاریخ میں ہمیں ابتدائی زمانے کی تاریخ کا مطالعہ بھی شامل کرنا چاہیے کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے سب سے زیادہ اہم اور مستقل مشاغل اور اداروں کا آغاز بہت وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے اور بچے سمجھ سکتے ہیں

کہ موجودہ تمدن نے پیچیدہ نظام کی ابتدا کس طرح ہوئی اور اس کی بنیادیں کن چیزوں پر قائم ہیں - یہ وہ زمانہ ہے جب پہلا انسان فطرت کی زبردست' بےرحم اور بےپناہ قوتوں کے ساتھ بر سر پیکار ہے - یہ صورت حال اُس کی فعالیت' اس کی قوت عمل' اس کی قوت اختراع کو ابھارتی ہے اور وہ طرح طرح کے آلات اور ہتھیار ایجاد کرکے ان قوتوں کو رفتہ رفتہ اپنے قابو میں لاکر اپنا دوست اور خادم بناتا ہے - اس کی ایک مثال ہم کسی گزشتہ باب میں رابنسن کروسو کے قصے سے دے چکے ہیں - اس حالت میں انسان کو روزی حاصل کرنے کے لیے شکار اور زراعت کی' گرمی' سردی اور جانوروں وغیرہ کے خطروں سے بچنے کے لیے مکان' اور بدن کی حفاظت کے لیے کپڑا جوتا وغیرہ بنانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس طرح ان تمام پیشوں اور مشاغل کی ابتدا ہوتی ہے' جن کو ہم آج زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ شکل میں موجودہ تمدن کا جزو پاتے ہیں - ان تمام کاموں کے ذریعے انسان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے سراسر اپنے ماحول کا محتاج ہے اور اس کی وساطت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا - غرض اس قدیم اور ابتدائی انسانی تمدن کا مطالعہ بچوں کے لیے بہت مفید اور دلچسپ ہے - بشرطیکہ اس میں عملی طریقوں سے کام لیا جائے جن کی مختصر سی تشریح ہم ذیل میں کریں گے - تیسری چیز جس کو نصاب میں نمایاں حیثیت دینی چاہیے صنعت و حرفت اور اقتصادی تاریخ ہے - اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ اقتصادی تاریخ بطور ایک علم کے مدرسے کے طلبہ کے سامنے پیش کی جائے کیونکہ ان

میں ابھی اتنی دماغی پختگی نہیں آئی کہ وہ تاریخ کے مجرد تصورات کو ذہن نشین کر سکیں بلکہ انہیں یہ بتانا چاہیے کہ ان کے آبا و اجداد نے کس طرح اس مقام سے ابتدا کرکے، جس کا حال وہ ابتدائی زمانے کی تاریخ میں پڑھ چکے ہیں، رفتہ رفتہ صنعت و حرفت اور معاشرت کے موجودہ نظام کو اپنی متعدد کوششوں کے ذریعے تعمیر کیا ہے اور کس طرح اس زمانے میں وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر رہتے ہیں تقسیم عمل اور اشتراک عمل کے ذریعے اپنی روزی کماتے ہیں اور دنیا کا کام چلاتے ہیں، اور انسان کی مجموعی ترقی میں صنعت و حرفت کا کیا حصہ ہے - چوتھی چیز جس کی جانب پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے ہمیں توجہ دلائی ہے اور جس کو ان کے خیال میں معلموں نے عام طور پر نظرانداز کیا ہے وہ علمی اور عقلی ترقی کی تاریخ ہے - تاریخ کے مطالعے سے طلبہ میں اس بات کا صحیح احساس پیدا ہونا چاہیے کہ انسان کی ترقی میں اس کی دماغی جد و جہد اور کاوش کو کس حد تک دخل ہے اور سائنس اور دوسرے علوم نے تجارتی ارتقا میں کیا نمایاں خدمت انجام دی ہے - وہ لکھتے ہیں :—

''ہم میں یہ احساس ابھی حال ہی میں پیدا ہوا ہے کہ وہ بڑے بڑے سورما جنھوں نے انسانوں کی قسمت کو بنایا ہے، ماہرین سیاست فوجی جرنیل اور ملکی لیڈر نہیں ہیں بلکہ وہ علمی محققین اور موجد ہیں جن کی بدولت انسان کے قبضۂ قدرت میں ایسے ذرائع آگئے ہیں جو اس کے تجربے کی توسیع اور تنظیم کرتے ہیں اور وہ صناع اور

شاعر ہیں جنھوں نے اس کی جد و جہد، اس کی کامرانیوں اور ناکامیوں کے افسانے کو مصوری کے ذریعے یا مجسموں کی شکل میں یا الفاظ کے پیکر میں ایسے دلکش انداز سے بیان کیا ہے کہ اس کا مطلب اور مفہوم تمام لوگوں کی سمجھ میں آ جاتا ہے .... انسانی دماغ نے زندگی کے ارتقا میں جو حصہ لیا ہے اس کا صحیح احساس پیدا کرنے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے مطالعے سے طلبہ پر یہ بات واضح ہو جائے کہ بدویت کے زمانے سے موجودہ دور تمدن تک جس قدر ترقی انسان نے کی ہے اس کا انحصار علمی دریافتوں اور ایجادوں پر ہے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ بہت سے ایسے واقعات جن کو عام طور پر تاریخی تصانیف میں اہمیت دی گئی ہے محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ انہوں نے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں جن کو عقل کے ذریعے زیر کرنا پڑا ہے" ۱ -

لیکن صحیح نصاب کا تعین بجائے خود کافی نہیں جب تک استادوں کا طریقۂ تعلیم اور طلبہ کا طریقۂ تحصیل دونوں درست نہ ہوں - کیونکہ ہمارے تعلیمی نظریے کی رو سے نصاب اور طریقۂ تعلیم دو بالکل جداگانہ چیزیں نہیں ہیں یعنی ہم یہ نہیں سمجھتے کہ نصاب بجائے خود ایک مکمل اور مرتب چیز ہے جس پر بعض خارجی طریقوں سے طلبہ کو عبور حاصل کرنا ہے - نصاب کی ترتیب و تنظیم

۱- Dewey : Democracy and Education صفحہ ۲۵۴ -

دراصل اس طریقے پر منحصر ہے جس کے ذریعے طالبہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں یعنی ایک معنی میں وہ اپنا نصاب خود بناتے ہیں - مثال کے طور پر تاریخ کو لیجیے - ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخی واقعات طلبہ کے سامنے بطور زندہ مسائل اور معاملات کے پیش کیے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو وہ اس کی تحریکوں کو اسی نظر سے دیکھیں جس سے وہ لوگ دیکھتے تھے جن کو ان سے براہ راست سابقہ پڑا تھا - جس حد تک ہم تاریخ کے بظاہر مردہ جسم میں روح پھونک سکیں گے یعنی ماضی کے واقعات کا ربط اور تسلسل حال کے مسائل کے ساتھ قائم کر سکیں گے' اسی حد تک تاریخ کی تعلیم میں شگفتگی اور دلچسپی پیدا ہوگی - جہاں کہیں صاحب نظر اور باتخیل معلموں نے تاریخ کی تعلیم میں جان ڈالی ہے انہوں نے ہمیشہ اس کو ماضی کے بھولے بسرے افسانوں کے بجائے حال کی تفسیر بنا دیا ہے اور طلبہ کو یہ محسوس کرایا ہے کہ افراد اور جماعتوں کی زندگی کے تمام واقعات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور علت و معلول کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنے شکاگو کے تجربی مدرسے کے کچھ حالات "Elementary School Record" کے نام سے شائع کیے تھے - ان میں سے چند ضروری اقتباسات اور مضامین کو پروفیسر فنڈلے (Findley) نے مرتب کر کے اپنے دیباچے کے ساتھ "School and the Child" کے نام سے شائع کیا ہے - اس کے ایک باب میں مصنف نے تاریخ کے طریقۂ تعلیم سے بحث کی ہے اور اس کے اصولوں کو مختصر طور پر بیان کر کے بتایا ہے کہ انہوں نے کس طرح اپنے اسکول میں ان پر عمل کیا - اس

مدرسے کے طلبہ تاریخ کے مطالعے ابتدا میں سیاسی تاریخ کی درسی کتابوں سے نہیں کرتے بلکہ سب سے پہلے اپنے گرد و پیش کی معاشری اور اقتصادی زندگی کے مشاغل کا اور انسان کی ابتدائی زندگی یعنی عہد حجری اور عہد فلزی کا اور وحشیوں کے طریقۂ بود و باش وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں - اپنے قریبی ماحول کو سمجھنے کے لیے وہ ذاتی مشاہدوں تعلیمی سیر و سفر اور علمی تجربوں سے کام لیتے ہیں - بازاروں، دکانوں، کارخانوں، صنعتی کارگاہوں وغیرہ کو غور سے دیکھتے ہیں اور جہاں تک ان سے ممکن ہوتا ہے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ کس طرح ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اپنی ضروریات فراہم کرتے ہیں - قدیم زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک طرف تو وہ خود اسی قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زمانے کے مشاغل مثلاً گھر بنانے، آگ جلانے، کپڑا بننے، کاشتکاری وغیرہ کی نقلیں کر کے اس جگ بیتی کو آپ بیتی بنا دیتے ہیں اور دوسری طرف تصویروں، عجائب خانوں کے نمونوں اور کتابوں وغیرہ کے ذریعے اپنی معلومات اور تخیل میں وسعت اور وضاحت پیدا کرتے ہیں - اس طرح وہ اپنی موجودہ زندگی کے سادہ اور عام فہم مظاہر کو سمجھنے میں اور ابتدائی زندگی کے حالات معلوم کرنے میں عملی اور فعالی طور پر شریک ہوتے ہیں اور تاریخ کے اس اہم‌ترین مسئلے کو ذاتی تجربے اور مشاہدے سے حل کرتے ہیں کہ انسان کی صنعت و حرفت اور معاشری زندگی کی تنظیم کس طرح ہوئی اور اس نے اپنی تمام ضروریات کیونکر پوری کیں - ان باتوں کو

سیکھنے کی ذمہ‌داری زیادہ‌تر خود طلبہ پر ھے - معلم کا کام اس میں صرف اتنا ھے کہ وہ ان کے ذوق تحقیق و تجسس کو ابھارتا رھے اور مدرسے میں کتابوں، نقشوں، تصاویر وغیرہ کی مدد سے اور اپنی شخصیت کی اثر آفرینی اور نصاب کی معقول تنظیم کے ذریعے ان کے لیے ایک ایسا ماحول مہیا کردے کہ ان میں تاریخی ارتقا کا احساس بیدار ھو اور وہ تاریخ کے اس مرکزی مسئلے میں دلچسپی لیں کہ انسانی سوسائٹی کس طرح اپنی ابتدائی حالت سے موجودہ حالت کو پہنچی -

ابتدائی تاریخ کی تعلیم کا یہ نظریہ صرف ایک ھی تعلیمی مفکر تک محدود نہیں بلکہ دوسرے ماھرین تعلیم نے بھی اپنی مقامی اور ذاتی ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی کر کے اس طریقے کو استعمال کیا ھے - مثلاً ڈاکٹر فیریر نے "مدرسۂ عمل" کے متعلق اپنی ضخیم تصنیف کی تیسری جلد، ۱ (مدرسۂ عمل کی عملی تنظیم) میں تاریخ کی ابتدائی تعلیم کے لیے جو طریقہ تجویز کیا ھے اس میں بھی بچوں کے ذاتی مشاھدے اور عملی کام پر زور دیا ھے - ان کی تجویز یہ ھے کہ بچوں کو سب سے پہلے اس موضوع کا مطالعہ کرنا چاھیے جو ان کی دلچسپی کا قدرتی مرکز ھے "انسان کی ضروریات زندگی اور ان کا پورا ھونا" - بچے فطرتاً یہ بات معلوم کرنا چاھتے ھیں کہ مختلف

۱—La Pratique de l'ecole active یہ کتاب فرانسیسی زبان میں ھے - اس کا ابھی تک ترجمہ نہیں ھوا -

زمانوں میں انسانوں نے اپنی اہم‌ترین ضروریات یعنی لباس،
خوراک، حفاظت ذات وغیرہ کے لیے کیا انتظام کیا ہے -
اس مبحث کے متعلق طلبہ مختلف ذرائع سے معلومات
بہم پہنچاتے ہیں اور ان کو ایک خاص طریقے سے کارڈوں پر
درج کرتے ہیں جن کا نام مصنف موصوف نے ''اسباق حیات''
رکھا ہے - استادوں کی نگرانی میں وہ ان تمام معلومات کو
عنوانات بالا کے ماتحت مرتب کرتے ہیں اور اس طرح اپنی
ذاتی کوشش اور دوسروں کی مدد سے حاصل کی ہوئی
واقفیت میں نظم و ترتیب قائم کرنا سیکھتے ہیں اور یہی
واقفیت آگے چل کر تاریخ اور انسانیات کے دوسرے شعبوں
کی سنگ بنیاد بن جاتی ہے - پروفیسر فاریا دی واسکونسلو
(Faria de Vasconcellos) نے بھی اپنے بلجیم کے مدرسے
کے حالات میں لکھا ہے ۱ کہ تمام مضامین کی تعلیم میں
عملی مشاغل اور طلبہ کی ذاتی کوشش کو نمایاں اہمیت
دینی چاہیے - اس مدرسے میں طلبہ جب تاریخ کا مطالعہ
کرتے ہیں تو وہ خود اس کی تحصیل میں جسمانی جد و
جہد اور ذہنی کاوش سے کام لیتے ہیں اور حتی‌الامکان کسی
بات کو استاد سے سن کر یا کتاب میں پڑھ کر بغیر غور اور
تحقیق کیے قبول نہیں کرتے - اونچی جماعتوں میں خاص
کر کے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ طلبہ کے لیے ایسے مواقع
فراہم کیے جائیں کہ وہ خود اپنی قوت فکر و عمل اور

۱ــــان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ "A New Schooli.n Belgium"
کے نام سے شائع ہوا -

اجتہاد سے کام لے سکیں اور استاد ان کو ہر کام کے لیے ایک بنے بنائے راستے پر نہ ڈال دے جس پر وہ بغیر سوچے سمجھے بغیر اپنے دماغ پر زور ڈالے چلتے رہیں - اسی خیال سے متاثر ہوکر اور طلبہ کو تاریخ کے مطالعے میں فعالی حیثیت سے شریک کرنے کے لیے پروفیسر کیٹنگ (Keatinge) نے، جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے پروفیسر ہیں، اپنا Source Method مرتب کیا ھے ا جس کی بنیاد یہ اصول ھے کہ مدرسے میں طلبہ کو ایک حد تک مورخ بننے کا موقع دیا جائے یعنی ان کے لیے کم و بیش ایسے حالات مہیا کیے جائیں جن میں مورخ تاریخ کو ترتیب دیتا ھے - عام طور پر مدرسوں میں یہ ھوتا ھے کہ طلبہ معمولی درجے کے کم علم معلموں کی درسی کتابوں کو پڑھ کر نہ صرف تاریخی معلومات حاصل کرتے ھیں بلکہ ان کی راے اور خیالات اور نزاعی مسائل میں ان کے فیصلوں کو بھی تسلیم کر لیتے ھیں - ظاھر ھے کہ اس طریقے پر تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ان میں نہ کوئی بصیرت پیدا ھوسکتی ھے نہ آزادی راے، نہ ذھنی تربیت - چنانچہ کیٹنگ (Keatinge) کی تجویز جس پر انھوں نے عمل کرکے دیکھا ھے، یہ ھے کہ انھیں چشم دید حالات کے لکھنے والوں اور مستند مصنفوں کے بیانات مطالعے کے لیے دیے جائیں اور بالعموم ایک ھی واقعے کے متعلق مختلف ھمعصر مورخوں کی راے

ا ــــ اس طریقے پر انھوں نے تفصیلی بحث اپنی کتاب "Teaching of History" میں کی ھے -

بتائی جائے - اس تمام تاریخی مواد پر جو طلبہ کے سامنے
رکھ دیا جاتا ہے چند سوالات قائم کیے جاتے ہیں جن کا
جواب دینا ان کا کام ہوتا ہے - اگر یہ سوالات سوچ سمجھ کر
بنائے جائیں تو ان کا صحیح جواب دینے کے لیے انہیں اپنی
سمجھ اور قوت فیصلہ سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے -
مختلف مورخوں کی ذاتی خصوصیات اور کمزوریوں اور ان
کے تعلقات اور حالات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے - ان کے
تعصب یا جانب‌داری کی وجوہ کو سمجھنا' خلاف قیاس
باتوں کو مسترد کرنا' جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو
گزشتہ زمانے کے لوگوں کا ہم‌خیال بنا کر ان کے نقطۂ نظر سے
معاملات کو جانچنا' یہ تمام مطالبات طالب علم کو ذہنی
جد و جہد اور غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں - متضاد اور
مختلف بیانوں میں سے حقیقت امر معلوم کرنے کے لیے
اسے ایک حد تک وہی کد و کاوش اور رد و قدح کرنی پڑتی
ہے جس سے ایک انصاف پسند مورخ کام لیتا ہے - جب وہ
مختلف قسم کا مواد بہم پہنچا کر کسی زمانے کی تاریخ
لکھنے بیٹھتا ہے - لیکن یہ مشابہت بہت محدود ہوتی ہے
کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک نوعمر' خام‌کار طالب علم ایک مستند
مورخ کی طرح کام نہیں کرسکتا - وہ گزشتہ زمانوں کی
زندگی اور لوگوں کے خیالات اور جذبات اور ان کے محرکات
عمل کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ
اس کے لیے نفسیات کا نظری علم اور عملی تجربہ درکار ہے
جو اسے حاصل نہیں - وہ معلومات حاصل کرنے کے ان غیر
مرتب ذرائع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو مورخ کے

لیے کارآمد ہوتے ہیں - مثلاً پرانی عمارتیں، سکے، کتبے وغیرہ لیکن باوجود ان تمام نقائص اور کوتاہیوں کے اس طریقۂ تحصیل کی بدولت طالب علم کو تاریخ کی تدوین کے مشکل عمل کا جو تجربہ حاصل ہوتا ہے وہ ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے - ایک طرف تو اسے شہادتوں اور روایتوں کے جانچنے اور پرکھنے کی عادت پڑتی ہے اور اس کی طبیعت میں احتیاط کا مادہ اور معاملات کو تولنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف (بشرطیکہ معلم صحیح طور پر رہنمائی کرے) اپنی روزمرہ کی زندگی میں مبالغے، تعصب، بےجا طرفداری اور غلطبیانی کو ترک کرکے صداقت کا احترام کرنا سیکھتا ہے جو اخلاقی سیرت کا ایک نہایت قابل قدر عنصر ہے - اس میں شک نہیں کہ مدرسے میں تاریخ کی تعلیم تمامتر اسی اصول پر نہیں ہو سکتی کیونکہ علاوہ وقت اور وسائل کے محدود ہونے کے تاریخ کے بہت سے مباحث ایسے بھی ہیں جن میں یہ طریقہ استعمال نہیں ہو سکتا - لیکن مدرسۂ جدید کو اپنے اصل اصول کی بنا پر اس طریقے سے اور اس قسم کے تمام فعالی طریقوں سے جو تعلیم میں جان ڈالتے ہیں حسب امکان ضرور استفادہ کرنا چاہیے - اس طرح کسی حد تک تاریخ کے مطالعے میں بھی ایک علمی اور عملی "مشغلے" کی شان پیدا ہوجائے گی اور طلبہ خود اپنی ذاتی جد و جہد اور ذہنی کاوش کے ذریعے علم حاصل کریں گے -

اس اصول کی توضیح کے لیے ہم ایک اور درسی مضمون کو لیتے ہیں جس کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک

مفید ہنر سیکھنا ہے، جس کے ذریعے بچوں کو اظہار خودی کا موقع ملتا ہے اور خوشی نصیب ہوتی ہے یعنی ڈرائنگ۔ مدرسے میں جتنے مختلف ہنر سکھائے جاتے ہیں خواہ ان کا تعلق فنون لطیفہ سے ہو یا دستکاری سے، سب پر کسی قدر ترمیم کے ساتھ وہی اصول عائد ہوتے ہیں جو ہم ڈرائنگ کے ضمن میں بیان کریں گے۔ ڈرائنگ کی تعلیم کا مروجہ طریقہ مدارس میں یہ رہا ہے کہ پہلے بچوں کو خطوط اور خطوط کو جوڑ کر آسان شکلیں کھینچنے کی مشق کرائی جاتی ہے، پھر رفتہ رفتہ وہ زیادہ مشکل شکلیں بناتے ہیں۔ ہر قدم پر استاد کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص مشق کا اس قدر اعادہ کرائے کہ بچہ اس میں ماہر ہو جائے اور اس کو بغیر کسی دقت کے نہایت صفائی کے ساتھ بنا سکے۔ بظاہر یہ طریقہ بہت معقول معلوم ہوتا ہے اور اس مروجہ اصول کے مطابق ہے کہ تعلیم میں تدریجی ترقی اور منطقی ترتیب کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ لیکن نفسیات اطفال کے اعتبار سے اس پر غور کیا جائے تو یہ سراسر غلط ہے کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ڈرائنگ سے وہ ذوق پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ بچوں کی تعلیم میں ڈرائنگ (اور اس قسم کے دوسرے مضامین) کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ان جذبات و خیالات کو اظہار کا موقع ملتا ہے اور یہ اظہار ایک مرئی اور خوش‌نما شکل میں ہوتا ہے۔ بچے میں فطرت کی طرف سے تعمیر اور اظہار خودی کا جذبہ ودیعت ہوتا ہے اور مدرسے کا فرض یہ ہے کہ وہ اس جذبے کی نشو و نما اور تربیت کرے۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے

کہ بچے کو شروع ہی سے آزادی کے ساتھ اپنے رجحانات کے اظہار کا موقع دیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر بچے کو موقع ملے تو وہ کاغذ پر رنگوں یا پنسل کی مدد سے اپنے تاثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ شروع میں یہ اظہار بہت غیر منتظم اور بےڈھنگا ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس آزاد شغل میں اس کو اپنی انگلیوں کی حرکت اور ڈرائنگ کے آلات پر زیادہ قابو حاصل ہوجاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر ڈرائنگ کو بجائے ایک آزاد اور مسرت بخش مشغلے کے، جس میں بچے کو اپنی اندرونی کیفیتوں کو خارجی شکل میں ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے، محض بےروح تقلید اور مشق تک محدود رکھا جائے تو وہ ڈرائنگ کو ہرگز اظہار خودی کا موثر وسیلہ نہ بنا سکیں گے خواہ انہیں بعض اشیا کی صحیح شکلیں بنانے میں پوری مہارت کیوں نہ حاصل ہوجائے۔ وہ ان شکلوں کو جن کی انہیں مشق ہے بنا سکیں گے لیکن ان میں جدت اور انفرادی ذوق کی کوئی جھلک نہیں ہوگی۔ وہ چیزوں کو دیکھ کر ان کی اچھی نقل اُتار لیں گے لیکن ان کو اس فن سے اتنی دلچسپی اور شوق نہ ہوگا کہ وہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی اس کو اپنی فرصت کا مرغوب مشغلہ بنائیں۔ لہذا مدرسۂ جدید ڈرائنگ کی تعلیم میں بھی انفرادی کوشش اور آزادانہ اظہار کی قدر کرتا ہے اور سب بچوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے سے احتراز کرتا ہے۔ بچوں کی تعلیم میں سب سے پہلے ضرورت ہے، ان کی ہمت افزائی کی، ان کے شوق اور تجسس کے ابھارنے کی انہیں آزادانہ اظہار خودی کا موقع دینے کی، ان کے رجحان طبع کو ان کا رہنما بنانے کی، تاکہ ان میں جو تخلیقی جذبات

اور قوتیں هیں وہ زور شور سے کام کرنے لگیں - بقول ڈاکٹر بیلارڈ (Ballard) کے چھوٹے بچوں کی تعلیم میں ''کانٹ چھانٹ سے زیادہ سینچنے'' کی ضرورت هے ا - بچوں کے طریقۂ اظہار میں ضبط و نظم پیدا کرنے اور صحت عمل پر اصرار کرنے کا مناسب وقت وہ هے جب ان کے شوق کے پر لگ چکے هوں اور وہ بغیر کسی خارجی دباؤ کے اپنی خوشی سے رنگوں اور شکلوں کے ساتھ کھیلنا شروع کردیں اور خود هی یہ محسوس کریں کہ اس کھیل کو زیادہ بامعنی اور نتیجہ‌خیز بنانے کے لیے معلم کی هدایت اور اپنی قوتوں کی تربیت کرنے کی ضرورت ہے - اگر ابتدا هی سے هم صحت عمل کی خاطر یا وقت کی کفایت کا خیال کرکے یا نمائشی نتائج کو جلد از جلد حاصل کرنے کے لیے رسمی مشق اور اعادے پر زور دیں گے تو بچوں کا وہ جذبۂ تخلیق افسردہ هو کر رہ جائے گا جو هر قسم کے آرٹ کے لیے قوت محرکہ کا کام دیتا ہے اور انسانی شخصیت کا ایک نہایت قیمتی عنصر هے -

ذهنی تربیت کا جو نظریہ هم نے اس باب میں پیش کیا هے اس کا خلاصہ یہ هے کہ ذهنی تربیت چند مخصوص علمی مشقوں کے ذریعے نہیں هو سکتی - بچے کے دماغ میں ایسی متفرق اور بےربط قوتیں نہیں هوتیں جن کی تربیت خاص خاص مضامین کے ذریعے کی جائے - اس کی جبلتوں کی نشو و نما دینے اور ان کو مرتب کرکے ذهانت کو بیدار اور آمادۂ عمل کرنے کا صرف یہی طریقہ هے کہ ان کو مختلف

Teaching the Mother Tongue—I

علمی اور عملی مشاغل میں لگایا جائے جن کی تکمیل کے دوران میں انہیں پیچیدہ مسائل اور مشکلات سے سابقہ پڑے اور کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنی قوتوں اور وسائل و ذرائع کو منظم کرنے کی ضرورت پیش آئے -

ذہنی تربیت کے لیے ذاتی کاوش اور جد و جہد ناگزیر ہے - اگر نصاب محض منطق کے لحاظ سے مرتب کیے ہوئے سبقوں کا مجموعہ ہوگا اور طریقۂ تعلیم میں تجربہ، فعالیت اور عمل کو اہمیت نہیں دی جائے گی تو طلبہ کی دماغی تربیت ہرگز نہ ہو سکے گی - یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض غیر معمولی حافظے کی مدد سے بہت سی معلومات فراہم کرلیں اور ان میں ایک قسم کی ''علمیت'' کی شان نظر آنے لگے لیکن وہ ذہنی بیداری جو ان کو معاملات کے سمجھنے ' ماحول سے فائدہ اٹھانے اور اس پر قابو پانے میں مدد دیتی ہے جو علم کو عمل میں تبدیل کرتی ہے اور حاصل کردہ واقفیت کا استعمال سکھاتی ہے اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک ہم مدرسے کے تمام تعلیمی کار و بار کو ان اصولوں پر از سر نو مرتب نہ کریں گے جن کی تشریح ہم نے اس باب میں کی ہے - علم کا خزانہ جب تک عمل کے سرچشمے سے ابل کر دریائے مواج نہ بن جائے کشت حیات کو سیراب نہیں کر سکتا - دماغ کو رطب و یابس معلومات کا ذخیرہ بنا لینے کا نام تعلیم نہیں - بقول غالب :

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا ' تو پھر لہو کیا ہے ؟

باب چہارم

"تدوین نصاب"

ہم نے سابقہ ابواب میں ضمناً مسئلۂ نصاب کا ذکر کیا ہے اور گزشتہ باب میں یہ بتایا ہے کہ اگر ہم درسی مضامین اور مدرسے کے دوسرے مشاغل سے طلبہ کی ذہنی تربیت کا کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں ان کے سامنے کس حیثیت سے پیش کرنا چاہیے - اب ہم زیادہ تفصیل اور تسلسل کے ساتھ اس امر سے بحث کریں گے کہ نصاب کے مضامین کا انتخاب اور ان کی ترتیب و تدوین کس طرح کرنی چاہیے کہ ان سے فوائد حاصل ہو سکیں جن کی توقع ہے - یہ مسئلہ عملی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے کیونکہ اگر مدرسے کے مشاغل کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نصاب کی تعلیم ہی اس کا سب سے بڑا کام ہے - تعلیم کے دوسرے وسائل مثلاً اُستادوں کی شخصیت اور مدرسے کی عام فضا کا اثر اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن سب سے زیادہ جو چیز طلبہ کے ذہن اور اخلاق کو متاثر کرتی ہے وہ ان کا روزمرہ کا کام ہے جس کو وہ دن میں پانچ چھے گھنٹے انجام دیتے ہیں - تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کی تحصیل میں

بھی استاد زیادہ‌تر نصاب کی ترتیب و تنظیم سے مدد لیتا ھے اور مدرسے کی عام فضا بھی اسی وقت تک تربیت کا وسیلہ بنتی ھے جب طلبہ شوق اور محنت سے اپنے مقررہ نصاب کو پورا کریں اور اسی کے سلسلے میں دوسرے علمی، تفریحی اور تخلیقی مشاغل کی بنا ڈالیں - علاوہ بریں طلبہ کو اپنے کام میں اس وقت تک انہماک اور دلچسپی پیدا نہیں ھوگی جب تک نصاب کو نفسیات اطفال کے ساتھ ھم‌آھنگ نہ کیا جائے اور انھیں اس کے ذریعے نظام تمدن کی معرفت نہ حاصل ھو - اس لیے بعض لحاظ سے نصاب کا مسئلہ تعلیم کا مرکزی مسئلہ ہے - اور گزشتہ پچاس سال میں ماھرین تعلیم نے اس پر بہت توجہ صرف کی ھے - اور اس کے متعلق بہت کچھ تحقیقات کی ھے - لیکن ھمارے ملک میں اب تک نصاب کی باقاعدہ تنقید اور اصلاح نہیں کی گئی اور اس میں طلبہ کی نفسی ضروریات اور تمدنی مطالبات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی نہیں ھوئی - بلکہ ھندوستان میں انگریزی تعلیم کے اجرا کے وقت جو نصاب تجویز ھوا تھا اس میں بعض نئے مضامین کے جوڑ اور پیوند لگا دیے گئے ھیں - لیکن نصاب میں نہ کوئی بنیادی تبدیلیاں ھوئی ھیں نہ اس کی تنظیم نو کی کوشش کی گئی - لہذا ھم اس باب میں ان اصولوں سے بحث کریں گے، جن کے مطابق ھمیں نصاب کی ترتیب و انتخاب کرنا لازم ھے -

تعلیم کے تمام مباحث، بالخصوص مسئلۂ نصاب پر مدتوں تک ''نفسیات انشعابی'' ۱ کا تسلط رھا ھے اور جیسا ھم نے

Faculty Psychology—1

گزشتہ باب میں بیان کیا ہے نفسیات کے عالم اور مدرسوں کے معلم دونوں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے تھے کہ انسان کا دماغ مختلف ذہنی قوتوں کا مجموعہ ہے جو گویا اس کے دماغ کے مختلف گوشوں میں جاگزیں ہیں اور اپنی ترتیب و تنظیم میں ایک دوسرے سے بےتعلق اور آزاد ہیں - اس نظریے کے مطابق مختلف درسی مضامین نصاب میں اس لیے داخل کیے جاتے تھے کہ وہ خاص خاص ذہنی قوتوں کی تربیت اور تکمیل کریں - گویا وہ قوتیں فطرت کی طرف سے بنی بنائی موجود ہیں صرف ان کو تیز کرنے' مشق اور استعمال کے ذریعے ان میں زیادہ مضبوطی پیدا کرنے کی ضرورت ہے - برخلاف اس کے ہم نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق انسان کا نفس ایک بسیط وحدت ہے جس کی تمام قوتیں انسانی جبلتوں کی بنیاد پر تجربے یعنی فرد اور ماحول کے باہمی عمل کے ذریعے سے نشو و نما پاتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ ہر تجربے کا اثر دماغ کی تمام قوتوں پر پڑتا ہے اور وہ ان سب کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے - لہذا نصاب کے مشاغل اور مضامین علحدہ علحدہ دماغی قوتوں مثلاً ادراک یا حافظے یا تخیل کو تیز نہیں کرتے بلکہ بحیثیت مجموعی ذہنی تربیت کے مسلسل عمل میں حصہ لیتے ہیں بشرطیکہ ان کی ترتیب و تنظیم مناسب اصولوں پر کی جائے اور طریقۂ تعلیم ارتقائے ذہنی کے قوانین کے ساتھ ہم‌آہنگ ہو - ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تمام مضامین کی تحصیل اور مشاغل کی انجام دہی میں طلبہ کو فعالی حیثیت سے شریک ہونا چاہیے کیونکہ

صرف اسی صورت میں ان کی ذہانت بیدار ہو کر مصروف عمل ہو سکتی ہے - محض انفعالی طریقے پر بہت سی معلومات حاصل کرلینا اور اس کو کسی نہ کسی طرح حافظے میں محفوظ رکھنا تعلیم نہیں کہلا سکتا - یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کو تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ادب وغیرہ کے متعلق بہت سی واقفیت ہو لیکن اس کا دماغ ذہنی تربیت سے عاری ہو یعنی اس نے یہ ساری معلومات ایسے بے‌ربط طریقے سے بغیر ذاتی جد و جہد کے حاصل کر لی ہو کہ اس سے اس کے ادراک اور احساس پر کوئی اثر نہ پڑا ہو اور وہ ان سے زندگی میں کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے -

علاوہ ذہنی تربیت کے نصاب کا دوسرا مقصد، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ وہ طلبہ کو ان کے گرد و پیش کی زندگی اور اس کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد دے - اصل میں نصاب کا موضوع ہمارا طبیعی اور معاشرتی ماحول ہے - ہم نصاب کے مختلف عناصر اسی سے اخذ کرتے ہیں اور ان اجزا کا گہرا مطالعہ نوعمر بچوں کو کل کائنات کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے - اگر مدرسے کا نصاب کسی وجہ سے تمدنی زندگی سے بے‌تعلق ہو جائے یا ان دونوں کا باہمی رشتہ بہت کمزور ہو جائے تو مدرسے کی تعلیم بے‌مغز و بے‌روح ہو جاتی ہے - اور بجائے زندہ مسائل سے بحث کرنے کے الفاظ و علامات کے چکر میں پڑ جاتی ہے -

ہم تعلیم اور تمدن کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے اس خرابی کی طرف اشارہ کرچکے ہیں - اس کے پیدا ہونے کا سب سے زیادہ امکان نصاب کی ترتیب و تنظیم میں ہے جہاں معلموں

اور مدرسوں کے لیے ہمیشہ یہ خطرہ ہے کہ اپنے اپنے خاص مضامین میں ایسے محو ہو جائیں کہ انہیں اس تعلق کا' جو یہ مضامین بچوں کی فطرت اور معاشرے کی زندگی سے رکھتے ہیں' احساس ہی نہ رہے - لہذا نصاب کی بحث میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس کے مضامین کے انتخاب اور اُن کی ترتیب دو چیزوں کی پابند ہے' نفسیات اطفال کی خصوصیات اور تمدنی زندگی کی ضروریات - اس کے بعد ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ مدرسوں کا مروجہ نصاب کس حد تک ان معیاروں پر پورا اترتا ہے جو ہم نے اُن کے لیے مقرر کئے ہیں -

ہم بتا چکے ہیں کہ مدرسۂ جدید کا تعلق جماعتی زندگی سے بہت قریب کا ہے - وہ کوئی قائم بالذات ادارہ نہیں ہے جس کو گرد و پیش کی اقتصادی' سیاسی' معاشرتی اور اخلاقی زندگی سے کوئی واسطہ نہ ہو - موجودہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ مدرسے کو اپنی اندرونی زندگی کی تشکیل معاشرے کی زندگی کے نمونے پر کرنی چاہیے اور ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہییں جن سے فائدہ اُٹھاکر طلبہ عمرانی مشاغل اور مقاصد کو سمجھ سکیں اور ایک حد تک ان میں شریک ہو سکیں - اگر مدرسہ بیرونی زندگی سے رابطہ قائم نہیں رکھے گا تو وہ عمرانی ترقی کے لیے بےکار ثابت ہوگا اور جو کچھ علم و ہنر اور استعداد طلبہ وہاں حاصل کریں گے وہ اس کی چاردیواری تک محدود رہے گی اور جب وہ اس چاردیواری سے باہر قدم رکھیں گے تو اس سے کچھ فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے - اس ضمن میں "مدرسے" کے اس جدید مفہوم کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جس کو ہم نے

باب اول میں بیان کیا ہے - کیونکہ اس کے بغیر تدوین نصاب کی موجودہ تحریکوں کو سمجھنا مشکل ہوگا -

ہم نے بتایا تھا کہ مدرسہ' بقول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے ایک ''مخصوص ماحول'' ہے جہاں تمام تعلیمی اثرات اور نصاب اور مشاغل کی بالارادہ تنظیم کی جاتی ہے تاکہ طلبہ کی نشو و نما آزادی کے ساتھ ہو اور ان کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کے لیے بہترین حالات اور عناصر مہیا ہوسکیں - طلبہ کو ''آزادی'' دینے کے یہ معنی نہیں کہ معلم نگرانی اور ہدایت سے بالکل دست بردار ہو جائیں اور انہیں ان کی جبلتوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیں' اس اُمید پر کہ وہ خود بخود تمام اعلیٰ صفات اور قوتیں حاصل کرلیں گے - ہمارا مشاہدہ اور علم نفسیات دونوں روسو (Rousseau) کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ اگر ہم مدرسوں کو بچوں کی خواہشات اور ضروریات کا تابع بنا دیں تو ان کی عقل و دانش اور سیرت خود بخود صحیح طریقے پر نشو و نما پاکر پختہ ہو جائے گی - روسو کا یہ عقیدہ دراصل اپنے زمانے کے معلموں کی تنگ خیالی اور سخت گیری کے خلاف ایک رد عمل تھا - ایک طرف یہ شدت تھی کہ لوگ گناہ آدم کے عقیدے کی بدولت بچوں کو بھی فطرتاً گناہ میں آلودہ سمجھتے تھے اور ان کی نجات کے لیے ہر قسم کی تعزیر و تادیب کو ضروری جانتے تھے - دوسری طرف یہ غلو کہ ہر بچے کے اندر گویا ایک ولی اور حکیم پنہاں ہے جو پردے کو ہٹاتے ہی خود بخود ظاہر ہو جائے گا! بہر حال تعلیم جدید ان دونوں نظریوں میں سے ایک کو بھی تسلیم نہیں کرتی - کیونکہ اس کے نزدیک فطرت انسانی

کی بنیاد ان جبلتوں پر ھے جو اپنی ابتدائی حالت میں محض امکانات عمل کی حامل ھیں 'خود کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتیں - البتہ آگے چل کر مختلف اثرات کی بدولت اچھی یا بری صورت میں ظاہر ھوتی ھیں - اس لیے بچوں کی صحیح تربیت اور ان کی جبلتوں کی مناسب نشو و نما کے لیے تعلیمی ہدایت اور نگرانی ضروری سمجھی جاتی ھے - لیکن یہ ذمہ‌داری جس سے ہم اخلاقی تربیت کے ذیل میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کریں‌گے کہ بچوں کی جبلتیں مناسب تادیب و تشویق کے ذریعے صحیح راہ پر لگائی جائیں صرف معلموں ھی پر عائد نہیں ھوتی بلکہ مدرسے کے تمام ماحول پر جس میں نصاب طلبہ کی اجتماعی زندگی ان کا کھیل کود' ان کے فرصت کے مشاغل' استاد کی شخصیت وغیرہ سب شامل ھیں - اس لیے تعلیم کا سب سے بڑا عملی مسئلہ یہ ھے کہ اس "مخصوص ماحول" کی تنظیم کس طرح کی جائے کہ بچوں کی جبلتیں ان کے انفرادی نشو و نما میں بھی مدد دیں اور عمرانی مقاصد کے حصول میں بھی کام آئیں - اس ماحول کی تین خصوصیات جو پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے بیان کی ھیں نصاب کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالتی ھیں - اس لیے اس کا مختصر سا اعادہ تہذیب و تمدن کے مشکل اور پیچیدہ عناصر زیادہ آسان اور سادہ شکل میں طلبہ کے سامنے پیش کیے جاتے ھیں - کیونکہ وہ ان کو اس تحلیل کے بغیر اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے - اس نقطۂ نظر سے تدوین نصاب کا مسئلہ یہ صورت اختیار

کرتا ہے کہ تمدنی زندگی کو نصاب کا موضوع مان کر اس میں سے اہم‌ترین مضامین مشاغل اور دلچسپ اور سبق آموز تجربات کا انتخاب کیا جائے اور انہیں نفسیات اطفال کی مناسبت سے ترتیب دی جائے تاکہ ان کے ذریعے سے طلبہ رفتہ رفتہ ان عناصر سے واقف ہوجائیں جن پر تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے - اگر ایسا نہ کیا جائے تو کار و بار سیاست، آرٹ، سائنس، مذہب سب بیک وقت طالب علم کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں گے اور اس کا نتیجہ ایک عام انتشار کی صورت میں رونما ہوگا - لہذا اس معاشرتی ادارے کا جسے ہم مدرسہ کہتے ہیں پہلا فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کے لیے ایک سادہ ماحول مہیا کرے اور زندگی کے ان عناصر کو منتخب کرے جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں - اور جن کو نوعمر طالب علم سمجھ سکتے ہیں - اس کے بعد وہ ان میں ایک خاص ترتیب قائم کرتا ہے - ابتدا میں آسان چیزیں سکھاتا ہے اور ان کی مدد سے آگے چل کر زیادہ مشکل اور پیچیدہ امور کی تشریح کرتا ہے ۱ -

دوسری خصوصیت اس ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تہذیب و تمدن کے وہی عناصر منتخب کئے جاتے ہیں جو بچوں کی تربیت پر عمدہ اثر ڈال سکتے ہیں - تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ سوسائٹی نسلاً بعد نسل تمام رسوم و قوانین منتقل کرتی چلی جائے بلکہ اصلاح اور ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جو صریحاً

۱—Democracy and Education صفحہ ۲۵ -

مفید ہیں اور مستقل اہمیت رکھتی ہیں - اور انھیں پر مدرسے میں پوری توجہ صرف کی جائے - اس طرح مدرسہ طلبہ کو ایک اعلیٰ‌تر معیار تمدن سے روشناس کو دیتا ہے تاکہ وہ بڑے ہوکر معاشرے کے مضر اداروں اور طریقوں کی تنقید اور اصلاح کر سکیں - اس خصوصیت کی تشریح ایک مثال سے ہو جائے گی - موجودہ زمانے کا تمام اقتصادی اور معاشرتی نظام مقابلے اور مسابقت باہمی کی بنیاد پر قائم ہے - لوگوں میں باہمی وابستگی کے احساس سے کہیں زیادہ یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے ذاتی فائدے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ اس کے لیے کیسے ہی قابل اعتراض ذرائع اختیار کرنے پڑیں اور اس کے نتائج دوسروں کے حق میں کتنے ہی خوفناک ہوں - بالخصوص بین‌الاقوامی سیاست اور تجارت میں اس اصول کی کارفرمائی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے خطروں کا عام لوگ پوری طرح اندازہ نہیں کرسکتے - اگرچہ ہندوستان میں تجارت اور صنعت و حرفت میں اس حد تک ترقی نہیں ہوئی کہ مغرب کے ممالک کا سا مہلک مقابلہ' رواج پائے لیکن معاشری زندگی میں ایک فرد دوسرے فرد سے' ایک جماعت دوسری جماعت سے برسر پیکار رہتی ہے اور کسی کو یہ احساس نہیں کہ ہمارے اغراض میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ محض سطحی اور عارضی ہے' ورنہ ہم سب کا حقیقی مفاد مشترک ہے - کیا مدرسے کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ وہ اپنی تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو انھیں خطرناک اصولوں پر چلائے ؟ افسوس ہے کہ ملک کے حالات سے متاثر ہو کر مدرسے میں بھی طلبہ کے باہمی

مقابلے کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور استاد بجائے اس کے کہ ان کو تعاون کا شوق دلائیں ان میں رقابت اور مسابقت کے جذبات کو اُبھارتے ہیں - اس کے ثبوت میں مروجہ تعلیم کے بہت سے طریقے اور رجحانات پیش کئے جاسکتے ہیں مثلاً امتحانوں کو تعلیم کا منتہائے نظر بناکر نمبروں کی پرستش کرنا' مقابلے میں ''اول'' آنے والے طالبہ کی حد سے زیادہ قدر و منزلت' ایسے مضامین پر زور دینا جن میں علحدہ علحدہ کام کرنا پڑتا ہے' ان مشاغل کی طرف سے بےپروائی جن میں مل جل کر کام کیا جا سکتا ہے - اگر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ تمدنی خرابیوں کی اصلاح کرے اور لوگوں کے اصول عمل اور معیار نظر کو بہتر بنائے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ طالبہ نہ صرف ان بہتر اصولوں اور معیاروں سے نظری طور پر روشناس کیے جائیں بلکہ انہیں ان پر عمل کرنے کا بھی موقع ملے - مندرجۂ بالا مثال میں اس اصول کے معنی یہ ہوں گے کہ مدرسہ اپنی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں تعاون عمل پر زور دے - نصاب میں ایسے مضامین اور طریقۂ تعلیم کو داخل کرے کہ بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا موقع ملے اور وہ تقسیم کار کے ذریعے مشکل امور کو انجام دینا سیکھیں - ان میں باہمی اتحاد اور وابستگی کا احساس مستحکم ہو اور وہ اس حقیقت کو پہچانیں کہ وہ ایک جماعت کے رکن ہیں اور اس حیثیت سے ان پر بعض اخلاقی اور معاشری فرائض عائد ہوتے ہیں - اگر وہ ان فرائض کو پورا نہ کریں گے تو عمرانی زندگی کا شیرازہ بکھر جائےگا اور اس سے وہ فوائد حاصل نہ ہو سکیں گے جن کی

توقع ہے - اس خیال کا اثر نہ صرف طریقۂ تعلیم اور مضامین کے انتخاب پر پڑے گا بلکہ ہر مضمون کی داخلی تنظیم میں اور مباحث کی ترتیب میں اس کی وجہ سے تبدیلی لازم آئے گی - کیونکہ ہمیں سائنس، ادب، تاریخ، جغرافیہ، علوم کے ان پہلوؤں پر زور دینا ہوگا جو انسانی زندگی کے معاشرتی رخ کی تشریح کرتے ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں بنی نوع انسان کی متحدہ جد و جہد کا نقشہ دکھاتے ہیں - اگر نصاب کی مناسب ترتیب و انتخاب اور مدرسے کے عام مشاغل کے ذریعے بچوں میں یہ عقیدہ عملی طور پر راسخ ہو گیا کہ انسانی زندگی کا نظام امداد باہمی کے اصول پر قائم ہونا چاہیے تو ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد افراد اور جماعتوں کی خودغرضانہ کشمکش ایک حد تک دور ہو جائے گی -

تیسری خصوصیت مدرسے کے ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تمدنی زندگی کے منتخب شدہ عناصر ایک خاص توازن اور ہم‌آہنگی کے ساتھ مرتب کئے جاتے ہیں تاکہ تمدنی زندگی کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کی کشاکش میں نوعمر بچے اور نوجوان راہ سے بھٹک نہ جائیں اور اپنے آپ کو کسی خاص طبقے یا خیال کے ساتھ وابستہ کر کے قومی تمدن کے مجموعی نظام سے بےخبر نہ ہو جائیں - لہذا مدرسے میں فرقہ‌پرستی کی تنگ فضا کی جگہ قومی روایات کا فراخ‌تر ماحول مہیا کرنا چاہیے اور اسے اتنی وسعت دینا چاہیے کہ اس کی حدود عالم‌گیر انسانی تمدن سے مل جائیں - اس طرح قوم کے افراد میں ایک ہم‌آہنگ اور یکساں ذہنیت پیدا ہوتی ہے - وہ ایک ہی قسم کے نصاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی

بدولت ان کے خیالات میں یک جہتی اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے - اس غرض کا دوسرا نفسی رخ یہ ہے کہ طلبہ کی سیرت اور طبیعت پر جو اثرات تمدنی زندگی کے مختلف شعبوں میں شریک ہونے کی وجہ سے پڑتے ہیں ان میں ہم‌آہنگی اور تنظیم پیدا کی جائے تاکہ ان کے نفس میں وحدت اور اجتماع قائم رہے - اس کی تشریح ہم پہلے کر چکے ہیں - یہاں اس کا ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس سے تدوین نصاب کی ایک اہم اصول پر روشنی پڑتی ہے - ہم نصاب کو محدود اور یک‌طرفہ نہیں بنا سکتے - اگر اس کی وساطت سے ہم طالب‌علم کا تعارف تہذیب و تمدن کے مکمل نظام سے کرنا چاہتے ہیں تو نصاب میں ان تمام اقدار اور مقاصد کی نمائندگی ہونی چاہیے جو اس نظام میں مستقل اہمیت رکھتے ہیں - اگر اس میں سائنس پر حد سے زیادہ زور دیا جائے اور ادب کو نظرانداز کیا جائے یا نظری علوم کو جگہ دی جائے اور عملی مشاغل اور دست‌کاریوں کا خیال نہ رکھا جائے تو طلبہ کی تربیت ناقص اور یک‌طرفہ رہے گی اور وہ زندگی کے بعض اہم مسائل اور معاملات کا صحیح احساس نہ کر سکیں گے - اس خصوصیت سے دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نصاب کے مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے بےتعلق نہ ہونا چاہیے ورنہ ان کے اثرات طالب‌علم کی طبیعت پر جدا جدا پڑکر منتشر ہو جائیں گے اور اس کی مجموعی نشو و نما پر کوئی نمایاں اثر نہ ڈال سکیں گے - ان کی تربیت اس خوش اسلوبی سے کرنا چاہیے کہ گو ان میں سے ہر ایک طالب علم کو تمدنی زندگی کے کسی خاص

شعبے سے روشناس کرے لیکن وہ سب مل کر اسے ایک مجموعی فلسفۂ زندگی کی تشکیل میں مدد دیں - اگر تعلیم انسان کو حقیقت کے مختلف پہلو دکھانے تک محدود رہے اور اس کی مکمل تصویر پیش نہ کر سکے تو گویا اس نے اپنے اعلی‌ترین مقصد کو فراموش کر دیا -

تدوین نصاب کی تحریک نے گزشتہ تیس سال میں مغربی ممالک میں بہت اہمیت حاصل کرلی ہے - اس کے متعلق مختلف ماہرین تعلیم نے اپنے اپنے نظریے پیش کیے - حال میں مدرسے کے معلموں اور ماہرین تعلیم دونوں نے نصاب کے مسئلے میں بہت تحقیق و تفتیش کی ہے جس کی وجہ سے مدارس جدید کے نصاب میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا ہے اور ہوتا جاتا ہے - امریکا میں ہیرلڈرگ (Harold Rugg) تھارن ڈائک (Thorndike) بوبٹ (Bobbit) اور سنیڈن (Sneddon) وغیرہ کی سرکردگی میں اس کے متعلق بہت سا کام ہوا ہے - بعض مدارس نے بھی اپنے تجربات شائع کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ درسی مضامین کی تقسیم و ترتیب اور ان کے موضوع میں کس قدر انقلاب ہو گیا ہے - حال ہی میں امریکا کی ایک مقتدر تعلیمی انجمن ۱ نے تدوین نصاب کی تاریخ اور اس کی موجودہ تحریکوں اور بنیادی اصولوں کے متعلق دو ضخیم جلدیں بطور اپنے چھبیسویں سالنامے کے شائع کی ہیں - اس کتاب میں اس تمام علمی تحقیقات کا خلاصہ اور تنقید

National Society for the Study of Education—1

موجود ہے جو گزشتہ چالیس سال میں نصاب کے متعلق کی گئی ہے اور اس پر بحث کر کے بعض اہم نتائج اخذ کیے گئے ہیں - ان تمام نتائج کا لب لباب یہ ہے کہ معقول اور مکمل نصاب تعلیم بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی بنیاد طلبہ کی زندگی اور تمدنی ضروریات پر رکھی جائے تاکہ وہ ان کی جبلی رجحانات کی تربیت کر سکے اور ان کو موجودہ تمدن کے سب سے اہم اور بہتر عناصر سے روشناس کرے - پروفیسر تھارن ڈائک (Thorndike) نے تدوین نصاب کے نو اصول بیان کیے ہیں٭ جن میں سے زیادہ ضروری اصولوں کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں ! - ان سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے یہاں پیش کیا ہے -

۱—نصاب میں ایسے مضامین اور مشاغل کو ترجیح دینی چاہیے کہ جن کے ذریعے طلبہ میں وہ معلومات اور عادات، وہ مہارت، رجحان اور مذاق پیدا ہو جو انہیں ان کے طبعی ماحول اور ان کی خاندانی، شہری اور معاشرتی زندگی کے مطالبات پورا کرنے میں مدد دے اور ان کے جسم و دماغ میں صحت اور توازن قائم رکھے اور ان کے تفریحی، اخلاقی، مذہبی اور علمی وسائل کو ترقی دے - یہ وہ مرکزی معیار ہے جس پر اور تمام معیاروں کا انحصار ہے -

۲—عام طور پر وہ معلومات اور عادات وغیرہ زیادہ قابل قدر ہوتی ہیں جو براہ راست زندگی کی کسی واقعی ضرورت

٭"Thorndike and Gates : Elementary Principles—!
of Education" صفحہ ۱۸۴ -

کو پورا کرتی ہیں - ان کے ضمن میں طلبہ جو کچھ سیکھتے ہیں اس کو وہ زیادہ اچھی طرح استعمال کر سکتے ہیں -

۳—اگر اور سب باتیں یکساں ہوں تو مقابلتا وہ علوم و فنون زیادہ قابل قدر اور تعلیمی لحاظ سے زیادہ مفید ہیں جن کے استعمال کے موقعے انسان کی زندگی میں کثرت سے پیش آئیں ۔

۴—نصاب میں ایسے مضامین اور مشاغل کو ترجیح دینی چاہیے - جو مفید اور فعالانہ عادتوں کو نشو و نما دیں - مثلاً غور و فکر کی قوت' جدت ایچ' میل جول کی صلاحیت' اعتبار وغیرہ -

۵—وہ مضامین اور مشاغل نصاب کے لیے مقابلتاً زیادہ موزوں ہیں جو نہ صرف موجودہ ضروریات کو پورا کرتے ہیں بلکہ آئندہ پیش آنے والے مسائل اور غیر متوقع حالات کے لیے بھی تیار کرتے ہیں - برخلاف اس کے جو مضامین محض ماضی کے حالات پر مشتمل ہوتے ہیں یا عارضی اور فوری مفاد اور دلچسپیوں سے تعلق رکھتے ہیں یا محض ان علمی شوقوں کو قائم رکھتے ہیں جو مدرسے کے روایتی تعلیم کا نتیجہ ہیں' ان کی اہمیت بہت کم ہے -

ان اصولوں اور نصاب کے متعلق دوسری تحریکوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصاب کی ترتیب و انتخاب میں ہمیں طالب‌علم اور اس کے ماحول کے تعلق پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ تمدنی زندگی کے مواقع سے' جو اس تعلق کی بدولت پیدا ہوتے ہیں' پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لیے اسے کس قسم کی معلومات اور

تجربے کی ضرورت ہے - نصاب کے مسئلے کو معاشرتی زندگی سے جدا کرنا اور اس میں محض دماغی قوتوں کی تربیت کا لحاظ رکھنا کسی طرح جائز نہیں - صدیوں تک نصاب کی تنظیم جس غلط نفسی عقیدے کی بنا پر ہوتی رہی ہے اس کی تردید ہم اوپر کر چکے ہیں - نصاب کے لیے مضامین کا انتخاب اس اصول پر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دماغ کی مختلف، مستقل اور غیر مربوط قوتوں کی تربیت کرتے ہیں - مثلاً یہ کہ ریاضی کے ذریعے قوت استدلال کی تربیت، سائنس کے ذریعے قوت مشاہدہ کی، ادب قدیم کے ذریعے قوت تنقید، تخیل اور ذوق حسن کی - موجودہ علم نفسیات سرے سے اسی کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کے ذہن میں اس طرح کی مستقل اور قائم بالذات قوتیں موجود ہیں جن کی نشو و نما خاص خاص مضامین کے ذریعے کی جاتی ہے - اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ طلبہ کی فطری اور ابتدائی صلاحیتوں کی نشو و نما کر کے ان کو دماغی قوتوں میں تبدیل کرنے کے لیے انہیں ایسے مشاغل میں شریک کرنا چاہیے جن کو انجام دینے میں استدلال، مشاہدہ، تخیل وغیرہ سبھی چیزوں کی ضرورت پڑے اور وہ اپنی خواہش اور حاجات کے تقاضے سے مجبور ہو کر ان سے کام لیں - لہذا مدرسۂ جدید میں درسی مضامین اور مشاغل دونوں کو اس اصول پر منتخب کرنا چاہیے کہ ان کے واسطے سے طلبہ کو انسانی زندگی اور کار و بار کے مختلف شعبوں کو غور سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے - وہ اپنی قوت مشاہدہ سے کام لیں، چیزیں بنائیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تدبیریں سوچیں اور ان کو آزما کر دیکھیں

کہ وہ کامیاب ہوتی ہیں یا نہیں - اس میں شک نہیں کہ اس کا تعلق بہت کچھ طریقۂ تعلیم سے ہے لیکن جب تک نصاب ایسا نہ ہو جس میں ان تجربوں اور کاموں کا موقع مل سکے طریقۂ تعلیم بجائے خود کافی ہے - موجودہ زمانے میں دستکاری کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی مختلف شکلوں میں ان تمام تجربات کو حاصل کرنے کا امکان ہے اور اس کے ذریعے بچوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی تربیت ہو سکتی ہے، بشرطیکہ اسے صحیح اصولوں پر مدرسے میں رائج کیا جائے اور اس کا مقصد تنگ اور محدود نہ ہو بلکہ وہ طلبہ کی پوری شخصیت کو دعوت عمل دیتی ہو -

کچھ عرصے سے نصاب میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ زیادہ‌تر زمانۂ حال کی تمدنی ترقی اور انقلابات کا نتیجہ ہیں - مدرسوں کا شمار بالعموم قدامت پسند اداروں میں ہوتا ہے یعنی وہ حتی‌الامکان ان طریقوں میں جو پہلے سے چلے آتے ہیں کسی قسم کا تغیر پسند نہیں کرتے - اس لیے وہ بالعموم معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے بلکہ پیچھے رہ جاتے ہیں - لیکن جب ضروریات زمانہ انہیں بالکل مجبور کر دیتی ہیں تو وہ بےدلی سے رفتہ رفتہ، اپنے نصاب اور نظم و نسق میں تبدیلیاں کرتے ہیں - اس کی تشریح چند مثالوں سے ہو سکتی ہے - گزشتہ دو سو برس کے اندر مغربی ممالک کی صنعت و حرفت میں ایک زبردست انقلاب ہوا ہے جس نے انسانی معیشت کے قدیم نظام کو درہم برہم کرکے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی ہے - جیسا ہم ایک گزشتہ باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کرچکے ہیں - اس نظام کا دار و مدار زیادہ تر

سائنس کی تحقیقات اور ایجادات پر ھے - یہاں تک که اس زمانے میں زندگی کے ھر شعبے میں سائنس کو دخل ھو گیا ھے - کوئی شخص جو سائنس کی کم از کم ابتدائی اور ضروری باتوں سے واقف نہیں اپنے موجودہ ماحول کو نه پوری طرح سمجھ سکتا ھے نه کامیابی کے ساتھ اس میں حصه لے سکتا ھے - لہذا مدرسوں کے لئے یه لازم ھو گیا که وہ اپنے نصاب میں سائنس کو نمایاں اهمیت دیں تاکه طلبه شہریت کے نئے فرائض کو اچھی طرح ادا کرسکیں - لیکن اس وقت تقریباً تمام ملکوں میں' بالخصوص انگلستان میں' روم اور یونان کا علم و ادب مدرسوں کی تعلیم پر حاوی تھا - علوم قدیمه کے حامیوں کا دعویٰ تھا که ذهنی تہذیب و تربیت کا کوئی ذریعه ان کے سوا ھو ھی نہیں سکتا - برخلاف اس کے وہ لوگ جو جدید اقتصادی اور صنعتی تحریکوں سے متاثر ھو چکے تھے سائنس کی اهمیت پر زور دیتے تھے - ان کا دعویٰ تھا که نه صرف افادی نقطۂ نظر سے اس کو نصاب میں داخل کرنا ناگزیر ھے بلکه اس کے بغیر اهم‌ترین دماغی قوتوں کی نشو و نما ناممکن ھے - چنانچه اُنیسویں صدی کا بیشتر حصه اِنگلستان کی تعلیمی تاریخ میں' جدید سائنس اور قدیم (یونانی اور رومی) علم و ادب کے درمیان جنگ کا زمانه تھا جس میں سائنس کا سب سے بڑا اور سب سے ممتاز مددگار ھربرٹ اسپنسر تھا - جب رفته رفته مدرسوں کے نصاب میں سائنس کو وہ حصه مل گیا جس کی مستحق تھی اور اس کے طریقۂ تعلیم میں اصلاح ھوگئی تو معلموں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ھوا که سائنس کی اهمیت محض اس وجه سے نہیں که تمام

صنعت و حرفت اور اکثر پیشوں کا دار و مدار اس پر ہے بلکہ وہ دماغی تربیت اور تہذیب نفس کا بھی ایک نہایت موثر اور قابل قدر وسیلہ ہے - لہذا اب نصاب میں سائنس محض اس بنا پر داخل نہیں کی جاتی کہ اس سے مثلاً قوت مشاہدہ کی تربیت ہوتی ہے بلکہ اس کا خاص وصف یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے ہم زندگی کے نظم اور ربط کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور اس میں عمدگی اور قابلیت کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں - اسی طرح نصاب تعلیم پر ان سیاسی تغیرات اور انقلابات کا اثر بھی پڑا جن کی بدولت قومی ریاستیں اور جمہوری حکومتیں وجود میں آئیں' سیاسی اختیارات ایک محدود طبقے کے ہاتھ سے نکل کر رفتہ رفتہ قوم کے تمام افراد کو حاصل ہوئے اور معاشرتی فرقہ‌بندیوں کے ٹوٹنے سے لوگوں میں باہمی یکجہتی کا احساس پیدا ہوا - اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم جو پہلے چند خاص طبقوں تک محدود تھی باقی طبقوں میں پھیلنی شروع ہوئی اور حکومت نے یہ تسلیم کرلیا کہ کم از کم ابتدائی تعلیم حاصل کرنا ہر آزاد شہری کا حق ہے - جب تک تعلیم خوش حال اشراف کے لیے مخصوص رہی جن کے فرائض میں حصول معاش' محنت اور مزدوری' کاشتکاری' صنعت و حرفت کے مشاغل شامل نہ تھے اور جو زیادہ‌تر علمی اور ادبی تفریح اور ایک قسم کی سطحی تہذیب کی خاطر تعلیم حاصل کرتے تھے نصاب تعلیم کا قدیم علوم و ادب تک محدود ہونا سمجھ میں آسکتا تھا - اول تو اس وقت تک واقعی یونانی اور رومی زبانیں ہی علم و تہذیب کے بہترین عناصر کی حامل

تھیں اور دوسری زبانوں میں علوم کا اتنا سرمایہ نہ تھا - جدید علوم یعنی سائنس، اقتصادیات، معاشیات وغیرہ ابتدائی حالت میں تھے اور ان کی تعلیمی قدر و قیمت قدیم علوم کے مقابلے میں بہت کم تھی - دوسرے یہ محدود نصاب جس میں گہرائی زیادہ اور وسعت کم تھی، اس جماعت کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتا تھا جس کے لیے وہ مرتب کیا گیا تھا - لیکن اب جب کہ تعلیم نے امیر اور غریب بےکار اور مشغول، علمی اور عملی ہر قسم کے لوگوں کو اپنے وسیع دامن میں لے لیا ہے ہم کسی طرح اس محدود نصاب کو کافی نہیں سمجھ سکتے - لوگوں کی ضروریات مختلف اور متنوع ہیں، ان کے طبائع میں فرق ہے، موجودہ زمانے کی ضروریات بدل گئی ہیں - قدیم علوم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن جدید علوم زندگی کے مسائل حاضرہ سے بہت زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں - آج کل حصول معاش کا مسئلہ اور مختلف تمدنی اور معاشری روایات رکھنے والے فرقوں کو ایک قومی شیرازے میں منسلک کرنے کا سوال یہ دونوں چیزیں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں - ان حالات میں نوخیز نسلوں کی تعلیم کے لیے نہ علوم قدیم کافی ہیں نہ ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کا سطحی اور رسمی مطالعہ - ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ہمہ گیر نصاب کی وساطت سے طلبہ زمانۂ حال کی تمدنی زندگی کو سمجھیں اور ان میں تمدنی احساس پیدا ہو - وہ فرد اور جماعت کے صحیح تعلق کو نہ صرف نظری طور پر سمجھیں بلکہ عملاً بحیثیت ایک جماعت کے رکن کے وہ اپنے حقوق و

فرائض سے واقف ہوں اور ان کو ادا کرنا سیکھیں - اسی وجہ سے تاریخ اور جغرافیے کے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں وہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور خود معلم کا نقطۂ نظر ان کے متعلق بدل گیا ہے - اس کی کوشش ہے کہ طلبہ کو معلوم ہو کہ نوع انسان نے کس طرح متحدہ طور پر جد و جہد کر کے دنیا کے تمام ذرائع اور وسائل سے کام لیا ہے اور کس طرح ہر نئی نسل پرانی نسلوں کے کارناموں اور علمی اور عملی ذخیروں سے فائدہ اٹھاتی ہے - اس طرح طلبہ دنیا کے تمام لوگوں کی باہمی وابستگی کو محسوس کر سکتے ہیں اور ماضی، حال اور مستقبل کے ربط و تسلسل کا اندازہ کر سکتے ہیں - تاریخ کے ذریعے یہ احساس بالواسطہ پیدا ہوتا ہے - اس کو مستحکم کرنے کے لیے بعض ثانوی مدارس میں درسی اور عملی طور پر مدنیات کی تعلیم دی جاتی ہے - یعنی ایک طرف تو مدنی اور سیاسی زندگی کے نظام اور اس کے حقوق و فرائض کی تشریح کی جاتی ہے اور دوسری طرف طلبہ کو عام تقریبوں، جلسوں، تہواروں اور مدنی کار و بار مثلاً حفظان صحت، صفائی، تعلیمی پروپگنڈا وغیرہ میں شرکت کا موقع دیا جاتا ہے - مدرسے کی داخلی تنظیم حکومت خود اختیاری کے نمونے پر کی جاتی ہے اور طلبہ میں فرائض اور ذمہ داریاں تقسیم کر دی جاتی ہیں - اس طرح طلبہ کو اپنے روزمرہ کے کام میں انہیں اصولوں پر عمل کرنا سکھایا جاتا ہے جو معاشرتی زندگی میں کار فرما ہیں - ان مخصوص انتظامات کے علاوہ مدارس جدید میں تمام درسی مضامین کی تعلیم میں یہ خیال پیش نظر رکھا

جاتا ہے کہ طلبہ معاشرے کے نظام اور انسانوں کے باہمی تعلقات کو سمجھیں' انھیں مل جل کر رہنے اور کام کرنے کا موقع ملے اور وہ اس جمہوری اور تمدنی زندگی میں بطور مفید اور مستعد اراکین کے شریک ہو سکیں جس کی تشکیل جدید سیاسی اور صنعتی اثرات کے ماتحت ہو رہی ہے -

اب ہم بحیثیت مجموعی نصاب کی تنظیم کے مسئلے پر نظر ڈال سکتے ہیں - نصاب کے مضامین کا انتخاب تمدنی زندگی کی ضروریات اور مطالبات کو مد نظر رکھ کر کرنا چاہیے ان کی ترتیب اور تعلیم میں بچوں کی نفسیاتی نشو و نما اور قوانین کو اپنا راہبر بنانا اور ان سے اس طرح کام لینا چاہیے کہ طلبہ نہ صرف مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر کے بیٹھ رہیں بلکہ ان میں نئے مسائل اور معاملات کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ مستعدی کے ساتھ زندگی کے کار و بار میں حصہ لیں - مدرسوں کا قدیم نصاب جن حالات میں مرتب ہوا تھا وہ اب تبدیل ہوچکے ہیں - یورپ میں یونانی اور لاطینی علم و ادب کا دور دورہ تھا - ہندوستان میں سنسکرت' فارسی اور عربی زبانیں تہذیب اور تعلیم کا سرچشمہ تھیں - تہذیب کا مفہوم بجائے خود محدود اور یکطرفہ تھا - اسی میں ان تمام مشاغل کو کوئی جگہ نہ دی جاتی تھی جن کا تعلق انسان کی مادی ضروریات کے پورا کرنے سے ہے - لیکن اب نئے علوم' نئی زبانیں' نئے سیاسی اور معاشرتی حالات پیدا ہوگئے ہیں - تہذیب کا مفہوم وسیع ہو گیا ہے اور اس کو اور زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ہر فرقے اور ہر طبقے

کے لوگوں کے لیے موزوں ہو - لہذا ضرورت یہ محسوس ہوئی ہے کہ نصاب میں نئے مضامین کو داخل کیا جائے، اس کے نیم‌مردہ قالب میں نئی روح پھونکی جائے تاکہ وہ جدید تمدن کے راستوں میں طلبہ کی رہبری کر سکے - اس تحریک نے جس کو توسیع نصاب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے دو شکلیں اختیار کیں - اول تو بعض قدیم مضامین کو ترک کرکے یا ان کے نصاب کو کم کرکے جدید علوم و فنون کو مدرسوں میں جگہ دی گئی - اس کی مثالیں ہم نے اوپر دی ہیں - مغرب میں یونانی اور لاطینی زبانوں اور ہندوستان میں عربی، فارسی، سانسکرت کا بوجھ ہلکا کیا گیا اور نصاب میں دیسی زبانوں سائنس، تاریخ، جغرافیہ، دستکاری، امور خانہ‌داری وغیرہ شامل کر لیے گئے - ان مضامین کی وجہ سے نصاب نہ صرف زیادہ 'مفید' بن گیا بلکہ اس میں وسعت اور جامعیت پیدا ہوگئی اور اس کے دائرے میں تمدنی زندگی کے جدید شعبے بھی آگئے جن کو قدیم نصاب نظرانداز کرتا تھا - لیکن نصاب میں محض چند مضامین کے اضافے سے کوئی پائدار تعلیمی اصلاح نہیں ہوسکتی تھی - اصلاح نصاب کی تحریک کا دوسرا رخ قدیم اور جدید دونوں طرح کے مضامین کی داخلی ترتیب اور تنظیم سے تعلق رکھتا ہے - یعنی ماہرین تعلیم کی توجہ اس طرف راجع ہوئی کہ ان تمام مضامین کا از سرنو جائزہ لیا جائے اور اس میں جس قدر غیر ضروری اور غیر مفید مباحث شامل ہوگئے ہیں ان کو خارج کرکے ایسے مباحث داخل کیے جائیں جو مستقل اور دائمی

اہمیت رکھتے ہیں یا جن کا موجودہ تمدن سے لازمی تعلق ہے -
نصاب تعلیم کے معاملے میں ہمیشہ یہی مشکل پیش آتی
ہے کہ جب وہ بہت عرصے تک رائج رہتا ہے اور اس پر
وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تو اس
میں بہت سی فضول چیزیں شامل ہو جاتی ہیں - چنانچہ
یہی صورت مغربی تعلیم کے نصاب کو پیش آئی - اس میں
تاریخ، جغرافیہ، ریاضی وغیرہ داخل تو ہوگئے لیکن تاریخ
خشک اور بےربط واقعات اور ناموں اور سنوں کے مجموعے کا
نام تھا جن کو یاد کرنے سے نہ ذہنی تربیت ہوسکتی تھی
نہ ماضی کی تعبیر، نہ حال کی تفسیر، نہ مستقبل کے
لیے تیاری - جغرافیہ بھی علیٰ ہذا القیاس دریاؤں اور پہاڑوں
اور شہروں اور آبادیوں وغیرہ کے متعلق بےشمار غیر ضروری
معلومات سے بھرا پڑا تھا - اس کے مطالعے سے نہ انسان اور
اس کے طبیعی ماحول کا تعلق سمجھ میں آتا تھا نہ علت
اور معلول کے اس سلسلے پر روشنی پڑتی تھی جس میں
کائنات کے تمام مظاہر جکڑے ہوئے ہیں - ریاضی کے تمام
مضامین یعنی ہندسہ، جبر و مقابلہ، حساب وغیرہ بالعموم
اس غرض سے پڑھائے جاتے تھے کہ ان سے قوت استدلال کو
ترقی ہو اور مجرد نظریات اور مسائل کو سمجھنے کی قابلیت
پیدا ہو - اس لیے اس کے مباحث زندگی کے واقعی امور
اور معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ اکثر طلبہ کے
سامنے ایسے سوالات پیش کیے جاتے تھے جن کے مفروضات
کسی طرح عقل میں نہیں آتے تھے - اسی طرح سائنس بھی
ابتدا میں ایک نظری علم بنا دی گئی تھی جس میں

طلبہ کو اصطلاحوں کی تعریفیں، اشیا کے خواص اور قوانین فطرت کے ضابطے یاد کرائے جاتے تھے - ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے اور زندگی کا تعلق جو تعلیم کی جان ہے قطع ہوگیا - لہذا مصلحین تعلیم نے کوشش کی کہ تمام درسی علوم کے متعلق یہ دریافت کریں کہ تمدنی زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے کیا چیزیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور کون چیزیں ایسی ہیں جو محض رسماً اور روایتاً چلی آتی ہیں - اس لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے - بعض لوگوں نے تمدنی ضروریات کا تجزیہ کیا اور ہر مضمون کے بس اتنے مسائل جتنے ان ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر تھے منتخب کر لیے - بعض نے زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھا، بالخصوص امریکا والوں نے - یعنی نصاب کے متعلق بہت سے سوالات تیار کرکے معلموں، بچوں کے والدین، کارخانوں کے مالکوں، سرکاری حکام وغیرہ کے پاس بھیجے گئے اور ان کے جوابوں کا مطالعہ کرکے نتائج نکالے گئے - بعض نے اپنے اپنے مدرسوں میں طلبہ کے شوق اور ان کی پسند کو اپنا راہبر بنایا اور یہ دیکھا کہ کون سے مباحث اور موضوع ایسے ہیں جو ان کی زندگی کے ساتھ ربط رکھتے ہیں - اور جن میں ان کا دل خود بخود لگتا ہے - اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات کوششیں مناسب حدود سے آگے نکل جاتی تھیں اور ایک آزمائشی طریقے کو لوگ حکمی اور قطعی سمجھنے لگتے تھے - لیکن ان کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام درسی مضامین میں بہت مفید ترمیم و تنسیخ ہوئی اور ہوتی جا رہی ہے - بعض مدارس جدید نے

کئی سال تک تجربہ کرنے کے بعد اپنے نصاب شائع کئے ہیں۔
ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں بہت کچھ
کام ہوچکا ہے اور وہ نظری بحث کرنے والوں نے نہیں بلکہ
زیادہ‌تر اُن لوگوں نے کیا ہے جو خود معلمی کرتے ہیں - انہوں
نے سب مضامین میں اس قدر تبدیلیاں کی ہیں کہ گویا
ان کی قلب ماہیت کردی ہے - اس کے لئے خاص طور پر
ونتکا (Winnetka) سے نصاب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو
پروفیسر رگ (Rugg) کی نگرانی میں تیار ہوا ہے کیونکہ
وہ دوسرے نصابوں کی طرح محض ایک اسکول میں جہاں
کے حالات غیر معمولی طور پر سازگار ہوں استعمال نہیں کیا
گیا بلکہ ایک پوری ریاست کے تمام مدارس میں جاری ہے -

نصاب جدید میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ادب وغیرہ
غرض ہر مضمون میں زندہ مباحث شامل کئے گئے ہیں یعنی
وہ چیزیں جو ایک طرف بچوں کی دلچسپی اور شوق
کو ابھارتی ہیں اور دوسری طرف تمدنی زندگی کے مسائل
حاضرہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہیں - تاریخ ارتقاے
انسانی کی تفسیر ہے جو بچوں کے تجسس پسند دماغ کو وہ
زبردست ڈراما دکھاتی ہے جس کا ہیرو انسان ہے اور اسٹیج
عالم فطرت اور جس کا ہر ایکٹ اس کی تہذیب و ترقی کے
کسی دور کا نقشہ دکھاتا ہے - جغرافیہ بے‌ربط واقعات اور
معلومات کا مجموعہ نہیں رہا - اس کا کام اب یہ ہے کہ انسان
اور اس کے طبیعی ماحول کا عمل اور رد عمل دکھائے اور بچوں
کو ایک طرف تو یہ احساس دلائے کہ انسان اور فطرت قوانین
طبیعی کے ذریعے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور

دوسری طرف یہ دکھلائیے کہ انسان نے انفرادی اور اجتماعی کوشش کے ذریعے کس طرح رفتہ رفتہ ان قوانین کو سمجھ کر اور ان سے کام لے کر عالم فطرت کو مسخر کر لیا اور صنعت و حرفت اور کاشتکاری کا یہ زبردست نظام قائم کیا ہے - جغرافیہ بحیثیت ایک انسانی علم کے اور بحیثیت ایک سائنس کے یہ فرائض انجام دیتا ہے - عمرانی علوم اور سائنس دونوں اپنی جگہ پر اس مقصد کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں اور اپنے رنگ میں طلبہ کی نظر میں وسعت پیدا کرتے ہیں اور انہیں یہ دکھاتے ہیں کہ لوگ کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں کن حالات اور قوانین کے ماتحت اپنے کار و بار چلاتے ہیں اور ہر شخص کی بھلائی برائی، کامیابی اور ناکامیابی کس طرح اور کس حد تک دوسروں پر منحصر ہے - طریقۂ تعلیم اور مواد تعلیم دونوں کی نفسیاتی تنظیم کرنے اور انہیں موجودہ جمہوری معاشرے کے لیے موزوں بنانے کی غرض سے اسی اصول پر عمل کرنے کی ضرورت ہے - سائنس کا نصاب اس لحاظ سے بھی معین کیا جا سکتا ہے اور اکثر اسی خیال سے کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے طلبہ کو کچھ واقعات اور حقائق معلوم ہو جائیں اور وہ سائنس کے مخصوص طریقۂ عمل سے روشناس ہو جائیں - لیکن اس کا ایک دوسرا اور اہم تر مقصد یہ ہے کہ وہ لڑکوں میں معاشری احساس اور نظر پیدا کرے جس کے ذریعے سے ان میں تمدنی زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو - اس لئے کہ موجودہ معاشرت اور تمدن کے اصول سائنس سے ماخوذ ہیں اور ان کو سمجھانے کے لیے ہمیں مدرسے میں سائنس ہی سے کام لینا پڑے گا اور اس کی تعلیم کو اس طرح

مرتب کرنا ہوگا کہ ہمارے طلبہ ان نئے معاشرتی مسائل سے جو سائنس کی ترقی کا نتیجہ ہیں عہدہ برآ ہو سکیں۔ پروفیسر بوڈے (Bode) سائنس کے امکانات اور اس کے تعلیمی اثرات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

''جیسا کہ ہمیں معلوم ہے سائنس نے ہمارے روز مرہ کے ماحول کو بالکل بدل دیا ہے۔ اگر ہم غور کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس تبدیلی کی وسعت کا صحیح اندازہ ہوگا..........سائنس کی ایجاد مثلاً آلات حرب، مبادلۂ خیالات کے ذرائع، وسائل نقل و حمل، مشینوں کی صنعت و حرفت وغیرہ کی بدولت معاشری نظام کے جدید نمونے قائم ہو گئے ہیں۔ مختلف طرح سے لوگوں میں باہمی وابستگی کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں جن کی وجہ سے باہمی مفاہمت اور اتحاد عمل کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سائنس ہی نے ہمیں یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ کائنات پر قوانین قدرت کا تسلط ہے اس لیے ہمیں اپنے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی تنظیم نئے سرے سے کرنا چاہیے۔ معاشری نظر سے ہماری یہی مراد ہے کہ اگر ایک ہوشیار اور عقل مند معلم سائنس پڑھائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ طلبہ کے دل میں انسانوں کا احترام بحیثیت انسان ہونے کے راسخ ہو جائے گا اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے معلم اس اصول کو اپنا رہبر بنائے گا کہ انسان اپنے ماحول کا مالک ہے اور وہ ایک ایسی دنیا تعمیر کر سکتا ہے جس میں نہ افلاس ہوگا، نہ

جہالت، نہ مرض، نہ بے انصافی - مختصر یہ کہ ہر مضمون کے ذریعے سے جس کو نصاب میں جگہ دی جائے وہ طرز خیال پیدا کرنا چاہیے جو انسانوں پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ماحول کی تعمیر جاری رکھیں اور اپنے لیے ایسے معیار عمل بناتے رہیں جو احترام انسانیت یعنی جمہوریت کے ساتھ ہم آہنگ ہوں" ۱ -

ہمارے ہندوستانی مدارس میں سائنس کی تعلیم اس قدر ابتدائی اور ناقص حالت میں ہے کہ اس سے نہ وہ محدود علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں جو عام طور پر استادوں کو مرغوب ہیں، نہ وہ وسیع تر معاشری اغراض جن کی تشریح بوڈ (Bode) نے اپنی کتاب میں جا بجا کی ہے - یوں تو ہمارے تمام درسی مضامین میں اصلاح اور ترتیب جدید کی ضرورت ہے لیکن تاریخ اور سائنس کا نصاب تو ایک سرے سے بدلنا ہے کیونکہ انہیں دونوں مضامین کے ذریعے ہم ہندوستانیوں میں اجتماعی احساس کو مستحکم کرسکتے ہیں اور فرقہ وارانہ تعصبات کو مٹا کر ان کی جگہ قومیت کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں - بعض خاص سیاسی حالات میں مثلاً جب ایک ملک کے لوگ کسی غیر قوم کے محکوم ہوں اور اس کے جبر و تشدد سے عاجز آجائیں تو قومی اتحاد اور وطنیت کا جوش جذبۂ منافرت یا جذبۂ انتقام کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن وہ عارضی ہوتا ہے - ان وقتی اثرات کے دور ہوتے ہی باہمی اختلافات پھر عود کر آتے ہیں اور اتحاد مفقود ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی

۱ - Bode : Modern Educational Theories صفحہ ۷۰ -

بنیاد کسی مضبوط عقیدے پر نہیں ہوتی - اگر ہم کسی ملک
کے افراد میں اغراض و مقاصد کا مستقل اتحاد اور باہمی
ہمدردی کا پائدار جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی تدبیر
یہ ہے کہ ہم مدرسے کی چاردیواری میں نوعمر بچوں اور
نوجوانوں پر اثر ڈالیں تاکہ وہ وہاں سے قومی اتحاد کے پکے
رنگ میں رنگے ہوئے نکلیں - اس میں تاریخ کا کام یہ ہے کہ
وہ انھیں رفتہ رفتہ لیکن نہایت موثر طریقے سے یہ محسوس
کرادے کہ ہر قسم کی ترقی کے لیے' تمام بڑے بڑے کاموں کو
انجام دینے کے لیے' ہر زمانے میں اشتراک عمل کی ضرورت
رہی ہے اور وہ تمام جنگ و جدل کے واقعات' بادشاہوں کی
لڑائیاں' جماعتوں کے اختلافات' جن کی داستانوں سے مروجہ
درسی کتب بھری پڑی ہیں سطحی چیزیں ہیں - ان کی
مثال طوفان کی سی ہے یہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں مگر
اصل چیز جو دریا یا سمندر کی ہستی کو قائم رکھتی ہے وہ
اتصال یا کشش ہے جو ناچیز قطروں کے مجموعے کو ایک بحر
زخار ایک غیر محدود قوت کا خزانہ بنا دیتی ہے - ان سیاسی
مخالفتوں کی تہ میں وہ اتحاد عمل پوشیدہ ہے جس کی
بدولت معاشرتی زندگی قائم ہے جس کی وجہ سے زراعت'
صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ کے سارے کام چلتے رہے ہیں
اور چلتے رہیں گے - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے
جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں تاریخ کے اقتصادی'
معاشرتی اور عقلی پہلوؤں پر زور دینے کی ضرورت ہے - اسی
طرح ہمارے موجودہ قومی حالات میں سائنس کی اہمیت
بھی بہت زیادہ ہے - اس کی صحیح تعلیم کے ذریعے ہم

نہ صرف اس باہمی وابستگی کی تشریح اور تفسیر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کر سکتے ہیں بلکہ طلبہ میں وہ علمی طرز خیال پیدا کر سکتے ہیں جس کی ہماری قوم میں بہت کمی ہے - لوگوں کے جوش، حوصلے اور امنگ کو ابھارنے کے لیے، انہیں تقدیر پرستی کے بجائے فلسفۂ عمل کی تلقین کرنے کے لیے، ان کی خوابیدہ قوت تسخیر کو بیدار کرنے کے لیے ان تک سائنس کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے - دوسری قوموں نے سائنس کے ذریعے نہ صرف فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیا ہے بلکہ ملکوں اور قوموں کو اپنا مطیع بنا لیا ہے - برخلاف اس کے ہم اپنی غفلت اور جمود اور سائنس کی طرف سے بے پروا ہونے کی وجہ سے اپنی قدیم حیثیت کو بھی کھو بیٹھے ہیں - اس حالت کو بدلنے میں سائنس بہت مدد دے سکتی ہے - بےشک اس کا تعلق قومی سیرت کی تشکیل سے ہے جو ایک مشکل اور وسیع مسئلہ ہے جس سے ہم کتاب کے دوسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے - لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس عظیم الشان کام کی بنیاد مدرسے ہی میں ڈالی جا سکتی ہے اور اس میں علاوہ اور چیزوں کے، نصاب کو خصوصاً سائنس کے نصاب کو بہت بڑا دخل ہے - اس کا مروجہ نصاب جو متفرق مباحث کے متعلق بالکل سطحی اور سرسری واقفیت تک محدود ہے اس مقصد کو پورا نہیں کرتا - اس میں عملی پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ میں فعالیت اور کارکردگی کی نشو و نما ہو - اس کے انسانی پہلو کو زیادہ نمایاں کرنا چاہیے تاکہ سائنس محض مجرد تصورات اور نظریوں کا مجموعہ نہیں

بلکہ انسانی جد و جہد کا نتیجہ سمجھی جائے - اس مقصد
کے لیے سائنس کے بڑے بڑے محققوں اور موجدوں کی سوانح
عمری کا مطالعہ مفید ہے تاکہ طلبہ کو معلوم ہو کہ انہوں نے
کس قدر مشکلات کا مقابلہ کیا' کس طرح طلب میں صادق
رہے اور اپنی تحقیقات سے دنیا کو مالا مال کر گئے - اور وہ یہ
بھی سمجھ لیں کہ ان میں سے ہر ایک کی کامیابی ان
بےشمار معروف اور غیر معروف کام کرنے والوں پر موقوف تھی جو
ان سے پہلے اس میدان عمل میں جد و جہد کر چکے تھے -
تیسری چیز جس کو سائنس کے نصاب کا جزو بنانا چاہیئے
یہ ہے کہ اس سے عمرانی زندگی میں کیا کام لیا جاتا ہے یعنی
طلبہ کو اس کا موقع ملنا چاہیئے کہ سائنس کے اصولوں کا
استعمال روزمرہ کے کار و بار میں دیکھیں - وہ اپنے مدرسے کے
معمل میں ایک محدود پیمانے پر سائنس کے قوانین اور
اصولوں کے استعمال کو دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ کافی نہیں -
انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ان قوانین کو انسان نے
کس طرح بہت بڑے پیمانے پر اپنے مادی مقاصد کے حصول کے
لیے استعمال کیا ہے - اس لیے جہاں کہیں موقع ہو انہیں
بڑے بڑے کارخانوں اور مشینوں کا اور روزمرہ کی زندگی میں
سائنس کے کرشموں کا مشاہدہ کرانا چاہیئے تاکہ ان کی نظر
میں وسعت پیدا ہو اور وہ سائنس کے غیر محدود عملی
امکانات سے روشناس ہوں - ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ سائنس کو
ایک ایسا علم سمجھیں گے جو کتابوں تک یا مدرسے کے معمل
اور اس کے چھوٹے چھوٹے آلات تک محدود ہے - بلکہ سچ
پوچھیئے تو ہمارے طلبہ میں اکثر کے ذہن میں سائنس

کا یہی غلط اور محدود تصور ہے - اگر سائنس کے نصاب کو مجوزہ اصولوں پر مرتب کیا جائے تو اس سے یقیناً طلبہ کے علم اور واقفیت میں مفید اضافہ' ہوگا اور وہ موجودہ نظام تمدن کو جو بڑی حد تک سائنس کے اشاروں پر چلتا ہے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور اس کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہو کر زیادہ کامیابی حاصل کریں گے - یہاں اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ خواہ تاریخ کی تعلیم ہو یا سائنس کی یا کسی اور مضمون کی' اخلاقی مقاصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں کہ وہ ہر وقت طلبہ کے پیش نظر رکھے جائیں اور ان کی جا و بےجا تلقین کی جائے - ایسا کرنے سے طلبہ میں بد دلی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے - پائدار نتائج صرف اسی صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب معلم خود تو ان مقاصد کو پیش نظر رکھے مگر طلبہ کو اس بات کا احساس نہ ہونے دے کہ ان کی اخلاقی تعلیم ہو رہی ہے - اخلاقی تلقین اور تبلیغ سے زیادہ موثر وہ بالواسطہ تربیت ہے جو علم اپنی اثر آفرینی' اپنے طریقۂ تعلیم' اور نصاب کی مناسب تدوین کے ذریعے دیتا ہے -

نصاب میں ایک طرف یہ علوم شامل ہیں جن کے ذریعے سے بچے تمدنی زندگی کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں اور مفید معلومات حاصل کرتے ہیں - دوسری طرف اس میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو علم سے زیادہ تربیت ذوق سے تعلق رکھتے ہیں - اس میں ادب' فنون لطیفہ یعنی موسیقی' مصوری' ڈرائنگ وغیرہ اور دستکاری شامل ہیں - تحصیل علم اور تربیت ذوق کے درمیان کوئی حد فاصل

نہیں کیونکہ ایک حد تک انسان کی شخصیت میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں - لیکن بعض مضامین عملی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور بعض حسن ذوق پیدا کرنے پر - نصاب میں ان مضامین کی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا، خصوصاً بچے کا جذبۂ تخلیق کسی موزوں خوشنما شکل میں ظاہر ہونے کے لیے بیقرار رہتا ہے - وہ اپنے گرد و پیش کی اشیا کو ایسی ترتیب دینا چاہتا ہے کہ ان میں حسن پیدا ہو - وہ مادے کو صورت بخشنا چاہتا ہے - ادب میں وہ انسانی جذبات اور خیالات کا نظم و نثر کی خوشنما شکلوں میں مطالعہ کرتا ہے اور خود اپنے جذبات کو اسی انداز میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے - ہمیں ادب کی اعلیٰ معاشری قدر سے انکار نہیں کیونکہ اکثر ادب کے شاہکار انسانی زندگی کے مسائل اور محرکات کو سمجھانے میں سائنس اور تاریخ کے خشک اور علمی بیانات سے کہیں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے ہمجنسوں کی خوشی اور غم، کامیابی اور ناکامی میں شریک کرکے ہمارے جذبۂ انسانیت کی توسیع اور تہذیب کرتے ہیں - کسی اعلیٰ درجے کے شاعر کا کلام یا کسی جید ادیب اور افسانہ‌نگار کی بلند پایہ تصانیف حقیقی معنی میں زندگی کی تفسیر اور تمدن کی تنقید ہوتی ہیں - لیکن کسی تحریر یا تقریر، کسی نظم یا نثر کو ادب کا درجہ اسی وقت ملتا ہے جب وہ ہمارے ذوق حسن کی تسکین کرے - اسی طرح نصاب میں دستکاری اور فنون لطیفہ کو اس غرض سے جگہ دینی چاہیے کہ بچوں میں جذبۂ تخلیق بیدار

ہو، آرٹ کے عمدہ نمونوں کو دیکھ کر ان کا مذاق پاکیزہ اور شستہ ہو اور اُنھیں ایسے مشاغل میں دلچسپی ہو جن کو وہ آئندہ زندگی میں اپنی فرصت کا خوشگوار مشغلہ بنا سکیں - ہمارے ملک میں شائد سو میں ننانوے طلبہ کا خانگی ماحول ایسا ہوتا ہے جو ان کے مذاق کی صحیح تربیت میں کسی طرح معین نہیں ہوسکتا - ان کو اپنے چاروں طرف بھدی اور بےڈھنگی چیزیں، تنگ و تاریک مکان، خراب اور میلی سڑکیں، ادنیٰ درجے کی تصویریں، مشین کی بدنما مصنوعات نظر پڑتی ہیں جن کا مجموعی اثر اُن کی طبیعت اور مذاق پر بہت خراب ہوتا ہے - مدرسے کا یہ کام ہے کہ انھیں حسین چیزوں سے روشناس کرے، اپنی چاردیواری کے اندر ہر چیز میں صفائی، سادگی اور حسن ذوق کو دخل دے - اس کی عمارت صاف ستھری ہونی چاہیے - فرنیچر اور سامان کا قیمتی ہونا ضروری نہیں لیکن سڈول اور خوش نما ہونا نہایت ضروری ہے - تصویروں، دستکاریوں وغیرہ کے عمدہ نمونوں، طلبہ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی خوبصورت چیزوں، اور مختلف قسم کے تعلیمی نقشوں سے کمروں کو سجانا چاہیے تاکہ ان سب کا اثر غیر محسوس طریقے پر طلبہ کے مذاق پر پڑے - اسی طرح مدرسے میں جہاں کہیں ممکن ہو، باغ یا چمن لگانا چاہیے کہ وہ حسن فطرت کا نہایت عمدہ نمونہ ہے اور جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں کم خرچ میں خوبصورت پھولوں کے گملوں اور بیلوں کی مدد سے مدرسے میں خوش نمائی پیدا ہو سکتی ہے - طلبہ کے لیے تعلیمی سیر و سفر کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ جہاں کہیں فن تعمیر یا مصوری یا قدیم صنعتوں وغیرہ کے خوبصورت

نمونے موجود ہوں وہاں جاکر وہ استاد کی نگرانی میں
ان کا مطالعہ کریں اور ان کی نظر میں حسن شناسی
پیدا ہو ۔ معمولی طالب علم کو اس کے بدنما اور بےکیف
ماحول سے نکالنے کا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کے اثرات
سے محفوظ رکھنے کا سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں کہ
مدرسوں کو گویا اس وحشت ناک صحرا کے بیچ میں ایک
دل‌کش نخلستان بنا دیا جائے جس کی فضا میں پرورش پاکر
ان کے مذاق کی اصلاح ہو وہ خوش نما اور بدنما چیزوں میں
تمیز کرسکیں، عالم فطرت اور عالم صنعت میں جہاں کہیں
کوئی خوبصورت چیز دیکھیں اس کی قدر کریں اور اس سے
لطف اندوز ہوں اور اپنی صلاحیت اور میلان کے مطابق خود
بھی تخلیق حسن میں حصہ لے سکیں ۔ اس کا طریقہ وہی
ہے جو ہم اوپر بیان کرچکے ہیں یعنی طلبہ کو حسن صورت
اور حسن ذوق کے ماحول میں رکھا جائے جو غیر محسوس
طریقے پر ان کے ذاتی مذاق کو سدھارے اور نصاب میں
ایسے مضامین شامل کیے جائیں جو ان کی عملی یا انفعالی
طور پر جذبۂ تخلیق کے اظہار کا موقع دیں ۔ ادب اور فنون
لطیفہ کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جس شخص میں ان
کا صحیح مذاق پیدا ہو جاتا ہے وہ گھٹیا چیزوں اور بدنما
حرکتوں سے نفرت کرنے لگتا ہے ۔ مثلاً ادنیٰ درجے کے ناولوں
اور قصوں، بری تصویروں، بےجا نمائش اور مبالغے سے اسے
وحشت ہوتی ہے اور وہ خود بخود ان سے دور رہتا ہے ۔ اس کے
لیے کسی عقلی دلیل یا غور فکر کی ضرورت نہیں ہوتی ۔
کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں مہذب نہیں

ہوسکتی جب تک عوام کے مذاق کا معیار بلند نہ کیا جائے اور اس کی ذمہ‌داری بھی' اور بہت سی ذمہ‌داریوں کی طرح مدرسوں پر عائد ہوتی ہے - ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ ہر شخص میں اعلیٰ احساس جمال پیدا ہوسکتا ہے یا ہر شخص صناع بن سکتا ہے - لیکن ہمارے نزدیک ہر شخص کا مذاق ایک حد تک اصلاح پذیر ہے اور بےشمار خوبصورت مناظر اور صنائع میں سے کسی نہ کسی سے ضرور لطف اندوز ہوسکتا ہے - ساری قوم کے احساس جمال کی تربیت کے لیے مدرسے کے ساتھ اور بہت سے بیرونی اداروں کا اشتراک عمل ضروری ہے لیکن جہاں تک نوعمروں کا تعلق ہے مدرسے بہت کچھ کرسکتے ہیں بشرطیکہ معلموں میں اس بات کا احساس ہو اور خود ان میں ذوق جمال مفقود نہ ہو - ذوق ایسی چیز ہے جو سکھایا نہیں جا سکتا بلکہ اس کا اثر براہ راست دل پر پڑتا ہے -

ہندوستانی مدارس کے نصاب کی بحث میں ہمیں مادری زبانوں اور ان کے ادب کا ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ بہت سے داخلی اور خارجی اسباب کی وجہ سے ہمارے یہاں اپنے زبان اور ادب کی کما حقہ قدر نہیں کی‌ا جاتی - بہت سے ناواقف لوگوں کا جنھوں نے صرف مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور تمام علوم انگریزی زبان میں پڑھے ہیں یہ خیال ہے کہ ہندوستانی زبانیں ابھی بہت کم مایہ ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کا بار اُٹھا سکیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگ سیاسی اور اقتصادی حالات سے مجبور ہوکر اپنی زبان اور اپنے علوم سے بیگانہ ہوگئے ہیں اور اپنی ساری توجہ اور کوشش مغربی علوم انگریزی زبان کے ذریعے سے حاصل کرنے میں صرف

کرتے ہیں - اس صورت حال کے جو نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ تعلیمی اور قومی نقطۂ نظر سے نہایت مضر ہیں - ایک تو انگریزی زبان پر ضرورت سے زیادہ زور دینے اور دیسی زبانوں سے غفلت برتنے سے ان زبانوں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی جس کو ناسمجھ لوگ ان کے خلاف بطور ایک دلیل کے پیش کرتے ہیں! دوسرے' چونکہ ابتدا میں تقریباً تمام تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی تھی اور اب بھی ثانوی تعلیم بڑی حد تک اور اعلی تعلیم تمامتر انگریزی میں ہوتی ہے اس لیے ملک میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں کے درمیان بیگانگی پیدا ہوگئی جس کے اثرات دونوں کے لیے بہت برے ثابت ہوئے - یعنی ان کے اغراض و مقاصد میں جو اختلاف تھا وہ اور بڑھ گیا اور معاشری معاملات میں اتفاق راے اور اتحاد عمل ناممکن ہوگیا - گزشتہ چند سال میں سیاسی اسباب اور تحریکوں کی بدولت اس کی کسی قدر اصلاح ہوئی ہے - لیکن ابھی تک ان طبقوں میں یک جہتی پیدا نہیں ہوئی خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان تمام طلبہ کا علمی معیار بہت کم ہوگیا ہے جنھیں غیر زبانوں کی تحصیل سے کوئی خاص مناسبت نہیں اور چونکہ بہت بڑی تعداد ایسے ہی طلبہ کی ہے اس لیے مدرسوں کے عام معیار پر نہایت خراب اثر پڑا - ایک اوسط قابلیت کے طالب علم کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ کسی مضمون مثلاً تاریخ' جغرافیہ یا سائنس کا مطالعہ ایک غیر زبان میں کرے - اس کی آدھی توجہ مطلب پر ہوتی ہے اور آدھی ان الفاظ پر جن کا صحیح

مفہوم سمجھنے کی وہ کوشش کرتا ہے اور اکثر کامیاب نہیں ہوتا - یا ہوتا بھی ہے تو بڑی محنت سے اور بہت سا وقت ضائع کرنے کے بعد - لوگ بہت سے ہندوستانیوں کو صحت اور روانی کے ساتھ انگریزی بولتے اور پڑھتے دیکھتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ لاکھوں طلبہ میں سے مشکل سے سو دو سو کو یہ بات حاصل ہوتی ہے اور اگر بالفرض طلبہ کی بہت بڑی تعداد انگریزی پر عبور حاصل کر لے تب بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ وقت جو مختلف سائنسوں اور عمرانی علوم کی تحصیل میں صرف ہوسکتا ہے اور جس کی وجہ سے طلبہ کی علمی قابلیت کا معیار بہت بڑھ سکتا ہے کیوں محض ایک زبان کی تحصیل میں ضائع کیا جائے؟ اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ انگریزی زبان نصاب سے خارج کر دی جائے کیونکہ ہمیں اس کی اہمیت کا پورا احساس ہے - اس وقت تو وہ سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے ایک خاص حیثیت رکھتی ہے جس کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے - لیکن جب ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی تسلط نہ رہے گا تب بھی تجارت اور بین الاقوامی سیاست کے لیے ہم اس کے محتاج رہیں گے اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ ہمارے اور مغربی تہذیب و تمدن کے درمیان انگریزی زبان ہی واسطے کا کام دے سکتی ہے - لہذا اس کی مستقل اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں ہوسکتا - لیکن ہمیں تعلیمی نقطۂ نظر سے اس امر پر اعتراض ہے کہ وہ نصاب پر بالکل حاوی ہوگئی ہے اور اس کی تحصیل میں طلبہ کو بےاندازہ وقت اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے - ہمارے خیال میں اس کو ذریعۂ تعلیم بنانے

کے لیے اب کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جا سکتی ۔ کیونکہ ملک کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں اتنا علمی اور ادبی ذخیرہ موجود ہے اور وہ اس تیزی سے ترقی کر رہی ہیں کہ نہ صرف ثانوی بلکہ اعلیٰ مدارج میں بھی یہ زبانیں ذریعۂ تعلیم کا کام دے سکتی ہیں ۔ انگریزی زبان کو ہائی اسکولوں اور کالجوں دونوں میں ایک نہایت اہم اختیاری زبان کی حیثیت دینی چاہیے جس کو وہ تمام طلبہ حاصل کریں جن کو تجارت یا سرکاری نوکری یا مغربی علوم و فنون حاصل کرنے کے لیے یا مغربی تہذیب و ادب سے مستفید ہونے کے لیے اس کی ضرورت ہے ۔ ابتدا میں اس کو اختیاری زبان بنا دینے سے کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہوگی کیونکہ بیشتر طلبہ اقتصادی اور سیاسی وجوہ سے اور مغربی تہذیب کے ذہنی تسلط سے مجبور ہوکر انگریزی پڑھیں گے، لیکن رفتہ رفتہ لوگ جن کو ایسے پیشے اختیار کرنے ہیں جن میں انگریزی زبان کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً کاشتکاری، یا چھوٹے پیمانے پر دکانداری یا صنعت و حرفت اس کو چھوڑ دیں گے اور اس کی تعلیم اس مختصر جماعت کے لیے مخصوص ہو جائے گی جن کو علمی مشاغل یا سیاست یا بڑے پیمانے پر صنعت و حرفت اور تجارت میں زندگی بسر کرنی ہے ۔ اس وقت خود اس زبان کی تعلیم بھی بہت بہتر ہو جائے گی ۔ کیونکہ معلموں پر یہ بار نہیں ہوگا کہ وہ ہر کس و ناکس کو خواہ قدرت نے اسے اس قابل بنایا ہو یا نہ بنایا ہو، زبردستی ایک مشکل غیر ملکی زبان پڑھائیں ۔ وہ اپنی پوری توجہ اور محنت ان طلبہ پر صرف کریں گے جو واقعی اس زبان سے مناسبت اور شوق رکھتے

هیں - عام طلبہ کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اس بوجھ سے سبکدوش ہو کر اپنی مادری زبان اور مادری ادب کی طرف زیادہ توجہ کر سکیں گے اور اس کے ذریعے نہ صرف ان کی علمی استعداد بڑھے گی بلکہ ان میں ذوق ادب بھی پیدا ہوگا - کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کے لیے اس زبان کے ادبی نکات اور خوبیوں سے لطف اندوز ہونا قدرتاً زیادہ آسان ہے جو گویا بچپن سے ان کی گھٹی میں پڑی ہے اور جس کے اصول سے وہ غیر محسوس طریقے پر باتوں باتوں میں واقف ہو جاتے ہیں - علاوہ اپنی زبان اور اپنے ادب میں طلبہ کو ایسے جذبات اور خیالات ایسے واقعات اور مناظر ملتے ہیں جو ان کی تجربے کے اندر ہیں یا جن کو وہ اپنے تخیل کی مدد سے بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں اس لیے انھیں قدرتی طور پر اس سے زیادہ دلبستگی ہوتی ہے - خود قومی زبانوں کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ جب وہ یونیورسٹی میں دوسرے علوم و فنون کی ہم‌پلہ ہوں گی اور ان کے ذریعے تمام علوم و فنون پڑھائے جائیں گے تو ان کا معیار بلند ہو جائے گا اور تعلیم یافتہ جماعت میں سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو اپنے آپ کو ان کی خدمت کے لیے وقف کر کے انھیں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مرتبے پر پہنچا دے گا - اس ضمن میں جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کا تجربہ گو ابھی اس کی عمر چند ہی سال کی ہے بہت امید افزا ہے - اس کی بدولت بہت سی علمی تصانیف اردو زبان میں منتقل ہوگئی ہیں اور منتقل ہوتی جاتی ہیں اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اردو زبان کے ذریعے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم دی جا سکتی ہے - مادری زبان میں تعلیم دینے کی ضرورت کو ایک حد تک

ھ

تعلیمی محکموں نے تسلیم کرلیا ہے اور سوائے چند جموٹی پسند یونیورسٹیوں کے تقریباً سب جگہ ہائی اسکولوں کی تعلیم صوبے کی زبان یا زبانوں میں دی جاتی ہے - اور غالباً چند سال کے اندر اندر کوئی یونیورسٹی ایسی نہ رہے گی جہاں ثانوی تعلیم انگریزی کے ذریعے دی جائے - لیکن اس کے بعد دیسی زبانوں کو ایک اور تعلیمی جہاد کرنا پڑے گا جس کا مقصد کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تسخیر ہوگا - اس جہاد کی ابتدا بھی ہو چکی ہے اور کہیں کہیں سرکاری طور پر تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں کہ وہ اس معاملے کے ہر پہلو پر نظر ڈال کر رپورٹ پیش کریں - اسی قسم کی ایک کمیٹی جو ناگپور یونیورسٹی کی طرف سے مقرر ہوئی تھی واس کی رپورٹ بحیثیت مجموعی اس اصول کی مؤید ہے کہ کالجوں میں طلبہ کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے اور گو اس پر ابھی تک عمل در آمد نہیں ہوا لیکن بطور ایک علامت کے اس کی بہت اہمیت ہے - اور اس سے ہوا کے رخ کا اندازہ ہوسکتا ہے - پنڈت مدن موہن مالویا نے حال ہی میں بنارس یونیورسٹی کے ایک اہم اجلاس میں اس بات کا اعلان کیا ہے کہ عنقریب وہاں انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم ہندی میں دی جائے گی -

اب یہ امر واضح ہو گیا کہ یہ نصاب جدید جس کے اہم عناصر سے ہم بحث کر چکے ہیں مدرسے کے مروجہ نصاب سے بہت زیادہ وسیع اور متنوع ہوگا اور اس میں طلبہ کی مکمل تربیت کے بہت زیادہ امکانات ہوں گے - ان کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں، جن کی تفصیل ہم پہلے بیان

کر چکے ہیں :—

اول درسی مضامین جن میں زیادہ تر وہ مروجہ علوم ہوں گے جو اب بھی مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں مثلاً سائنس، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، مادری زبان، قدیم زبانیں، انگریزی وغیرہ - ان مضامین کا نصاب بالکل وہی نہیں ہوگا جو اب ہے گو نام بھی رہیں گے - ان کے مواد کی اچھی طرح تنقید کرنی ہوگی اور غیر ضروری چیزوں کو نکال کر زندہ مسائل اور دلچسپ مباحث شامل کیے جائیں گے جو طلبہ کے ذہنی معیار اور میلان کے مطابق ہوں اور ان کو معاشرتی زندگی کے نظام سے آگاہ کریں -

دوسرے وہ مضامین اور مشاغل جن کا تعلق ہاتھ اور آنکھ کی تربیت سے ہے اور جن کے ذریعے قوت تخلیق اور حسن ذوق پیدا ہوتا ہے یعنی مختلف قسم کی دستکاریاں، مصوری، موسیقی اور ادب بحیثیت ایک فن لطیف کے - ہمارے مروجہ نصاب میں یہ شعبہ بہت ناقص ہے - اکثر مدارس میں تو ان مضامین کی تعلیم کا بالکل ہی انتظام نہیں ہے اور اس نقص کی وجہ سے طلبہ کی تربیت نامکمل اور یک طرفہ رہتی ہے - بعض مدارس میں صرف ڈرائنگ یا کہیں کہیں لکڑی کا کام نصاب میں شامل کیا گیا ہے لیکن اس کے واقعی مفہوم اور اہمیت کو خود معلموں نے بھی نہیں سمجھا - کیونکہ وہ اس کو محض ہاتھ کا ہنر سمجھ کر سکھاتے ہیں نہ اس طرح سے کہ طلبہ کو تخلیق کے ذریعے اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع ملے - اگر ہم مدرسے کو بجائے ایک غیر دلچسپ "درسگاہ" کے بچوں کی "تربیت گاہ" بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں

ان مضامین کی تعلیم پر زیادہ زور دینا پڑے گا -

تیسرے وہ بہت سے مشاغل ہیں جو براہ راست نصاب سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ان کے ذریعے طالبہ اپنے فرصت کے وقت میں خواہ مدرسے میں یا گھر پر' اپنے شوقوں کو جو اکثر نصابی مشاغل کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں پورا کرتے ہیں - اس قسم کے مشاغل میں' جو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں' طالبہ کو نہایت قابل قدر تربیت اور واقفیت حاصل ہوتی ہے - ان میں اعتماد ذات' صلاحیت عمل اور ذوق سلیم پیدا ہوتا ہے اور وہ مل جل کر تقسیم عمل کے اصول پر کام کرنا سیکھتے ہیں - ہر اچھے مدرسے میں اس قسم کے بہت سے مشاغل خود بخود بچوں کے اپنے شوق اور اهتمام سے رائج ہو جاتے ہیں - مثلاً مدرسے کا میگزین نکالنا' مختلف قسم کی علمی اور ادبی انجمنیں قائم کرنا' تعلیمی سیر و سفر کا اهتمام کرنا' مجلس مباحثہ کو چلانا' حکومت خود اختیاری کا انتظام' فرصت کے اوقات میں دستکاری کا مشغلہ' اپنے شوق سے فنون لطیفہ میں سے کسی فن کی مشق -

ایک زندہ مدرسے کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کے طالبہ اپنے شوق سے کتنے مشاغل جو نصاب سے باہر ہیں یا اس میں محض ضمنی طور پر شامل ہیں رائج کر سکتے ہیں اور انہیں استقلال کے ساتھ جاری رکھ کر مدرسے کی زندگی کو خوش گوار' مفید اور عملی بناتے ہیں - نصاب کی تدوین کرنے میں معلم اس قسم کے مشاغل کو بالارادہ پیش نظر نہیں رکھتا لیکن اس کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ ہر مضمون کی تعلیم اس طرح دے کہ طالبہ کے شوق مختلف صورتوں میں ظاہر ہوں اور

وہ ان شوقوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے اهتمام سے مدرسے میں جماعتیں اور انجمنیں قائم کرلیں - مثلاً اگر تاریخ کا معلم اپنے مضمون میں ذوق اور قابلیت اور انہماک رکھتا ھے اور اپنی تعلیم کے دوران میں طلبہ کو اس کے معاشری پہلو سے آگاہ کرتا ھے، تاریخی عمارتوں سے دلچسپی دلاتا ھے، مشاهیر کی شخصیت ان کے سامنے جیتے جاگتے الفاظ میں پیش کرتا ھے تو یقیناً جماعت کے بعض طلبہ پر اس کا اثر ضرور پڑے گا - ممکن ھے کہ ان سے چند کو فن تعمیر سے دلچسپی پیدا ہو جائے اور وہ اس کا محنت اور شوق کے ساتھ مطالعہ کرنے لگیں - تاریخی عمارتوں کو دیکھیں، ان کے نقشے بنائیں، مختلف زمانوں کے فن تعمیر کا مقابلہ کریں اور اپنی واقفیت سے نہ صرف خود مستفید ہوں بلکہ استاد کی تھوڑی سی همت افزائی سے اپنے همجماعتوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچائیں - اسی طرح ممکن ھے کسی طالب علم کو کسی بڑی تاریخی شخصیت مثلاً اکبر، یا اشوک یا علاءالدین کے حالات سے خاص دلچسپی پیدا ہو جائے اور وہ کتب‌خانے کی کتابوں سے مدد لے کر اس کے متعلق کوئی مبسوط اور قابل قدر مضمون لکھے - یا چند طلبہ مل کر تاریخ کے کسی عہد کا مطالعہ اس طرح کریں کہ اس مختلف شعبوں کو آپس میں تقسیم کرلیں اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد ایک تاریخی مقالہ تیار کریں - اس طرح اگر مادری زبان کے تعلیم دینے والے استاد طلبہ میں تحریر کا صحیح مذاق پیدا کردیں اور دوسرے اساتذہ ان کے ساتھ تعاون کریں تو یقیناً ان میں یہ خواہش پیدا ہوسکتی ھے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور اپنے

روزمرہ کے تجربات اور دلچسپ مشاغل کو تحریر میں لانے کے لیے مدرسے کا میگزین نکالیں - پھر اس اشاعت کے ضمن میں اور بہت سے کام نکل سکتے ہیں مثلاً خبروں کی فراہمی، انجمنوں کی رپورٹیں لکھنا، میگزین کی کتابت یا طباعت کا انتظام کرنا، اس کے لیے سرمائے کا فراہم کرنا وغیرہ وغیرہ - ان سب کاموں کو باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دینا بہت بڑی علمی اور عملی تربیت ہے جس کا بدل درسی مضامین کی تعلیم نہیں ہوسکتی - ہمارے مدارس میں اول تو اس قسم کے مشاغل رائج ہی نہیں اور اکثر استاد ان کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں اور جہاں کہیں خال خال پائے جاتے ہیں وہاں ان کا مقصد بالعموم نمائش یا انسپکٹر کو خوش کرنا ہوتا ہے - ایسی حالت میں ان سے پورا تعلیمی فائدہ ہرگز نہیں اٹھایا جا سکتا کیونکہ وہ استاد کی طرف سے کم و بیش جبراً عائد کیے جاتے ہیں، طلبہ کی روزمرہ زندگی سے خود بخود پیدا نہیں ہوتے اور ان کے جبلی شوقوں کو ظاہر نہیں کرتے - مدرسۂ جدید کے اس پہلو کی تنظیم کے لیے استادوں میں تخیل اور بیدار مغزی اور اشتراک عمل درکار ہے اور جب تک وہ سب ان مشاغل کی اہمیت کو نہ سمجھیں اور انہیں فروغ دینے کی کوشش نہ کریں ان کے مدرسے میں زندگی اور عمل کی فضا پیدا نہیں ہوسکتی - اس بحث کے ضمن میں ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ نصاب کی یہ تقسیم محض مضامین اور مشاغل کی نوعیت کے اعتبار سے کی گئی ہے - دوران تعلیم میں اس کو قطعی سمجھ کر ان شعبوں کو ایک دوسرے سے

علاحدہ کرنا نہایت سخت غلطی ہوگی - نفسی اعتبار سے ان سب میں نہایت گہرا اور لازمی تعلق ہے کیونکہ وہ سب ایک ہی فرد کی علمی اور عملی تربیت کے وسائل ہیں اور ان کے مجموعی اثر سے اس کے دماغ اور اس کی صلاحیت عمل کی نشو و نما ہوتی ہے - اس لیے معلم کو ان کے درمیان ربط اور تعلق قائم رکھنا چاہیے یعنی درسی مضامین اور دستکاری کی تعلیم میں کوئی حد فاصل نہیں ہونی چاہیے بلکہ دستکاری کی خواہش اور شوق سے درسی مضامین کے پڑھانے میں کام لینا چاہیے - مروجہ مضامین میں سے کوئی مضمون بھی ایسا نہیں جس میں دستکاری اور فنون لطیفہ سے کام لینے کے مواقع موجود نہ ہوں - ادب کی تعلیم میں مصوری، ڈرائنگ اور موسیقی، اور تاریخ کی تعلیم میں نقشہ‌کشی، مصوری، عمارتوں، لباس جغرافیہ اور سامان کے نمونے تیار کرنا، سائنس میں آلات کے نقشے کھینچنا، عملی تجربوں کے لیے سامان تیار کرنا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعے نہ صرف بچوں کے جذبۂ تخلیق کا اظہار ہوگا بلکہ انہیں اپنے درسی مضامین سے پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپی اور رغبت پیدا ہو جائے گی - علیٰ ہذا القیاس تیسرے شعبے میں ہم نے جن مشاغل کا ذکر کیا ہے ان کو مدرسے کے واقعی کاموں سے بے تعلق نہیں سمجھنا چاہیے - جیسا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ان میں سے اکثر کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ کوئی اثرآفریں معلم طلبہ میں اپنے مضمون کے کسی خاص پہلو سے گہری دلچسپی ، ذوق پیدا کر دیتا ہے اور وہ اس کی تسکین کے وسائل تلاش کرتے ہیں اور اسے تکمیل تک پہنچاتے ہیں - اگر درسی تعلیم اور ان آزاد

مشاغل میں ربط پیدا ہوجائے گا تو اس سے دونوں کو فائدہ پہنچے گا - طلبہ اپنے اختیاری مشاغل کے انتخاب میں ان کی تعلیمی قدر کا لحاظ رکھیں گے یعنی انہیں مشاغل کو پسند کریں گے جو ان کی تعلیم میں بلا واسطہ یا بالواسطہ مدد دیتے ہوں اور جب طلبہ ان مشاغل کو اپنی خوشی اور اپنے شوق سے انجام دیں گے تو ان کی عام ذہنی بیداری اور قابلیت کا معیار بلند ہوگا اور اس کا اثر ان کے درسی مشاغل پر پڑے گا - ہر سمجھدار معلم کو اس بات کا تجربہ ہوگا کہ جب کوئی طالب علم کوئی کام اپنے شوق سے انجام دیتا ہے اور اسے اس میں کامیابی ہوتی ہے تو اس میں اعتماد نفس زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنا روزمرہ کا کام بھی پہلے سے زیادہ انہماک اور مستعدی سے کرنے لگتا ہے - لہذا معلموں کی متفقہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مدرسے کے تمام درسی مضامین اور دوسرے مشاغل کو ایک دوسرے کے ساتھ ربط دیں تاکہ ان کے ذریعے طلبہ کی شخصیت کی مکمل اور ہم آہنگ تربیت ہو سکے -

اسی طرح مروجہ درسی مضامین میں بھی ربط اور تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس ربط کی اہمیت موجودہ زمانے میں خاص طور پر زیادہ ہو گئی ہے کیونکہ کل علوم جو مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں، سائنس کی مثال سے متاثر ہو کر مختلف شعبوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر شعبے کی حدبندی اس طرح کی گئی ہے کہ نہ صرف بچوں کے خام کار دماغوں کو بلکہ اکثر استادوں کو بھی وہ اپنی جگہ پر مکمل اور دوسرے مضامین سے بےتعلق معلوم ہوتا ہے - لیکن ہم نے علم اور زندگی کی باہمی وابستگی کی بابت جو بحث کی ہے

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تفریق نہ صرف علوم کی تاریخی ارتقاء کے لحاظ سے غلط ہے بلکہ تعلیمی نقطۂ نظر سے نہایت مضر ہے - اس صورت حال کی اصلاح کے لیے ماہرین تعلیم نے مختلف کوششیں کی ہیں جن کو مجموعی طور پر "ربط مضامین نصاب" کی تحریک کہا جاتا ہے - اس کا منشا یہ ہے کہ نصاب کو معاشرتی زندگی کے ساتھ ہم‌آہنگ بنانے کے لیے مضامین کی قطعی اور مصنوعی تقسیم کو مٹا کر وہ ربط و تعلق پیدا کر دیا جائے جو ان میں قدرتی طور پر موجود تھا - اگر اس اصول کے جانچنے کے لیے ہم وہی معیار اختیار کریں جس سے ہم نے پہلے کام لیا ہے یعنی مدرسے کے باہر تمدنی زندگی کے کاروبار پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں علم کی ایسی تقسیم نہیں پائی جاتی جیسی مدرسوں میں تنگ نظر معلموں اور تعلیمی محکموں نے اپنی آسانی کی غرض سے رائج کر دی ہے - جب ہم اپنے مختلف تمدنی اور معاشرتی فرائض انجام دیتے ہیں یا صنعت و حرفت، تجارت، زراعت اور دوسرے پیشوں میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ فلاں کام کے لیے تاریخ کے علم کی ضرورت ہے فلاں کے لیے جغرافیے کی، فلاں کے لیے سائنس کی - ہمیں ان مشاغل میں مختلف قسم کی معلومات اور واقفیت درکار ہوتی ہے اور ہم حسب ضرورت بغیر کسی منطقی تحلیل کے ان سب علوم و فنون سے کام لیتے ہیں جنھیں ہم نے حاصل کیا ہے - مثلاً ایک شخص اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کا ممبر ہے اور وہ اس کے جلسے میں شریک ہوتا ہے - وہاں مختلف قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں -

کسی کا تعلق تعلیم سے ہے، کسی کا شہر کی مالی حالت سے، کسی کا حفظان صحت سے، کسی کا شہر کی عمارات سے - ان تمام امور کے متعلق معقولیت کے ساتھ رائے دینے کے لیے ہمیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم علحدہ علحدہ علوم سے مدد لیں جو ایک دوسرے سے بےتعلق ہیں بلکہ اپنی مجموعی معلومات، واقفیت اور تجربے کی بنا پر ہم ایک رائے قائم کرتے ہیں مثلاً اگر زیر غور مسئلہ صحت عامہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو سمجھنے اور اس کا حل سوچنے میں ہمیں ایک حد تک اس واقفیت سے مدد ملے گی جو ہمیں اپنی درسی تعلیم کے دوران میں علم حفظان صحت کے مطالعے سے حاصل ہوئی تھی - اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے عام تجربے اور مشاہدے سے کام لینا ہوگا جو روزمرہ کی زندگی میں حاصل ہوتا ہے اور اس میں مدرسے کی تعلیم کو کوئی خاص دخل نہیں - علاوہ بریں مجوزہ تجویز کا ایک مالی پہلو بھی ہوگا جس پر غور کرنے میں ہمارا تجربہ اور مخصوص اقتصادی واقفیت کام آئے گی - یہی صورت ہر شخص کو روزمرہ کے کاروبار میں پیش آتی ہے - یہاں تک کہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین خصوصی بھی جن کو بظاہر علم کے ایک خاص شعبے سے تعلق ہوتا ہے اپنا کام اُس وقت تک عمدگی سے نہیں کر سکتے جب تک انہیں دوسرے متعلقہ علوم سے کافی واقفیت نہ ہو اور وہ اپنے عام تجربات اور مشاہدات سے فائدہ نہ اٹھائیں - اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ارباب فکر کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ ان کی واقفیت اور دلچسپی صرف اپنے مخصوص علم تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسرے علوم و فنون اور علمی مشاغل سے بھی ذوق

رکھتے ہیں - اگر ان تمام دلچسپیوں میں مناسب تنظیم قائم رکھی جائے تو یہ ان کے مخصوص علمی مشاغل میں مخل نہیں ہوں گی بلکہ ان میں مدد دیں گی کیونکہ وہ اپنے کام کو وسیع نقطۂ نظر سے یہ سمجھ بوجھ کر انجام دیں گے کہ اسے زندگی کے دوسرے مسائل سے کیا تعلق ہے - ان کے دماغ کی مثال ایک مکمل اور پیچیدہ مشین کی سی ہے جو بہت سی کلوں کو چلاتی ہے اور ان سے حسب ضرورت کام لیتی رہتی ہے - بر خلاف اس کے اکثر ہمیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو بہت کچھ معلومات رکھتے ہیں لیکن اسے ضرورت کے وقت استعمال نہیں کر سکتے - اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی معلومات میں ربط اور نظم اور حرکت نہیں ہوتی -

ہر قابل معلم کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جب کوئی مضمون پڑھاتا ہے مثلاً کسی تاریخی یا ادبی مسئلے سے بحث کرتا ہے تو وہ اپنے درس کو محض تاریخ یا ادب ہی کے دائرے میں محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنی عام معلومات اور ذاتی تجربے سے مدد لے کر بہت سی ایسی چیزیں مثال کے طور پر یا مقابلے اور تشریح کے لیے پیش کرتا ہے جن سے زیر بحث مسئلے پر روشنی پڑتی ہے - وہ تاریخی مسائل کے ضمن میں دنیا کے مختلف قوموں اور ملکوں کے تمدنی اور معاشرتی حالات، بنی نوع انسان کی جد و جہد، کامیابیوں اور ناکامیوں اور آرزوؤں کا ذکر کرے گا، اس طرح نہیں کہ وہ غیر متعلق مباحث معلوم ہوں بلکہ اس طرح کہ وہ خاص مسئلہ جس کا مطالعہ طلبہ کر رہے ہیں انسانی تاریخ کے عظیم الشان سلسلے میں اپنے مناسب مقام پر نظر آئے - اس طرح اس کی تعلیم میں جان

پڑ جاتی ھے - وہ طلبہ میں ذوق اور انہماک پیدا کر دیتا ھے اور انہیں محسوس ھوتا ھے کہ علم چند درسی مضامین کا نام نہیں جن کو امتحان کی خاطر پڑھنا پڑتا ھے بلکہ زندگی کی ایک مربوط اور مسلسل تفسیر ھے جس سے انسان نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا ھے اور وہ خود بہت فائدہ اُٹھا سکتے ھیں - برخلاف اس کے جس استاد میں علم یا تخیل کی کمی ھوتی ھے یا یہ صلاحیت نہیں ھوتی کہ وہ مختلف قسم کے واقعات اور معلومات میں ربط پیدا کرے اور کسی ایک مسئلے پر مختلف سمتوں سے روشنی ڈال سکے اس کی تعلیم ھمیشہ بےلطف اور بےجان ھوتی ھے - طلبہ جو کچھ علم حاصل کرتے ھیں اس کو ان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں پیدا ھوتا - ھمیں اکثر ایسے استادوں سے سابقہ پڑتا ھے جو پڑھاتے وقت گویا گھوڑوں کی طرح آنکھوں پر اندھیری لگا لیتے ھیں یعنی اگر وہ کوئی ادبی کتاب پڑھا رھے ھیں تو اس کے دوران میں انہیں یہ خیال تک نہیں آئے گا کہ کسی تاریخی یا جغرافی واقعے کا حوالہ دیں جس سے ممکن ھے مضمون کی دلچسپی کئی گنی زیادہ ھو جائے - یا وہ جغرافیہ پڑھا رھے ھیں اور مثلاً کسی نئے ملک کا حال شروع کرنا چاھتے ھیں تو ان کے ذھن میں یہ بات نہ آئے گی کہ طلبہ میں اس ملک کی طرف سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ان کی عام واقفیت سے کام لیں یا کسی ایسے امر کی طرف اشارہ کریں جو جغرافیے کے رسمی مفہوم میں داخل نہ ھو - فرض کیجیے کوئی اُستاد مصر کا جغرافیہ اپنے طلبہ کو پڑھانا چاھتا ھے تو کیا وجہ ھے کہ وہ مصر کی قدیم تہذیب اور اس کی یادگاروں، مصر کے مشہور عالم اھرام اور ان جدید انکشافات اور دریافتوں

کا ذکر نہ کرے جن کا حال بہت سے یا کم سے کم بعض طلبہ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا ؟

انگلستان کے مشہور معلم اور ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں - اس نے اپنے مدرسے میں مضامین کی مصنوعی تقسیم بڑی حد تک مٹا دی تھی تاکہ طلبہ مختلف علوم کی باہمی وابستگی اور زندگی سے ان کے تعلق کو سمجھیں - جب وہ خود اسی مضمون پر گفتگو کرتا ' خواہ جماعت کے کمرے میں یا سائنس کے معمل میں یا گرجا گھر میں' تو اس کے خیالات کی رو میں سائنس ادب' فلسفہ' انسانی ارتقا کی تاریخ' اخلاقیات کے مسائل سبھی کچھ آجاتا تھا - تاریخ کی تفسیر میں وہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور اس کے نتائج سے بحث کرتا ' سائنس کی اہمیت سمجھانے کے لیے وہ تاریخ تمدن پر نظر ڈالتا اور ہر مضمون کا تعلق تمدنی زندگی کے وسیع تر مسائل اور مقاصد سے دکھاتا - اس طرح اس سے طلبہ ہر سبق کے بعد زندگی کے متعلق ایک زیادہ وسیع' زیادہ باریک نقطۂ نظر لے کر اُٹھتے اور یہ محسوس کرتے کہ انہوں نے جو کچھ اس گفتگو میں سیکھا ہے وہ ان کے حافظے پر بار نہیں ہے بلکہ ان کے خیالات اور ان کی زندگی میں گھل مل گیا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی دلچسپی کا دائرہ بہت بڑھ گیا ہے اور وہ اپنے درسی مضامین کا ربط پہلے سے بہتر سمجھ سکتے ہیں - یہی بات رگبی پبلک اسکول کے ہیڈ ماسٹر آرنلڈ (Arnold) کے تاریخی درس کے متعلق بیان کی جاتی ہے - اور یہ شان ہندوستان کے مشہور قدیم معلموں میں بھی پائی جاتی تھی

جن کا مطالعہ بہت وسیع اور متنوع ہوتا تھا اور جو اپنی زبردست علمیت اور اپنے شاگردوں کی شخصیت اور ان کے نظریۂ حیات کو متاثر کرتے تھے - لیکن اس زمانے میں جب زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم بھی قواعد اور ضوابط کی پابندیوں میں جکڑ دی گئی ہے اور معلم کی فنی تربیت کے لیے آٹھ نو مہینے کی قلیل مدت کافی سمجھی جاتی ہے یہ صفت استادوں میں بہت کمیاب ہے - ان کی ذہنی دلچسپیوں میں تنوع اور زندگی نہیں پائی جاتی اور وہ اپنے طلبہ میں بھی یہ بات پیدا نہیں کرسکتے - البتہ اب بھی وہ نامور علمی محققین جنھوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے ذریعے اپنے علوم میں انتہائی قابلیت حاصل کرلی ہے اور نہ صرف ان کے فنی پہلو پر حاوی ہیں بلکہ ان کے معاشرتی اور فلسفیانہ نتائج سے بھی واقف ہیں' یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ زندگی کا مطالعہ ایک مربوط اور منظم کل کی حیثیت سے کرسکیں - اس امر کو سمجھانے کے لیے اور زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں کہ عملی زندگی کی ضرورت اور انسان کی ذہنی ترقیات دونوں کے اعتبار سے درسی مضامین کی مصنوعی تقسیم بہت مضر ہے - مدرسے کی تعلیم ختم کرنے کے بعد لوگ جو کچھ علم حاصل کرتے ہیں وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے حاصل کرتے ہیں اور اس کے مختلف عناصر ایک دوسرے کے ساتھ پیوست اور مربوط ہوتے ہیں اور وہ اسی شکل میں اسے استعمال بھی کرتے ہیں - بچوں کے نصاب میں اس قسم کی تقسیم رائج کرنا اور بھی زیادہ قابل اعتراض ہے کیونکہ عام تجربے اور نفسیاتی تحقیقات دونوں کی تعلیم یہی ہے کہ کم

از کم ابتدائی چند سال میں بچوں کے ذہن میں نہ اس قسم کی تقسیم پائی جاتی ہے، نہ اس کو پیدا کرنے کا امکان ہے - اگر جبریہ تقسیم کو ان کے ذہن پر عائد کیا جائے تو ان کی قدرتی نشو و نما میں حرج واقع ہوگا - ان کے لیے زندگی ایک مسلسل اور لامتناہی تجربہ ہے جس کے تمام عناصر اور کیفیات ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کے لیے بہترین تشبیہ وہی ہے جو مشہور عالم نفسیات ولیم جیمز (William James) نے دی ہے - یعنی بچے کی شعوری زندگی کی مثال ایک بہتے ہوئے دریا کی سی ہے جس کے مختلف تجربات لہروں کی مانند ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جاسکتیں - وہ اپنے روزمرہ کے گوناگوں تجربات کو تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ریاضی، ادب وغیرہ کی اصطلاحوں میں تحویل نہیں کرتا - اس کے لیے مینہ کا برسنا اور زمین پر چھوٹے چھوٹے ندی نالے بہا دینا جن میں وہ کشتی چلا سکتا ہے، یا خود اس کا مٹی کے گھروندے بنانا یا اپنی ماں سے کہانیاں سننا سب ایک مسلسل زندگی کا حصہ ہیں جو تجربات سے پر ہے جن کے ذریعے وہ اپنے ماحول کی واقفیت حاصل کرتا ہے اور اس سے حتی‌الامکان کام لیتا ہے - اگر ہم ان تجربات کو قبل از وقت ایک دوسرے سے علحدہ کر کے مختلف باضابطہ مضامین میں تقسیم کرنا چاہیں اور مدرسے میں ہر گھنٹے بچوں کی توجہ اور دلچسپی کو ایک شغل سے دوسرے شغل کی طرف منتقل کرتے رہیں تو ان کی حقیقی اہمیت ضائع ہو جائے گی - بچوں کو وہ شوق اور انہماک نہ رہے گا جو اپنے آزاد اور پسندیدہ مشاغل

میں ہوتا ہے اور وہ مدرسے کا کام بےدلی کے ساتھ رسمی طریقے سے کرنے لگیں گے - لہذا مدارس جدید میں یہ التزام ہے کہ نصاب کی ترتیب و تدوین میں خصوصاً چھوٹے بچوں کے نصاب میں مضامین کی کوئی قطعی اور مصنوعی تقسیم نہ کی جائے بلکہ ان کے گرد و نواح کی زندگی اور ان کے پسندیدہ مشاغل اور تجربات کو مطالعے کا موضوع بنایا جائے اور اس مطالعے کو رفتہ رفتہ مرتب اور منظم کیا جائے - یہاں تک کہ انہیں خود بخود یہ خیال پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے مختلف قسم کے تجربات میں نظم و ترتیب قائم کریں تاکہ ان سے پوری طرح مستفید ہو سکیں - اس ضرورت کا احساس دلانے اور اسے پورا کرنے کے لیے استادوں کی مدد بہت مفید ہے لیکن ابتدا میں یہ خواہش خود طلبہ میں پیدا ہونی چاہیے - استاد کا کام یہ ہے کہ وہ ان کے مطالعے اور طریقۂ تحصیل کو بتدریج ایسے راستوں پر ڈالے کہ وہ ترتیب و تقسیم کے فائدے خود بخود محسوس کریں -

کسی قدر ترمیم کے ساتھ اسی اصول پر اونچے درجوں میں بھی عمل کیا جاتا ہے - ابتدائی درجوں میں تو مضامین کی مصنوعی تقسیم کو بالکل ہی مٹا دینا چاہیے - لیکن جب طالب علم اُونچی جماعتوں میں پہنچتا ہے جن کے نصاب میں مضامین کی تقسیم قدرتی طور پر قائم ہو جاتی ہے اس وقت بھی استاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نصاب کی ترتیب اور اپنی تعلیم کے طریقے میں ان کی باہمی وابستگی اور تعلق کو پیش نظر رکھے اور طلبہ کو بھی سمجھاتا رہے - اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے جاتے

ھیں - بعض ماھرین تعلیم نے اس طریقے کی تائید کی ھے
کہ ایک وقت میں صرف چند مضامین پر توجہ کی جائے'
ان کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کیا جائے - لیکن یہ مضامین
ایسے ھوں جن کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے
تعلق ھے - چنانچہ بلجیم کے مدرسۂ جدید کا بانی واسکونسلو
(Vasconcellos) اسی اصول پر زور دیتا ھے - اس کا خیال
ھے کہ اگر ایک وقت میں بچے کی توجہ بہت سے مضامین
میں منتشر رھے تو نہ صرف اس کی عام دماغی تربیت کو
نقصان پہنچے گا بلکہ تحصیل علم میں بھی رکاوٹ پیدا ھو گی -
کیونکہ وہ ایک ھی وقت میں بہت سے ایسے مضامین کا مطالعہ
کرے گا جن میں کوئی لازمی نفسی رابطہ نہیں اور اس وجہ
سے اس کا دماغ پریشان اور پراگندہ ھو جائے گا - اپنے مدرسے کے
نصاب سے بحث کرتے ھوئے وہ لکھتا ھے :-

''ایک ھی دن میں ریاضی' لکھنا پڑھنا' تاریخ'
جغرافیہ' طبیعیات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ممکن ھے ایک
جرأت آزما مہم کہی جا سکے لیکن اس کا (تعلیمی)
نتیجہ صفر ھوگا کیونکہ ان مضامین کے موضوع میں کوئی
ربط یا تعلق نہیں ھے -'' ۱

اس خرابی سے بچنے کی غرض سے اس نے اپنے مدرسے میں
یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ھر میقات (ٹرم) کے لیے چند ایسے
مضامین منتخب کر لیے جاتے تھے جو ایک حد تک
موسم سے مناسبت رکھتے تھے - مثلاً موسم گرما اور موسم

---

۱ A New School in Belgium—صفحہ ۷۷ -

بہار میں سائنس کے شعبے میں سے علم حیوانات اور علم نباتات کا مطالعہ کیا جاتا کیونکہ وہ زمانہ اس کے لیے مقابلتاً زیادہ مناسب ہے - طبیعیات اور کیمیا کی طرف اس زمانے میں کم توجہ کی جاتی تھی - بلکہ اُن پر جاڑے اور خزاں کے موسم میں زیادہ زور دیا جاتا تھا - اس تقسیم کی وجہ سے طالبہ منتخب شدہ مضامین کا مطالعہ زیادہ دلچسپی' گہرائی اور انہماک سے کرتے تھے - مگر یہ اصول صرف انتخاب مضامین ھی تک محدود نہ تھا بلکہ ھر مضمون کے مخصوص موضوع کا انتخاب بھی اسی اصول پر کیا جاتا تھا - ھر روز طالبہ یا تو کسی مضمون کی ایک خاص شاخ کا مطالعہ کرتے تھے یا کئی ایسی شاخوں کا جن سے ایک دوسرے کے مسائل اور مباحث پر روشنی پڑے - اسی طرح ھر موضوع کے مطالعے میں گہرائی پیدا ھو جاتی ھے اور اس پر مختلف پہلوؤں سے اچھی طرح غور کیا جا سکتا ھے - مثلاً کسی روز طالبہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ فرانسیسی زبان کے مطالعے میں صرف کرتے تھے - ان کو یہ مجبوری نہ تھی کہ ھر گھنٹے کے بجنے پر اپنے کام کو نامکمل چھوڑ کر اپنی توجہ کو دفعتاً ایک مضمون سے کسی بالکل مختلف مضمون کی طرف منتقل کریں جس سے نہ صرف وقت ضائع ھوتا ھے بلکہ ذھن منتشر ھو جاتا ھے - اس خیال سے کہ طبیعت کسی کام کو کرتے کرتے اُکتا نہ جائے وہ مضمون کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کرتے تھے - مثلاً اگر فرانسیسی کا دن ھے تو وہ اس زبان کی کتابیں پڑھتے' اس کی قواعد سیکھتے' اس میں مضمون لکھتے' گفتگو کرتے - اس طرح وہ جس مضمون یا موضوع کو

اُٹھاتے اس پر محنت، صبر اور استقلال کے ساتھ کام کرتے جہاں تک کہ اس کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا - سائنس کے مختلف شعبوں میں جہاں اکثر مسلسل اور طویل تجربات اور مشاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے یہ طریقہ خاص طور پر مفید ہے - کیونکہ اس کی وجہ سے طلبہ کو اتنا وقت اور فرصت مل جاتی ہے کہ وہ بغیر کسی کی مدد کے اپنے بل پر کام کریں اور اپنی غلطیوں کی تصحیح اپنی کوشش اور سمجھ سے کریں - اس اصول پر عمل کرنے سے ''خیالات میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور ہر مضمون کے مختلف شعبوں اور مظاہر کے باہمی تعلقات کے مطالعے کا موقع ملتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے علم کی وسعت بڑھتی ہے اور ہم مختلف مضامین کی معلومات کو باہم مربوط کر سکتے ہیں'' یہ طریقہ ''اجتماع مطالعہ'' کہلاتا ہے -

ہر مدرسے میں اس طریقے پر عمل کرنا مشکل ہے کیونکہ جب تک نصاب کی ترتیب و تنظیم قابل اُستادوں کے ہاتھ میں نہ ہو اور ان کو امتحانوں کی بندشوں سے ایک حد تک آزادی نہ حاصل ہو وہ نصاب کی تدوین اور طریقۂ تعلیم میں ترمیم اور اصلاح نہیں کر سکتے - لیکن مضامین میں ربط قائم کرنے کا ایک دوسرا طریقہ ایسا ہے جس پر ہمارے موجودہ مدارس میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے حالانکہ ان میں نئے تعلیمی تجربات کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں حائل ہیں - وہ طریقہ یہ ہے کہ مدرسے میں کوئی مضمون اس طرح نہ پڑھایا جائے گویا وہ بجائے خود ایک مکمل اور مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس کو سمجھنے یا اس سے پوری طرح

فائدہ اُٹھانے کے لیے کسی دوسرے مضمون سے مدد لینے کی ضرورت نہیں - نصاب میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جن کو اپنی نوعیت اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے صریحی تعلق ہے مثلاً جغرافیہ اور تاریخ جن کا مشترک موضوع انسان اور اس کی اجتماعی زندگی ہے اور دونوں اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اس پر روشنی ڈالتے ہیں - اس اشتراک موضوع کی وجہ سے ان دونوں مضامین میں ہر ہر قدم پر ربط پیدا کرنے کا امکان اور ضرورت ہے - تاریخ انسانی کا ارتقا اسی عالم آب و گل میں ہوا ہے جس میں بےشمار طبعی قوتیں کام کرتی ہیں جن کو سمجھنا اور سمجھانا جغرافیے کا کام ہے - جغرافیے کے مظاہر اور فطرت کی قوتیں انسان کی آزادی کو محدود بھی کرتی ہیں اور اس کو اس کے مقاصد کے حصول میں مدد بھی دیتی ہیں اس لیے ہم تاریخی واقعات کو اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک ان جغرافی حالات سے واقف نہ ہوں جنھوں نے ان پر اثر ڈالا ہے اور ان کی تشکیل میں حصہ لیا ہے - اسی طرح تاریخ کی حقیقی اھمیت اور اس کی روح کو سمجھنے کے لیے ادب کے مطالعے کی ضرورت ہے اس لیے کہ ادبی تصانیف میں ان انسانی آرزوؤں اور حوصلوں اور کوششوں کی تفسیر نظر آتی ہے جن کی عملی تعبیر تاریخ کے واقعات کے ذریعے ہوتی ہے - اِسی طرح سائنس اور ریاضی میں ادب، تاریخ، جغرافیہ اور دستکاری میں نفس مضمون کے اعتبار سے ربط قائم کرنے کے امکانات موجود ہیں جن سے اُستاد کو فائدہ اُٹھانا چاہیے - علاوہ بریں اس تحریک کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر مضمون کے نصاب میں بعض مناسب چیزیں دوسرے

مضامین سے شامل کی جائیں جن سے اس کے مطالب پر مختلف پہلوؤں سے روشنی پڑے اور وہ زیادہ مکمل طریقے پر طلبہ کی سمجھ میں آجائیں - سائنس کے مضامین کا نصاب بنانے میں اس طرح ایک دوسرے سے مدد لینا خاص طور پر ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ "بےجان' بےزبان اور بیکار" ہوکر رہ جاتے ہیں - جب ہم سائنس کے ذریعے مظاہر فطرت کی تفسیر کرنا یا اس کو تمدنی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کی کوئی ایک شاخ کافی نہیں ہوتی بلکہ مختلف شاخوں سے کام لینا پڑتا ہے - طبیعیات' کیمیا' حیاتیات وغیرہ کو نظری طور پر سمجھنے اور ان سے عملی طور پر کام لینے کے لیے ان کی باہمی وابستگی اور تعامل کا سمجھنا ضروری ہے ورنہ وہ اپنے ماحول کے مناظر اور مظاہر کی صحیح تفسیر نہ کر سکیں گی - اس کی تشریح واسکونسلو (Vasconcellos) نے ایک مثال سے کی ہے - وہ کہتا ہے کہ اگر علم حیوانات کے کسی سبق میں ہمیں سائنس کی آمد و رفت کو بیان کرنا ہو تو اس کی ضرورت پڑے گی کہ ہم کیمیا کی طرف رجوع کریں اور کاربن اور آکسیجن کے متعلق واقفیت حاصل کریں - اسی طرح اگر ہم انسان کے جسم کے ڈھانچے کی ساخت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ایک طرف طبیعیات سے مدد لے کر بیرم (Lever) کا اصول بتانا ہوگا جس کے بغیر ہڈیوں کی حرکت سمجھ میں نہیں آسکتی اور دوسری طرف کیمیا کی مدد سے ہڈیوں کی ماہیت پر روشنی ڈالنی پڑے گی - ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک علمی یا تمدنی مسئلے کو سمجھنے کے لیے بھی ہمیں مختلف علوم و فنون اور

تجربات سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک نصاب کی تدوین میں ہم اس بات کو پیش نظر نہیں رکھیں گے ہمارے لیے اپنے علم کی تنظیم اور اس کا استعمال بہت مشکل ہو جائے گا - نصاب کے مضامین کو صحیح معنوں میں مربوط کرنے کے لیے ان کی باہمی وابستگی کو ظاہر کرنے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نقطہ تلاش کیا جائے جو ان سب کا مرکز ہے اور ان میں سے ہر ایک کا تعلق اس کے ساتھ دکھایا جائے - وہ مرکز ظاہر ہے کہ نظام معاشرت اور بچوں کی فطرت کا اجتماعی رجحان ہے - تمام مضامین کی ترتیب میں ہمیں تعلیم کے معاشرتی اغراض اور تمدنی زندگی کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ہم طلبہ پر یہ بات واضح کرسکیں کہ ان کے اغراض اور ضروریات کے پورا کرنے میں یہ مضامین انہیں کس طرح مدد دے سکتے ہیں - امریکا میں اس تعلیمی تحریک نے مدرسوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم نصاب تعلیم اور ضبط و تادیب کے نظام وغیرہ کو مندرجۂ بالا مقصد کے مطابق مرتب کیا جائے - وہاں کے معلموں نے اس کے لیے ''مدرسوں کی تنظیم معاشری'' [1] کا نام تجویز کیا ہے - نصاب کے معاملے میں اس تحریک نے دو باتوں پر زور دیا ہے ایک تو یہ کہ تمام مضامین اور مشاغل ایسے ہوں جو طلبہ کے تمدنی احساس اور معلومات میں اضافہ کریں - دوسرے یہ کہ ان تمام امور کو نصاب سے خارج کر دیا جائے جو تمدنی زندگی سے کوئی مفید اور معقول تعلق نہیں رکھتے - جیسا ہم اوپر

1— "Socialization of Education"

بتا چکے ھیں - نصاب کی یہ تنقید اور محاسبہ اس لیے ضروری ھے کہ وہ اکثر ضروریات زمانہ کے ساتھ ھم آھنگ نہیں ھوتا اور اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے ترقی کی منزلوں میں تمدن کا ساتھ نہیں دیتا یعنی جو اقتصادی اور معاشرتی تبدیلیاں پیدا ھوتی ھیں ان کا لحاظ نہیں رکھتا - گزشتہ صدی میں سائنس اور قدیم علوم اور زبانوں میں جو جنگ جاری رھی اور اس زمانے میں نظری اور عملی تعلیم کے مطالبات میں جو کشمکش ھے وہ اسی وجہ سے ھے - ماھرین تعلیم کا فرض یہ ھے کہ ان چیزوں کو مقدم اور لازم سمجھیں جو معاشرے کی بقا اور ترقی کے لیے اھمیت رکھتی ھیں اور جو چیزیں محض نمائشی یا آرائشی ھیں ان کو ثانوی حیثیت دیں - مضامین نصاب کی اضافی قدر و قیمت کا مسئلہ در اصل تہذیب کے مفہوم سے تعلق رکھتا ھے جس کے متعلق ابھی تک خود معلموں اور تمدنی مفکروں کے خیالات واضح نہیں ھیں - کیونکہ ایک طرف موجودہ زندگی کے نئے مطالبات ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ھیں اور دوسری طرف تہذیب کا قدیم تصور جو مختلف حالات میں پیدا ھوا تھا ان کے ذھن پر مسلط ھے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) وغیرہ نے اس مسئلے پر بلکہ تعلیم کے تمام مسائل پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا ھے کہ ایک جمہوری معاشرے کے لیے کس قسم کی تعلیم اور کس قسم کے نصاب کی ضرورت ھے - ان کا خیال ھے کہ اس لحاظ سے نصاب میں ان مضامین اور مشاغل کو ترجیح اور اھمیت دینی چاھیے جن کا تعلق افراد اور معاشرے کے مشترک تجربات سے ھے یعنی وہ تجربات جن میں زیادہ سے زیادہ تعداد لوگوں کی شریک

ہوتی ہے - برخلاف اس کے جن علوم و فنون کا تعلق خاص جماعتوں یا مخصوص پیشوں کی ضروریات سے ہے اُن کی اہمیت مقابلتاً کم ہے - لہذا تعلیم کو اولاً عام انسانی ضروریات اور مقاصد کا خیال کرنا چاہیے اور اس کے بعد مخصوص پیشوں کے مشاغل کا - اسی وجہ سے بعض علوم و فنون مثلاً زراعت اور باغبانی کی اہمیت جبر و مقابلے سے دستکاری کی اہمیت ٹائپ نویسی سے کہیں زیادہ ہے - کیونکہ زراعت یا باغبانی یا دستکاری نہایت قدیم انسانی مشاغل ہیں جن کا تعلق تمدن کی تاریخ اور تشکیل سے بہت گہرا ہے اور جن میں ہر زمانے کے بیشتر افراد نے حصہ لیا ہے برخلاف اس کے جبر و مقابلے یا ٹائپ نویسی کی اہمیت بہت محدود ہے اور یہ صرف خاص خاص کاموں اور پیشوں کے لیے مفید ہیں - اگر اس طرح ہم تمام مضامین کو تعلیم کے مرکزی مقصد کے لحاظ سے دیکھیں تو ان میں یہ انتشار باقی نہیں رہے گا بلکہ خود بخود ربط قائم ہو جائے گا - اس تحریک کی تفصیل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کا ایک عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام درسی کتابوں کو از سر نو جدید اصول پر لکھنا پڑے گا - مغربی ممالک میں گزشتہ پچاس سال کے اندر درسی کتابوں میں بہت ترقی ہوئی ہے مختلف علوم کی درسیات کی تصنیف تجربہ‌کار اور قابل لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو نہ صرف ان علوم میں مہارت رکھتے ہیں بلکہ نفسیات اطفال سے بھی کم و بیش واقف ہیں - بعض مدرسوں میں جہاں ایک مستقل اور مقررہ نصاب طالبہ کی تعلیمی ترقی میں حارج سمجھا گیا ہے' معلموں

نے خود اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ہر مضمون کا نصاب تیار کیا ہے اور بجائے اس کے کہ ایک ہی نصاب ہر سال پڑھاتے رہیں وہ اپنے تجربے اور طلبہ کے ذہن اور عمل کے مطابق اس میں ترمیم اور تبدیلی کرتے رہتے ہیں - طریق ڈالٹن (Dalton Plan) کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ نصاب میں ترمیم اور تبدیلی میں گنجائش رکھنی چاہیے اور ہر مضمون کے معلم کو اپنے تجربے اور معلومات کے مطابق ہر ہفتے اور ہر مہینے کے کام کے لیے نصاب کے خاکے تیار کرنے چاہییں اور اگر وہ عملاً کامیاب ثابت نہ ہوں تو ان میں تبدیلی کرکے دیکھنا چاہیے کہ کیا نتیجہ ہوتا ہے -
اس طرح کے آزمائشی نصاب کی ایک بہت عمدہ مثال امریکا کی ریاست ونتکا (Winnetka) کے مدرسوں کی دی جا چکی ہے جہاں استاد خود ہر مضمون کا نصاب معاشری ضروریات اور طلبہ کے نفسی رجحانات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کرتے ہیں اور اس کو درسی کتابوں کی شکل میں چھپوانے کے بجائے ٹائپ کرا لیتے ہیں اور طلبہ میں تقسیم کر دیتے ہیں - اس ٹائپ میں لکھے ہوئے تعلیمی مواد کو ان کے مطالعے کا مرکز یا بنیاد سمجھنا چاہیے جس کے ذریعے وہ ہر موضوع کے متعلق ایک صحیح اور دلچسپ نقطۂ نظر قائم کرلیتے ہیں - اس کے بعد اپنی واقفیت کو بڑھانے اور علم میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لیے وہ مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن کا حوالہ ان کے اس نصاب میں موجود ہوتا ہے یا جن کو استاد تجویز کرتے ہیں - یا وہ خود اپنے شوق سے لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھتے ہیں - مگر ہمارے

مدارس میں جس قسم کی درسی کتابیں بالعموم رائج ہیں وہ تعلیمی ترقی اور تعلیمی اصلاح کے راستے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہیں - جب کبھی کسی نئے تعلیمی تجربے مثلاً طریق ڈالٹن کو رائج کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اُس کے خلاف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اول تو کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بہت ناقص اور نامناسب ہیں اور علاوہ اور بہت سی خرابیوں کے وہ اپنے موضوع کے معاشرتی پہلو کو نمایاں نہیں کرتیں - بیشک تاریخ، یا جغرافیہ یا سائنس کے معاشرتی پہلو کو واضح کرنے میں طریقۂ تعلیم و تحصیل کو بہت دخل ہے لیکن اگر درسی کتابیں اس طرح لکھی جائیں کہ ان علوم کی تمدنی قدر و قیمت پر روشنی پڑے تو معلم کے لیے تعلیم کی معاشرتی تنظیم آسان ہوجائے گی - مثال کے طور پر سائنس کو لیجیے مدرسوں میں سائنس کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں (اور بالعموم علاوہ استادوں کے پڑھائے ہوئے سبق کے طلبہ کا تمام دار و مدار ان میں سے کسی ایک پر ہوتا ہے) وہ ایسے خشک اور اصطلاحی انداز میں لکھی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن سائنس کے معاشرتی پہلو کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا - حالانکہ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس میں بےشمار امکانات موجود ہیں جن سے فائدہ اُٹھا کر ہم طلبہ کے معاشرتی احساس کو مستحکم کر سکتے ہیں مثلاً ہم مشہور سائنس دانوں کے سوانح حیات کو دلچسپ اور موثر طریقے پر پیش کرکے سائنس کے "انسانی" رخ پر روشنی ڈال سکتے ہیں - اس طرح طلبہ کے دل میں بتدریج یہ احساس مستحکم ہوجائے گا کہ سائنس کی ترقی اور تدوین

میں انسان کو مسلسل جد و جہد اور کاوش کرنی پڑی ہے اور اس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں بہت سے ملکوں اور قوموں کی متعدد کوشش کو دخل ہے۔ اگر سائنس داں ایک دوسرے سے بےتعلق ہوکر کام کرتے اور خود غرضی کی بنا پر اپنی اپنی تحقیقات کے نتائج کو ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھتے تو سائنس ہرگز اس قدر ترقی نہ کر سکتی جتنی اس نے اب تک کی ہے۔ سائنس اشتراک عمل کا یہ سبق بہت وضاحت اور خوبی کے ساتھ سکھاتی ہے بشرطیکہ معلم کو اس بات کا احساس ہو اور درسی کتابوں میں اس پر زور دیا جائے۔ لیکن کتنی درسی کتابیں ایسی ہیں جو اس شرط کو پورا کرتی ہیں؟ اسی طرح سائنس کے نصاب اور درسی کتب میں اس بات کی توضیح کی ضرورت ہے کہ موجودہ صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت، حفظان صحت، علاج امراض، غرض نظام معاشرت کی بیشتر آسائشوں اور سہولتوں کا دار و مدار سائنس پر ہے۔ طلبہ کو ہر ہر قدم پر ان کے ذہنی استعداد اور قابلیت کے مطابق یہ بتانا چاہیے کہ جو باتیں وہ سائنس کے نام سے پڑھ رہے ہیں وہ محض امتحان پاس کرنے یا معلومات کا ذخیرہ بڑھانے کے لیے مفید نہیں بلکہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی ہیں اور انہیں کی وساطت سے انسان نے اپنے ماحول کو مسخر کیا ہے۔

معاشرتی تنظیم کے اصول بعض مضامین میں بوجہ ان کی نوعیت کے، زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور بعض میں کم مثلاً تاریخ، جغرافیہ، سائنس، دستکاری وغیرہ میں ان

کو زیادہ دخل حاصل ہے - لیکن اس تحریک کا اثر کسی نہ کسی حد تک نصاب کے ہر شعبے پر پڑا ہے یہاں تک کہ ابتدائی تعلیم کے مروجہ "عناصر ثلاثہ" یعنی لکھنے پڑھنے اور حساب کی تعلیم میں بھی آج کل یہی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کو یہی دلچسپ اجتماعی مشاغل کے طور پر سکھایا جائے نہ بطور فنی مشقوں کے جو بچوں کو با دل ناخواستہ کرنا پڑتی ہیں - اس وجہ سے ریاضی کی جدید کتابوں میں سوالات، مشقوں اور وسائل کے لیے بچوں کی معاشرتی زندگی اور تجربات سے مواد حاصل کیا جاتا ہے - ان سے بعید از قیاس اور مہمل سوالات حل نہیں کرائے جاتے جن کی غرض سوا اس کے کچھ نہیں کہ بچے اس بہانے سے اعداد کے باہمی علاقوں کو سمجھیں - مثلاً جمع یا ضرب یا تقسیم سکھانے کے لیے چند بیلوں اور بکریوں کو چند مربع ایکڑ کے گھاس کے قطعے میں نہیں چھوڑا جاتا جہاں وہ مشین کی طرح ایک مقررہ رفتار سے مسلسل گھاس چرتے رہیں اور بیچارے بچوں کو یہ معلوم کرنا پڑے کہ کتنے دن میں وہ قطعہ بالکل صاف ہو جائے گا - اس کے بجائے وہ مسائل پیش کیے جاتے ہیں جو روزمرہ طلبہ کے تجربے اور مشاہدے میں آتے رہتے ہیں - انہیں آئے دن ایسی ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً وہ کسی دیہل کے میدان کی پیمائش کرنا چاہتے ہیں یا مدرسے میں سیونگ بنک کھولنا چاہتے ہیں یا انھیں اپنا گھر بار کا حساب رکھنا پڑتا ہے یا بازار سے سودا خریدنا پڑتا ہے - اس قسم کے معاملات میں ہر طرح کے حسابی قاعدوں اور اصولوں کو سمجھانے کے لیے بےشمار مواقع ہیں -

عقل‌مند معلم اور سمجھ دار مصنف کا فرض ہے کہ وہ تمام خلاف قیاس باتوں کو نظرانداز کر کے ایسے معاملات کی طرف توجہ کرے جن میں طلبہ کو فطرتاً دلچسپی ہے اور ان کے ذریعے سے انہیں حساب سکھائے - علیٰ ہذا القیاس مدرسۂ جدید میں لکھنا بطور ایک مخصوص فن کے نہیں سکھایا جاتا کہ طلبہ کو مدتوں حروف اور ان کے مرکبات کی مشق کرائی جائے جن کا مطلب یا منشا سمجھ میں نہیں آتا - بلکہ اس کے لیے اس فطری خواہش سے محرک کا کام لیا جاتا ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے سے مبادلۂ خیالات کرنے پر مجبور کرتی ہے - مثلاً ایک طالب علم اپنے کسی دوست یا عزیز کو خط لکھنا چاہتا ہے تاکہ اپنے مدرسے کے کھیلوں کا یا کسی اور دلچسپ شغل کا حال بیان کرے - لیکن وہ خط اُس وقت تک نہیں لکھ سکتا جب تک وہ حروف کی شکلوں سے واقف نہ ہو اور ان کو ملا کر الفاظ کے نقش بنانے کی مشق نہ کرے - جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس فن کی معاشرتی غرض اور فوائد کو سمجھ کر اسے سیکھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے - اسی طرح پڑھنے کو موجودہ طریقۂ تعلیم نے بجاے ایک ناگوار فرض کے ایک دلچسپ مشغلہ قرار دیا ہے جس کے ذریعے طالب علموں کو مل جل کر عالموں اور ادیبوں کے خیالات ا‌ر جذبات سے آگاہ ہونے اور لطف اٹھانے کا موقع ملتا ہے - اس لیے بچوں کے مطالعے کے لیے ایسا مواد فراہم کرنا چاہیے جو اعلیٰ درجے کی ادبی حیثیت رکھتا ہو اور اس سے تمدنی معاملات اور مشاغل پر روشنی پڑتی ہو - اور اس کو ایسے طریقوں سے پیش کرنا چاہیے جن میں امداد باہمی

اور اشتراک عمل کی گنجائش ہو - اس اصول کی تفصیل کے لیے ادب اور زبان کے تعلیمی طریقوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ایک دانش مند معلم کس طرح پڑھنے کو ایک اجتماعی اور دلچسپ شغل بنا سکتا ہے -

اس بحث کا خاتمہ ہم پروفیسر بوڈ (Bode) کی مندرجۂ ذیل عبارت پر کرتے ہیں جس میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ نصاب کے مضامین کی تعلیم کس نقطۂ نظر سے دینی چاہیے تاکہ وہ زندگی کے معاشرتی مقاصد میں معین ہوں :—

" (لوگوں میں) صحیح قسم کے خیالات اور مقاصد پیدا کرنے کے لیے ہمیں کسی اصول ہدایت یا معاشرتی نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے - اس بات کو مدنظر رکھ کر درسی مضامین پڑھانے میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے ؟ ہر مضمون کو پڑھانے کے دو مختلف طریقے ہوسکتے ہیں - ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اس کی تعلیم اس طرح دیں گویا وہ ایک مخصوص اور جداگانہ چیز ہے جو اور تمام چیزوں سے بےتعلق ہے - اس صورت میں ہمارا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اس خاص علم کے اندر جو معلومات، قواعد، اور قوانین ہیں ان کو استعمال کرنے میں طلبہ کو مہارت اور دسترس حاصل ہو جائے - اس قسم کی تربیت کے ذریعے ہم ماہرین خصوصی یا علمی کاری گر تیار کر سکتے ہیں، اور اگر طلبہ کی تربیت میں سختی کے ساتھ اس قاعدے کی پابندی کی جائے تو تعلیم محض کاری گری کے گروں کا مجموعہ ہو کر رہ جائے

گی - برخلاف اس کے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس بات
کو تسلیم کریں کہ نصاب کا ہر مضمون زندگی کے ساتھ
وابستہ ہے اور ہمارا مقصد یہ ہو کہ اس کا اور انسانی
تجربے کا وسیع تر تعلق ظاہر کریں کہ اس اصول کی
رو سے تعلیم کے فن کی نوعیت اور منشا بالکل مختلف
ہو جاتا ہے - اگر ریاضی کو محض اعداد کے مجرد علاقے
ظاہر کرنے کے لیے نہ پڑھایا جائے بلکہ اس کے ذریعے یہ
بات طلبہ کے ذہن نشین کی جائے کہ ریاضی کا عملی
معاملات سے کیا رشتہ ہے اور اس کا تعلق ان بڑی بڑی
علمی تحقیقات اور انکشافات سے کیا ہے جنھوں نے ہمارے
تصور عالم میں انقلاب پیدا کر دیا ہے، اگر ریاضی کی
تعلیم اس طرح پر دی جائے تو اس کی نوعیت محض
فنی اور صوری نہ رہے گی بلکہ طلبہ کو اس سے دلی تعلق
پیدا ہو جائے گا - جب طلبہ کے سامنے سائنس کو اس
طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ جد و جہد کے اس مسلسل
عمل کو سمجھ سکیں جس کے ذریعے انسان نے فطرت کو
مسخر کیا ہے اور توہمات، تعصب اور تنگ نظری کی
بندشوں سے رہائی پائی ہے تو وہ محض عالم فطرت کی
کہانی نہیں رہتی بلکہ ارتقائے انسانی کے زبردست ڈراما
کا قصہ سناتی ہے - جب تاریخ کے ذریعے یہ حقیقت
منکشف ہوتی ہے کہ انسانوں نے کن مقاصد کی خاطر
جنگیں کی ہیں اور جانیں دی ہیں اور وہ تمام پیچ در
پیچ اغراض و حالات کیا تھے جن کی بنیاد پر موجودہ
تمدن کی عمارت تعمیر ہوئی ہے تو وہ ماضی کے گزرے

مردے کی داستان نہیں رہتی بلکہ حال کے زندہ مسائل کی تفسیر بن جاتی ہے - ہمارے تمدن کے جو عناصر ہمارے نصاب کا موضوع بن گئے ہیں ان کو تخیل کے کرشمے سے اس طرح طالب علم کے ذاتی تجربے کا جزو بنایا جا سکتا ہے کہ وہ قابلیت اور سلیقے کے ساتھ ہر قسم کی انسانی ضروریات اور آرزوؤں کو سمجھ سکے - اور ان تمام چیزوں کی قدرشناسی کرے جو زندگی کو معنویت اور حسن کی دولت سے مالامال کرتی ہیں - جمہوری سوسائٹی میں تہذیب کا صحیح مفہوم یہی ہے - تعلیم کا جمہوری نصب العین یہ نہیں کہ ہر شخص کو کسی ایک کام کے قابل بنا دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ ہر شخص زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو جس کا ترجمہ سیاست کی اصطلاح میں یہ ہوگا کہ فرد کو زندگی، آزادی اور لطف و مسرت کا حق حاصل ہو" - ۱

مختصر یہ کہ نصاب کی تدوین اور درسی مضامین کی تنظیم و ربط کا مسئلہ تنگ اور اصطلاحی معنی میں تعلیمی مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعلق علوم کی ماہیت اور سوسائٹی کے تہذیب و تمدن اور فلسفۂ زندگی سے ہے - اس میں ہمیں مختلف تمدنی اور نفسیاتی مسائل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے - ایک طرف تو تمدن کی اہم ترین ضروریات کا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ کن مضامین اور علوم کا مطالعہ نئی نسل کے بچوں اور نوجوانوں کے لیے سب سے

۱- Modern Education Theories صفحہ ۲۴۱ -

زیادہ مفید ہے اور اس نقطۂ نظر سے مروجہ نصاب میں ترمیم اور تبدیل کرتے رہنا چاہیے - دوسری طرف فطرت اطفال کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم ان مضامین کو کس ترتیب اور اسلوب سے طلبہ کے سامنے پیش کریں کہ وہ ان کے روزمرہ کے تجربات کا جزو بن کر ان کی ذہنی تربیت میں معین ہوں - لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب معلموں کی تربیت میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ علوم کے باہمی تعلق کو پہچانیں اور ان سب کو انسانی زندگی کی تفسیر اور تشریح کا ذریعہ سمجھیں - نصاب خواہ کتنا ہی عمدہ ہو لیکن اگر معلم اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ ہر علم بجائے خود ایک مستقل چیز ہے جس کو نظری حیثیت سے حاصل کرنا طالب علم کا فرض ہے خواہ وہ اس کا مقصد اور مفہوم سمجھے یا نہ سمجھے' تو نہ درسی مضامین میں ربط قائم ہوگا نہ ان سے زندگی کے مسائل پر روشنی پڑے گی بلکہ تعلیم جیسی خشک اور بے جان ہے ویسی ہی رہے گی - یہ ظاہر ہے کہ مضامین نصاب کی اضافی قدر و قیمت کا انحصار ہر قوم اور ہر تمدن کے اپنے اپنے معیار اقدار پر ہے لیکن انسانی اغراض و مقاصد اور تمدن کی ضروریات بہت کچھ مشترک ہیں اور ہم نے اس باب میں جن علوم سے بحث کی ہے وہی ہر ملک میں نصاب کے اہم‌ترین عناصر سمجھے جاتے ہیں - لیکن اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ نصاب کے مسئلے کا کوئی دائمی حل نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ہر نسل اور ہر زمانے میں از سر نو حل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور تعلیم کے متعلق نظری بحث کرنے والوں

اور معلموں دونوں کا فرض ھے کہ وقتاً فوقتاً مدرسوں کے نصابوں پر تنقیدی نظر ڈال کر اس میں حسب ضرورت ترمیم کرتے رھیں -

---

باب پنجم

"تربیت جسمانی"

تعلیم جدید نے مدرسوں میں جو مختلف تبدیلیاں پیدا کی ہیں ان میں سے ایک نہایت اہم تبدیلی تربیت جسمانی کے نظریے کی ہے - اب یہ امر دوبارہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسان کی مکمل تربیت اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے جسم کی مناسب نگہداشت اور نشو و نما کا انتظام نہ کیا جائے اور اس کو ذہنی اور روحانی اعمال کے لیے ایک مستعد خادم اور مفید آلۂ کار نہ بنایا جائے - ہم نے "دوبارہ" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ تقریباً تمام ملک اور تمام تہذیبیں ایک ایسے دور سے گزر چکی ہیں جب جسم کی اہمیت پورے طور پر محسوس کی جاتی تھی اور اس کی پرداخت کا باقاعدہ انتظام ہوتا تھا - قدیم یونانی تعلیم میں تربیت جسمانی کو وہی اہمیت حاصل تھی جو عقلی اور اخلاقی تربیت کو - جمناسٹک (جسمانی ورزش) اور موسیقی یونانی نظام تعلیم کے دو اہم ترین عناصر شمار ہوتے تھے - یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک جسم کی مکمل اور

ہم آہنگ نشو و نما نہ ہوگی انسانی سیرت میں پختگی نہیں آ سکتی اور انسان اپنی قوتوں کو فعل میں نہیں لاسکتا۔ ارسطو کا یہ نظریہ تھا کہ انسان کی شخصیت ایک مکمل وحدت ہے جس کے دو پہلو ہیں، جسم اور 'دماغ' اور ان دونوں کی تربیت ہم آہنگ ہونی چاہیے ۔ اسی وجہ سے یونانیوں نے جسمانی تربیت کو بھی ایک فن لطیف بنا دیا تھا اور ان کی نظر میں ایک مریض یا کمزور، یا بےڈھنگے قسم کا آدمی بھی اتنا ہی ذلیل تھا جیسا ایک جاہل اور بےوقوف آدمی! قدیم روما میں بھی جسمانی تربیت کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی لیکن رومیوں کے یہاں، خاص ملکی حالات کی وجہ سے اس کا مقصد کچھ اور ہو گیا تھا یعنی وہ عام انسانی تربیت کا جزو نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ تندرست شہریوں کو کامیاب اور جنگجو سپاہی بنانے کا ذریعہ بن گئی تھی ۔ قدیم ہندو تہذیب میں ایک حد تک تربیت جسمانی کی ضرورت کا احساس موجود تھا چنانچہ چھتریوں کے لیے جسمانی اور فوجی ورزش لازمی قرار دی گئی تھی ۔ لیکن ان کے یہاں سوسائٹی مختلف طبقوں میں تقسیم تھی اور ہر ایک طبقے کے لیے جداگانہ تربیت تجویز کی گئی تھی یعنی برہمنوں کے لیے مذہبی اور ذہنی، چھتریوں کے لیے جسمانی اور فوجی تربیت، اور ویشوں کے لیے کاروباری ۔ اس نظام تعلیم میں اگر صریحاً نہیں تو ضمناً، جسم اور دماغ کا وہ تناقض تسلیم کیا گیا ہے جس کو موجودہ نظریۂ تعلیم نے مسترد کر دیا ہے ۔ قرون وسطیٰ میں، جب یورپ میں نظام جاگیرداری کا زور تھا تو وہاں بھی اسی قسم کی تقسیم رائج تھی ۔ ایک طرف

تو روحانی ریاضت کرنے والے راہبوں کی تعلیم تھی جس میں نہ صرف جسمانی تربیت کو نظر انداز کیا جاتا تھا بلکہ جسمانی خواہشات اور ضرورت کو بھی دبانے کی کوشش ہوتی تھی اور کم سے کم اصولاً پوری توجہ دماغی اور روحانی تربیت پر صرف کی جاتی تھی - دوسری طرف جنگجو سورماؤں کی تعلیم تھی جس میں ذہنی تربیت کو تقریباً بالکل نظرانداز کرکے سارا وقت جسمانی تربیت اور فوجی ورزشوں میں صرف ہوتا تھا - اسلامی تہذیب میں ابتدا ہی سے جسمانی تربیت کی اہمیت ایک مسلمہ امر سمجھی گئی - اول تو اسلام کی نشو و نما ایک ایسے مخالف ماحول میں ہوئی تھی کہ مسلمانوں کو شروع ہی سے اپنے بقاے حیات کے لیے جنگ و جدل کرنی پڑی جس کی خاطر ان کو فنون جنگ سے واقف ہونا اور اپنی جسمانی طاقت کو قائم رکھنا ضروری تھا - دوسرے مذہب کی حیثیت سے بھی اسلام روح اور جسم کے تضاد کا قائل نہیں بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کا معین اور شریک کار سمجھتا ہے - چنانچہ جب تک اسلامی تہذیب کے عروج کا زمانہ رہا، مسلمانوں نے کبھی جسمانی تربیت کو حقیر و ذلیل نہیں سمجھا - البتہ جب زوال کا دور آیا اور تعلیم تنگ خیال مذہبی گروہ کے ہاتھ میں آ گئی تو اس نے جسم اور روح کے قدیم تناقض کو دوبارہ زندہ کیا اور لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ انھیں جسم کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ نفسانی خواہشات کا گھر ہے اور روحانی ترقی کے راستے میں حارج ہے - لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں عہد مغلیہ کے آخر تک شرفا کے طبقے

میں بہت سی صحت افزا ورزشیں اور کھیل مروج تھے مثلاً کشتی، پھری گتکا، مگدر، شمشیر زنی اور نیزہ بازی - ان میں لوگ بہت خوشی کے ساتھ شریک ہوتے تھے، انھیں اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتے تھے - مگر جب تنزل انتہا کو پہنچ گیا تو درباریوں اور امرا اور ان کی دیکھا دیکھی عام لوگوں نے بھی ان مردانہ ورزشوں کو ترک کر کے مرغ بازی، بٹیر بازی، اور پتنگ بازی کو اپنا مشغلۂ تفریح بنا لیا - جس وقت مغربی تعلیم کا ہندوستان میں رواج ہوا ہے اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مذہبی جماعتوں اور علما نے تعلیم کو محض مذہبی علوم تک محدود کردیا تھا - اور جسمانی تربیت کی طرف سے نہ صرف بےپروا بلکہ اس کے مخالف تھے اور عام طور پر مردانہ ورزشوں اور کھیلوں کا رواج اٹھ چکا تھا اور اس قسم کا ''لہو و لعب'' رائج ہو گیا تھا جو صریحاً زوال پسندی کی علامت ہے اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی لوگوں کی بالخصوص شہر میں رہنے والوں کی صحت اور جسمانی حالت خراب ہونی شروع ہوئی اور اس کا کوئی بروقت تدارک نہیں ہوسکا -

مغربی ممالک میں بھی بعض حالات کی وجہ سے گزشتہ صدی میں یہی صورت پیش آئی تھی اور عام لوگوں کی جسمانی صحت بہت خراب ہونی شروع ہو گئی تھی - اگر اس خرابی کو دور کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار نہ کی جاتیں تو وہاں کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر ہوتی - ہمارے لیے ان حالات کا مطالعہ مفید ہے کیونکہ اس سے ہمارے اپنے مسائل پر روشنی پڑتی ہے - انگلستان میں مثل دوسرے

ممالک کے صنعت و حرفت کے لیے نظام نے عوام کی زندگی پر بہت انقلاب آفرین اثر ڈالا تھا ہم باب چہارم (حصۂ اول) میں بتا چکے ہیں - اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے وہ حالات بالکل بدل گئے ہیں جن میں مزدور پہلے کام کرتے تھے - زراعت اور کاشتکاری کو چھوڑ کر بیشتر لوگوں نے کارخانوں اور صنعت و حرفت کے بڑے بڑے مرکزوں میں کام کرنا شروع کردیا - صفائی اور آب و ہوا کے لحاظ سے ان کا یہ ماحول نہایت ہی مضر بلکہ مہلک تھا اور اس میں ان کی تندرستی کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی - بجائے کھلی ہوا اور فطرت کے صحت افزا ماحول میں کام کرنے کے وہ تمام دن اور بعض اوقات تمام رات تنگ و تاریک مکان اور کوٹھریوں میں بند رہتے تھے پھر کام کی نوعیت بھی ایسی تھی جو ان کی جسمانی صحت، ان کے اعصاب اور نظر بلکہ ان کی دماغی صحت کے لیے بھی مضر ثابت ہوتی تھی - اس پر طرہ یہ کہ عورتیں اور نوعمر بچے بھی اسی مصیبت میں گرفتار تھے اور اس طرح نئی نسلوں کی صحت خراب ہوتی جاتی تھی - اس انقلاب کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ لوگ بجائے دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہنے کے بڑے بڑے صنعتی علاقوں میں آ کر بس گئے اور وہاں آبادی کا اس قدر ہجوم ہوا کہ لوگوں کو رہنے کے لیے مناسب مکانات نہیں ملتے تھے - اس کا اثر عام صحت اور اخلاقی حالت پر بہت برا پڑا - بقول کرشن سٹائنر (Kershensteiner) کے :—

"اس زمانے کے شہروں میں ہزاروں، لاکھوں آدمی نہ صرف فطرت کی پر اسرار زندگی سے ناواقف اور بے تعلق

رہتے ہیں بلکہ ان کی جسمانی صحت اور طاقت اور اخلاقی قوت ضبط بھی زائل ہو جاتی ہے -" ۱

ابتدا میں لوگ صنعت و حرفت کے نئے کمالات اور مادی ترقی سے اس قدر مرعوب اور مسحور تھے کہ انہوں نے اس کے تباہکن نتائج کی مطلق پرواہ نہ کی لیکن رفتہ رفتہ اس کے مجموعی اثرات اس قدر بڑھے کہ لوگوں کو ادھر توجہ کرنی پڑی - خصوصاً جس زمانے میں فوجی حکام بوئروں کی جنگ کے لیے والنٹیر بھرتی کر رہے تھے انہیں یہ اندازہ ہوا کہ قوم کی صحت اور جسمانی طاقت بالکل تباہ ہوگئی ہے - ۲ اس صدی کے آغاز میں ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جس کا کام یہ تھا کہ وہ تربیت جسمانی کے مسئلے پر غور کرکے اپنی تجاویز پیش کرے - اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس امر پر زور دیا کہ قومی صحت اور قوت کے قیام کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ مدرسوں میں بچوں کی تربیت جسمانی کا مناسب انتظام کیا جائے اور یہ رائے دی کہ بچوں کے طبی معائنے اور علاج کا اہتمام نہایت ضروری ہے - طبی معائنے کا انتظام کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ انگلستان کے مدرسوں میں اب بہت سی وہ بیماریاں نہیں پائی جاتیں جو دماغی تربیت میں بہت عام تھیں اور ان کی جسمانی اور دماغی تربیت میں حائل ہوتی تھیں' مثلاً آنکھ کان ناک اور گلے کی بیماریاں - اول تو عام حالت کی درستی کی وجہ سے یہ بیماریاں

Schools and the Nation—۱

Mackenzie : Problems of National Education—۲

پیدا ہی کم ہوتی ہیں اور جب ہوتی بھی ہیں تو ان کی طرف فوراً توجہ کی جاتی ہے - لیکن تعلیمی حکام نے محض اس طبی اہتمام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حفظ ماتقدم کو علاج سے بہتر سمجھ کر اور بہت سے ایسے وسائل اختیار کیے جن کے ذریعے بچوں کی صحت بہتر ہوسکے اور ان کی جسمانی نشو و نما میں کوئی رکاوٹیں حائل نہ ہونے پائیں - چنانچہ رفتہ رفتہ نظام مدارس میں حفظان صحت کا اہتمام شامل کیا گیا - ملک میں جا بجا بچوں کے شفاخانے قائم کیے گئے، نادار طلبہ کی خوراک کا انتظام کیا گیا، کھیلوں اور ورزشوں کے لیے میدان مہیا کیے گئے، چھوٹے بچوں کے لیے تربیت گاہیں اور مریضوں کے لیے کھلی ہوا کے مدرسے قائم کیے گئے جن میں دستکاری ورزش اور صحت افزا مشاغل کو کتابی تعلیم کی نسبت بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے - ۱۹۱۸ع کے تعلیمی ایکٹ میں، جو فشر ایکٹ (Fisher Act) کے نام سے موسوم ہے اور جس کو انگلستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک معرکۃ الآرا حیثیت حاصل ہے، ان سب چیزوں کی ضرورت کو صراحت کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے اور اگرچہ مالی مشکلات کی وجہ سے تمام تجاویز پر فراخ دلی کے ساتھ عمل نہیں ہو سکا لیکن حکومت اور پبلک کی متفقہ کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ انگلستان کی نئی نسلوں کی صحت گزشتہ صدی کی نسبت کہیں بہتر ہو گئی ہے - اس کا ایک نہایت قطعی اور بین ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب ۱۹۲۵ع میں لندن کاونٹی کاؤنسل کی تحریک پر وہاں کے تمام ابتدائی مدارس کے طلبہ کا طبی معائنہ کیا گیا اور

ان کی جسمانی صحت یعنی وزن، قد، حواس خمسہ اور عام صحت کے متعلق اعداد و شمار فراہم کیے گئے تو معلوم ہوا کہ اوسطاً ہر لحاظ سے ۱۹۲۵ع میں طلبہ کی صحت ۱۹۱۴ع کے مقابلے میں بہتر ہے حالانکہ اس دس سال کے عرصے میں ملک، جنگ یورپ کے خوفناک دور سے بھی گزر چکا تھا جس میں بعض اوقات غریبوں کے بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا اور کھلی ہوا میں کھیلنا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ اس جسمانی ترقی کا سہرا صرف مدرسوں ہی کے سر نہیں، کیونکہ اس میں حکومت کے قوانین حفظ صحت کو اور کارخانوں وغیرہ کے ماحول کی درستی کو بھی بہت دخل ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ مدرسوں میں علمی اور اور فعالی تعلیم کے اثر سے، کھیلوں پر زور دینے اور بچوں کو کھلی ہوا میں رکھنے کی وجہ سے اور جسمانی امراض اور کمزوریوں کی مناسب نگہداشت اور روک تھام کی بدولت انگریزوں نے باوجود صنعت و حرفت کے ناساز ماحول کے اپنی قوم کی جسمانی حالت کو نہ صرف سنبھال لیا ہے بلکہ اس میں برابر ترقی ہو رہی ہے اور یہی حال کم و بیش دوسری مغربی قوموں اور جاپان کا ہے جنہوں نے جسمانی تربیت کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کے لیے مناسب تدبیریں اور ذرائع اختیار کیے ہیں - جرمنی میں جنگ یورپ کے بعد ہمارے دیکھتے دیکھتے اس خاص شعبے میں بڑا انقلاب ہو گیا ہے اور جرمنوں نے فوجی تعلیم کے بجائے جس کی انہیں ممانعت ہوگئی تھی، اپنے مدرسوں میں کھیل، ورزش، سیر و سفر اور کھلی ہوا میں رہائش کو اس قدر رواج دیا ہے کہ

باوجود تمام مشکلات کے بچوں کی صحت خراب نہیں ہونے پائی بلکہ باقاعدہ علاج اور صحت افزا مقامات میں رہنے کی بدولت ان بچوں کو جو جنگ کے زمانے میں مفلسی اور ناداری کی وجہ سے اپنی صحت اور تندرستی بالکل کھو چکے تھے، گویا نئی زندگی حاصل ہوگئی -

لیکن اسی زمانے میں جب دوسرے ملکوں میں برابر ترقی ہوتی رہی ہے - ہمارے ملک میں لوگوں کی صحت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے - اس کی طرف نہ تو پبلک نے کماحقہ توجہ کی ہے نہ حکومت نے - اور اسی وجہ سے اس شدید خطرے کے تدارک کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا - ہمارے سامنے کسی تعلیمی کمیشن کی تحقیقات کے نتائج اور اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن سے یہ بات ثابت کی جاسکے کہ قوم کی جسمانی حالت کیا ہے - لیکن تجربے اور مشاہدے کی شہادت اور باخبر اشخاص کی رائے اس بارے میں اس قدر واضح ہے کہ ہمیں اعداد و شمار کی ضرورت نہیں - اگرچہ ہمارے ملک میں ابھی تک صنعت و حرفت کے مضر نتائج اس حد تک ظاہر نہیں ہوئے جس حد تک مغرب میں ہوئے ہیں اور اب بھی ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ گاؤں اور دیہات میں رہتا ہے اور کاشتکاری وغیرہ میں مصروف ہے - لیکن قومی صحت کا زوال برابر جاری ہے - دیہاتوں کی صحت کی خرابی کی وجہ زیادہ‌تر ان کی جہالت اور ان کے طریقۂ بود و باش کی گندگی ہے جس کی بدولت ان میں آئے دن بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں اور بچوں کی صحت بالعموم خراب رہتی ہے - لیکن شہریوں اور بالعموم تعلیم یافتہ طبقے

کی خرابی صحت کی ذمہ داری مدرسوں پر بھی عائد ہوتی ہے - بالعموم جو طلبہ ہائی اسکول یا کالج سے فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں ان کی صحت بالکل خراب ہو جاتی ہے - زرد رنگ ' دھنسی ہوئی آنکھیں' وقت سے پہلے ضعیفی کے آثار ' بدن میں خون کی کمی' پست ہمتی' افسردہ دلی' محنت اور ہاتھ کا کام کرنے سے جی چرانا ' زندگی کے معرکوں میں شریک ہونے سے تامل' یہ تمام باتیں آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں - بنگال کے طلبہ کے متعلق سیڈلر کمیشن کو بھی شکایت تھی - جسمانی نشو و نما کے معطل ہو جانے سے قومی سیرت اور ذہانت پر جو تباہ کن اثر پڑا ہے اس کا پورا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ قوت برداشت ' اور قوت حیات جس کو برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) انسانی سیرت کا جزو لازم قرار دیتا ہے ہندوستانیوں میں بہت کم ہوگئی ہے اور ان میں صلاحیت باقی نہیں رہی کہ وہ بڑے بڑے کاموں کو ہمت اور حوصلے کے ساتھ کریں اور ان کے راستے میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی اور مستعدی کے ساتھ برداشت کریں - موجودہ زندگی جد و جہد اور جفا کشی کی طالب ہے اور اس میں کامیابی کے لئے اور حوصلہ اور استقلال شرط ہے - ان تمام صفات کی تربیت کا ایک اہم جزو جسمانی نشو و نما اور صحت ہے - اگر لوگوں کی صحت عام طور پر خراب ہوگی یا ان میں جسمانی طاقت نہ ہوگی تو وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور ان کے سامنے ہمت ہار دیں گے - ممکن ہے کوئی شخص اپنی قوت ارادی کو اس قدر مضبوط ' اپنے

عزم کو اس قدر راسخ بنائے کہ باوجود جسم کی کمزوری کے وہ اپنے مقاصد کی تحصیل میں لگا رہے - لیکن ایسا صرف خاص خاص اور مستثنیٰ صورتوں میں ہو سکتا ہے، عام لوگوں کے لیے جسمانی تربیت ناگریز ہے -

ہم نے تعلیم کا جو مفہوم اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کی رو سے معلم کو صرف بچوں کی دماغی نشو و نما ہی سے سروکار نہیں بلکہ اسے ان کی پوری شخصیت کی تربیت کرنی ہے جس میں جسم اور دماغ اور روح سب شامل ہیں کیونکہ ان سب کا ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعلق ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ انسان کی ہستی کے، جس میں وحدت کی کارفرمائی ہے، مختلف رخ یا پہلو ہیں - لہذا تربیت کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسان کے جسم کی تربیت الگ کی جائے اور اس کے دماغ کی الگ اور اس کی روحانی تسکین کے ذرائع علحدہ فراہم کیے جائیں - یہ تو گویا تین جداگانہ مسئلے ہو جائیں گے - تربیت کا مسئلہ ایک ہے اور اس کو علحدہ علحدہ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا - وہ مسئلہ یہ ہے کہ مدرسے میں اور معاشری دنیا میں ایسے انتظامات کیے جائیں کہ ایک ہی وقت میں بچے کے جسم اور دماغ اور روح کی تربیت ہو یا یوں کہنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک کی تربیت دوسروں کی تربیت میں معین ہو، رکاوٹ پیدا نہ کرے - اس وجہ سے معلم کے لیے جسم اور دماغ کے صحیح تعلق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ انسانی تربیت کے متعلق کوئی صحیح تصور یا نظریہ قائم نہیں کرسکتا اور نہ درسی مشاغل کی صحیح تنظیم

کر سکتا ہے - مدرسین اور ماہرین تعلیم دونوں نے عرصے تک اس تعلق کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ جسم ایک حد تک دماغی تربیت کے راستے میں حائل ہے - اس کا اثر مدرسے کی تعلیم پر بہت برا پڑا - اس کی وجہ سے نہ صرف جسمانی تربیت کی طرف سے غفلت برتی گئی بلکہ درسی اور دماغی تعلیم بھی بہت ناقص اور ناکامیاب رہی' کیونکہ انہوں نے علم حاصل کرنے کو محض ایک دماغی یا ذہنی فعل سمجھ لیا جس کا جسمانی افعال سے کوئی تعلق نہیں - وہ "علم" کو ایک خاص منطقی تربیت کے ساتھ کتابوں اور سبقوں کی شکل میں' طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے جو ان کے خیال میں کسی نا معلوم دماغی عمل کے ذریعے اس کو "حاصل" کر لیتے تھے - واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ اس "تحصیل" میں کسی طرح کامیاب بھی ہو جاتے تھے تو محض اس حد تک کہ وہ تمام معلومات کو ایک انفعالی طریقے پر اپنے حافظے میں جمع کر لیتے تھے - اس تحصیل کے دوران میں کوئی حقیقی "تجربات" حاصل نہیں ہوتے تھے جو ان کے افعال و کردار پر مستقل اثر ڈالیں - وہ جسمانی اعمال کی اہمیت کو نہیں پہچانتے تھے اور ان کو یہی خیال تھا کہ دماغ ایک مستقل اور قائم بالذات چیز ہے جو عقل اور علم کا گھر ہے اور اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں - اور جسم ایک مادی چیز ہے جو اکثر علم اور معرفت حاصل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے - اس خیال کا عملی اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ اُستاد ہمیشہ طلبہ کو تنبیہ کرتے رہتے کہ وہ مدرسے میں کوئی شور و غل نہ کریں' بلکہ آواز بھی نہ نکالیں -

بالکل خاموش اور بےحس و حرکت بیٹھے رہیں - یہاں تک کہ اُستاد کی صورت پر آنکھیں جمائے بت کی طرح خاموش بیٹھا رہنا توجہ اور انہماک کی علامت سمجھا جاتا تھا - لیکن یہ اصول تعلیم بچوں کے جبلی رجحانات کے بالکل خلاف ہے - کیونکہ جب بچہ مدرسے میں آتا ہے تو اپنا جسم اپنے ساتھ لاتا ہے اور اسے کام کرنے، نقل و حرکت کرنے، چیزوں کے توڑنے اور بنانے کی خواہش ہوتی ہے - لیکن مدرسوں کا معمول یہ چاہتا ہے کہ وہ بےحس و حرکت اپنی جگہ پر بیٹھا لکھتا پڑھتا رہے - اس لیے بچے کے نفس میں ہر وقت ایک کشمکش رہتی ہے - اس کی فطرت میں ولولۂ عمل اور اظہار خودی کی خواہش ہوتی ہے اور اُستاد یہ چاہتے ہیں کہ وہ اسے دبا کر رکھیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے مقررہ کام پر پوری توجہ نہیں کرتا - اس کا دماغ پریشان اور منتشر رہتا ہے اور اس میں انہماک کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی - یہ صورت حال سب بچوں کے لیے مضر ہے، کیونکہ جو ان میں سے فطرتاً زیادہ تیز اور چلبلے ہوتے ہیں وہ اکثر اس خلاف فطرت ضبط سے گھبرا کر موقع پاتے ہی اپنی خواہش عمل کا اظہار ایسی شرارتوں میں کرتے ہیں جن کی وجہ فرض شناس اُستادوں کی سمجھ میں نہیں آتی - رہے وہ بچے جن کی طبیعت مقابلتاً سکون پسند اور خاموش ہوتی ہے وہ اس جمود اور انفعالیت کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ان کا ولولۂ عمل ہی پژمردہ ہو جاتا ہے اور وہ کوئی ہاتھ کا کام یا جسمانی فعل اعتماد اور خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں کر سکتے - حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کا سرچشمہ نہ کتاب ہے، نہ درسی

اسباق، نہ مرتب علوم بلکہ وہ ذاتی اور فعالی تجربات ہیں جو ہم اپنی زندگی کے دوران میں حاصل کرتے ہیں اور جن میں جسم اور دماغ دونوں کی بیک وقت ضرورت ہوتی ہے۔ تجربے سے ہماری مراد ہے کوئی ایسا کام جس کا ہم پر ایک خاص اثر ہو اور ہم اس اثر کو قبول کریں اور اس کی وجہ سے ہمارے رویے اور اعمال میں کوئی ترمیم یا تبدیلی ہو جائے۔ اس کی وضاحت ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتی ہے۔ اگر کسی بچہ کی اُنگلی میں ایک کانٹا چبھ جاتا ہے تو اسے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ یہ تکلیف یا تکلیف دہ "تجربہ" اس کے علم اور عمل دونوں کو مستقل طور پر متاثر کرتا ہے۔ آئندہ جب کبھی وہ اس قسم کے کانٹے کو دیکھے گا تو اس کی جانب اس کا رویہ پہلے کی طرح بےپروائی کا نہ ہوگا بلکہ اس کی نظر میں کانٹے میں ایک نئی اہمیت اور نئے معنی پیدا ہو جائیں گے۔ اس طرح اسے جس قدر مختلف تجربات کانٹوں کے متعلق ہوں گے اسی قدر وہ ان کے خواص اور اثرات کو بہتر سمجھے گا اور اس کا یہ حقیقی علم اس کے رویے پر اثر ڈالے گا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ تجربہ بہترین معلم ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں اپنے افعال اور ان کے نتائج کا تعلق سمجھ میں آجاتا ہے۔ جب ہم کسی طرح اپنے ماحول پر کوئی عمل کرتے ہیں تو ماحول کی طرف سے ہم پر اس کا رد عمل ہوتا ہے جس کا نتیجہ ہمارے دماغ میں محفوظ رہتا ہے اور اس طرح ہم نئی باتیں اور نئے کام سیکھتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ تجربہ محض ذہنی یا دماغی چیز نہیں بلکہ جسم اور دماغ دونوں کو اس میں

برابر کا دخل ہے - یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے کہ تجربہ مثل ایک نقش کے ہے، جو خارجی ماحول ہمارے دماغ پر براہ راست، بغیر جسمانی افعال کے واسطے کے، ثبت کر دیتا ہے - تجربے کے لیے ہمیشہ یہ شرط ہے کہ ہم کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنے ماحول کی اشیا کے ذریعے کوئی کام کریں - اس عمل میں دماغ ہمارے جسمانی افعال کی رہنمائی کرتا ہے اس کو انجام دینے میں ہمیں ماحول کی مزاحمت اور اشیا کے قدرتی خواص سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کا رد عمل ہمارے جسم اور دماغ دونوں پر ہوتا ہے - اس رد عمل کا نام تجربہ ہے - اس کی مثال ایک بڑھئی کے کام سے مل سکتی ہے مثلاً وہ ایک کرسی تیار کرنے کے لیے لکڑی کاٹتا ہے، اس کو صاف کرتا ہے، اپنے اوزاروں کے ذریعے مناسب شکل کے ٹکڑے کاٹتا ہے، ان کو جوڑتا ہے اور اپنی تیار کی ہوئی کرسی کا مقابلہ کرسی کے ذہنی تصور یا نمونے کی کرسی کے ساتھ کر کے اس میں ترمیم یا تبدیلی کرتا ہے - اس تمام سلسلۂ افعال میں اسے مفید تجربات حاصل ہوتے ہیں جن کی تحصیل میں جسم اور دماغ دونوں شریک ہیں - اس طرح اس کو لکڑی کے خواص کا جو علم ہوتا ہے وہ بےجان اور بےکار نہیں ہوتا جس کو وہ استعمال نہ کر سکے بلکہ اس کے ذریعے وہ اوزاروں سے کام لینے میں زیادہ ماہر ہو جاتا ہے، آئندہ کرسیاں بنانے میں اسے زیادہ سہولت ہوتی ہے اور اس کی سمجھ میں اضافہ ہوتا ہے - کس قدر کمزور اور بےفیض ہے اس کے مقابلے میں وہ علم جو ایک بچہ مدرسے میں "اسباق اشیا" (Object lessons) کے ذریعے حاصل کرتا ہے !

لہذا ہم جسمانی تربیت کے متعلق کوئی ایسا نظریہ قائم نہیں کرسکتے جس کا تعلق محض جسم کی تربیت سے ہو بلکہ ہمیں قدیم یونانی عقیدے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کے مطابق جسم کی موزوں تربیت عقلی اور روحانی تربیت کے لیے لازم ہے - اس خیال کو حال کی تحقیقات سے بہت تقویت پہنچتی ہے اور نفسیات اور علم الاجسام دونوں کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نفسی اور جسمانی اعمال کا ایک دوسرے سے بہت قریبی اور گہرا تعلق ہے - اِس بحث کی تفصیل کی گنجایش نہیں - یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہے کہ نفسی اعمال کا انحصار بڑی حد تک جسم کے اُس حصے سے ہے جس کو دماغ کہتے ہیں اور یہ دماغ نظام اعصاب کے ذریعے باقی تمام جسم کی حرکات اور اعمال پر کچھ اس طرح حاوی ہے جس طرح بجلی گھر کا بٹن تختۂ شہر کی تمام روشنی پر حاوی ہوتا ہے - اگر نظام اعصاب کی مناسب اور موزوں تربیت نہ کی جائے گی تو دماغ جسمانی حرکات کی نگرانی بخوبی نہیں کر سکتا - دماغ کا کام یہ ہے کہ وہ جسمانی افعال اور اُن محرکات کے درمیان رابطہ قائم کرے جو حواس کے ذریعے ماحول سے حاصل ہوتے ہیں - مثلاً ہم سڑک پر جا رہے ہیں کہ سامنے سے ہمیں ایک موٹر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے - ہماری قوت باصرہ موٹر کی شکل کو جو ماحول کا ایک جزو ہے محرک عمل بنا کر نظام اعصاب کے ذریعے دماغ تک پہنچاتی ہے - وہاں سے دماغ ہمارے اعضا کو (اس خاص موقع پر پیروں کو) یہ حکم بھیجتا ہے کہ وہ ہمیں موٹر کے راستے سے ہٹا کر ایک طرف کر دیں - اگر جسم

اور ذہن کے درمیان دماغ کا واسطہ نہ ہوتا تو ہمارے افعال و اعمال اور ماحول کے درمیان وہ تعلق ہرگز قائم نہ ہو سکتا جس کی وجہ سے ایک طرف ہم ماحول پر قابو حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے افعال کو منظم کرتے ہیں - اس کی توضیح کسی دستکاری کے ذریعے ہوسکتی ہے - فرض کیجیے ایک طالب علم کسی لکڑی کے ٹکڑے کا ایک قلمدان بنانا چاہتا ہے - وہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے پہلے لکڑی کاٹتا ہے - اس کو چھیل کر ہموار کرتا ہے، پھر مختلف شکلوں اور لمبائی کے ٹکڑے کاٹ کر ان کو جوڑتا ہے - اس شغل کے دوران میں دماغ برابر افعال و حرکات کے درمیان "واسطے" کا کام دیتا ہے - ہر ہر قدم پر حواس کے مشاہدات اور تاثرات کی مدد سے وہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ اب لکڑی کس حالت میں ہے اور اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے - اس علم کی بنا پر وہ آگے بڑھتا ہے اور مختلف اوزاروں کو استعمال کر کے لکڑی کی شکل بدلتا ہے - ساتھ ہی وہ اپنے افعال سے لکڑی میں جو تبدیلیاں کرتا ہے ان کی وجہ سے حواس کے مشاہدات بھی بدلتے جاتے ہیں - پہلے لکڑی کھردری تھی، اب ہموار ہوگئی - پہلے ٹکڑا لمبا تھا اب گول ہو گیا ہے وغیرہ - ان نئے مشاہدات کے مطابق وہ آگے بڑھتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے افعال میں تسلسل قائم رکھنا اور ان میں حالات کے مطابق تبدیلی کرنا دماغ کا کام ہے جس کو وہ اسی صورت میں انجام دے سکتا ہے جب ایک طرف نظام اعصاب کی صحیح تربیت کی جائے - کیوں کہ اسی کے ذریعے ماحول کی خبریں حواس کی وساطت سے

دماغ تک اور دماغ کے احکام اعضاے جسمانی تک پہنچتے ہیں' اور دوسری طرف دماغ کو ایسے مواقع ملتے رہیں کہ وہ جسمانی افعال کی نگرانی اور نگہداشت کر سکے - جو لوگ بچپن اور نوجوانی میں کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے' کسی قسم کی دستکاری یا عملی مشاغل میں شریک نہیں ہوتے وہ بڑے ہوکر نہ صرف جسمانی حیثیت سے " بے دست و پا " ہو کر رہ جاتے ہیں بلکہ اکثر عملی معاملات اور کار و بار میں جو دنیاوی زندگی کا جزو اعظم ہیں' ان کا دماغ بھی اچھی طرح کام نہیں دیتا خواہ وہ کتنے ہی عالم اور پڑھے لکھے کیوں نہ ہوں - اس وجہ سے زمانۂ حال کے تعلیمی مفکرین " علم " اور " عمل " جسم اور دماغ جاننے اور کرنے کے باہمی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں اور مدرسوں کی تعلیم میں ایسے مشاغل کو نمایاں اہمیت دیتے ہیں جن میں جسم اور دماغ کی نشو و نما ساتھ ساتھ اور ہمآہنگ طریقے سے ہو سکے -

تربیت جسمانی کے وسیع تر مفہوم میں انسانی حواس کی تربیت بھی شامل ہے اور جیسا ہم اوپر بتا چکے ہیں حواس کی صحیح تربیت کے بغیر دماغی تربیت ناقص رہ جاتی ہے - ہمارے مروجہ مدارس میں بھی' باوجود اس بات کے کہ تعلیم بالکل انفعالی طریقے پر دی جاتی ہے' طلبہ کو اپنے حواس سے کام لینا پڑتا ہے مثلاً معمولی درسی کاموں میں آنکھ اور کان دونوں ہر وقت کام آتے ہیں اور لکھنے میں ڈرائنگ اور نقشہ کشی میں' دستکاری میں ہاتھ کو استعمال کرنا پڑتا ہے - لیکن مدرسے کا کام جن اصولوں پر منتظم ہے ان کی وجہ سے ان

حواس کی تربیت بھی مناسب طریقے پر نہیں ہوتی کیونکہ طلبہ ان کو اپنے پسند کیے ہوئے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنے دماغ کی نگرانی اور ہدایت میں استعمال نہیں کرتے - استاد اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مختلف حواس گویا علم کو دماغ تک پہنچانے کی نالیاں ہیں - علم کتاب میں موجود ہے اور آنکھ کے ذریعے طالب علم کے دماغ میں پہنچ جاتا ہے - یا وہ الفاظ میں پوشیدہ ہے اور کان کے ذریعے ان کے ذہن میں سرایت کر جاتا ہے ہم نے علم کا جو مفہوم اس کتاب میں پیش کیا ہے وہ اس خیال کے بالکل خلاف - علم اس طریقے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا جس طرح کوئی پیاسا آدمی نل کی ٹوٹی کھول کر اس میں جمع کیا ہوا پانی پی لیتا ہے - بلکہ اس کو اپنے جسم اور دماغ کی محنت اور کاوش کے ذریعے زمین سے کھود کر نکالنا پڑتا ہے - کبیر نے اپنے ایک دوہے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے جو سارے اصول تعلیم کا نچوڑ ہے :—

پد جوڑے، ساکھی کہے سادھن پڑی گئی آوس

کاڑھا جل پیوے نہیں، کاڑھ پین کی ہوس

(پد جوڑتا ہے، ساکھی کہتا ہے، اس کی عادت پڑ گئی ہے، بھرا ہوا پانی نہیں پیتا، بھر کر پینے کی ہوس ہے)

حواس علم کو ماحول سے دماغ تک اور دماغ سے ماحول تک لے جانے کا بنا بنایا ذریعہ نہیں ہے تحصیل علم اور تربیت حواس دونوں کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ طالب علم کسی با معنی اور دلچسپ شغل میں حصہ لے - بچہ اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال میں جو مفید اور پائدار علم

حاصل کرتا ہے وہ محض دوسروں کی باتیں سن کر یا ان کے کام دیکھ کر نہیں سیکھتا بلکہ وہ اپنے گرد و پیش کے دلچسپ اور گوناگوں مشاغل میں حصہ لیتا ہے' ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے' ضرورت کے مطابق اپنے حواس کے ذریعے مشاہدات اور معلومات جمع کرتا ہے' اپنی دماغی استعداد کے بموجب فکر اور عقل سے کام لیتا ہے' اپنی غلطیوں اور تجربوں سے سبق سیکھ کر اپنے طریقۂ عقل کی اصلاح کرتا ہے - اس طرح وہ جن مقاصد یا ضروریات کو پورا کرنا چاہتا ہے ان کے لیے اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام حواس و اعضا اور دماغ مل جل کر کام کرتے ہیں اور وہ نہ صرف ان مخصوص مقاصد کو حاصل کرتا ہے بلکہ اس کی عام دماغی اور جسمانی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے - اگر مدرسے میں بھی یہی تعلیمی اصول اختیار کیا جائے جس پر بچے اپنی جبلت کے تقاضے سے عمل‌پیرا ہوتے ہیں تو اس کی تعلیم اس طرح مصنوعی اور بےجان نہ رہے جیسی آج کل ہے - لیکن بد قسمتی سے معلموں نے طلبہ کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جس میں باہم کوئی ربط نہیں - ان کے نزدیک کچھ کام تو ایسے ہیں جن میں محض حواس و اعضا بالخصوص ہاتھ اور کان اور آنکھوں کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً لکھنا یا ڈرائنگ یا بڑھئی کا کام - ان کے لیے کچھ ایسی مشقیں مقرر کردی گئی ہیں جن کو طلبہ بغیر کسی دلچسپی کے اور بغیر ان کا مقصد سمجھے دھراتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُن خاص حرکات کو بطور ایک معمول کے سیکھ لیتے ہیں جن کی مثلاً لکھنے وغیرہ کے لیے ضرورت ہوتی ہے - باقی کاموں میں "دماغ" کی ضرورت پڑتی ہے جن کو ان معلموں کے خیال میں

جسمانی اعضا اور ان کی حرکات سے کوئی تعلق نہیں - ادب، جغرافیہ، تاریخ اور سائنس وغیرہ کا مطالعہ اس حصے میں شامل کیا جاتا ہے اور مطالعے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ طلبہ کتابوں کو پڑھیں، اُستاد کا لکچر سنیں اور اس طرح یہ "علوم" براہ راست ان کے دماغ میں منتقل ہو جائیں - اس تعلیمی پروگرام کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ زندگی کی عملی کشمکش میں بےبس رہتے ہیں اور اپنے جسم و دماغ کی قوتوں کو اپنے عملی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال نہیں کر سکتے - اس حالت کی اصلاح کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ مدرسے میں ایسے تعلیمی وسائل مہیا کیے جائیں جو طلبہ کی جسمانی اور دماغی قوتوں کو بیک وقت دعوت عمل دیں اور ان کو ایسے مشاغل میں لگائیں جو ان کی خصوصیات جبلی مثلاً تجسس، خواہش تعمیر و تخلیق اور اشتراک عمل کو اظہار کا موقع دیں کیونکہ ان کی تسکین کے لیے بچوں کو عملی کام کرنے پڑتے ہیں جن میں ہاتھ اور دماغ کے درمیان ایک مستقل رشتہ قائم ہو جاتا ہے اس کی تفصیل ہم تعلیمی مشاغل کی بحث میں کر چکے ہیں - یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جسم اور دماغ کی تربیت ایک دوسرے سے بےتعلق رہ کر نہیں ہو سکتی - جسم کو دماغ کا آلۂکار سمجھنا چاہیے جس کی وساطت سے وہ مادی دنیا کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کرتا ہے اور اس کو اپنے قابو میں لاتا ہے - حواس خمسہ اور اعضائے جسمانی کا یہ کام ہے کہ وہ انسانی تجربے کے ارتقاء کی رہنمائی کریں اور اس کے اعمال اور مقاصد میں مطابقت پیدا کریں - مدارس جدید میں سائنس، عملی کام اور دستکاری

کو اسی وجہ سے بہت سایاں اہمیت دی گئی ہے کہ ان میں جسم و دماغ کے اتحاد عمل کا امکان بہت زیادہ ہے اور باقی تمام مضامین کی تعلیم میں بھی مختلف قسم کے کاموں کو جو بچے کے اظہار خودی میں مدد دیتے ہیں مثلاً نقشہ کشی، ڈرائنگ، تحریری مشقوں وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے -

ہندوستان میں تربیت جسمانی کا مکمل اہتمام کرنے کے لیے والدین، استادوں، حکومت اور تعلیمی حکام کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے اور جب تک وہ سب ایک مفید مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس عظیم‌الشان تعمیری تحریک میں حصہ نہ لیں گے کامیابی ممکن نہیں کیونکہ موجودہ صورت حال ان سب کی غفلت اور بےتوجہی کا نتیجہ ہے - طلبہ کی بیشتر تعداد ایسے مفلس اور نادار گھروں سے آتی ہے جہاں نہ انہیں مناسب غذا ملتی ہے، نہ ان کے آرام و تفریح کا انتظام ہے، نہ اصول حفظان صحت کی پابندی ہوتی ہے - لیکن اس کی وجہ محض افلاس نہیں، جہالت اور عدم احساس بھی ہے ورنہ غریبوں کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے مکانوں کو ایک حد تک صاف رکھیں اور مقابلتاً زیادہ مقوی اور زود ہضم غذائیں استعمال کریں - اس صورت حال کے پیدا کرنے میں حکومت کی ذمہ‌داری یہ ہے کہ اس نے وہ تدابیر اور وسائل اختیار نہیں کیے جو دوسرے ملکوں میں صحت عامہ کے تحفظ کے لیے استعمال کیے گئے ہیں یعنی لوگوں کی تفریح اور بچوں کے کھیلنے کے لیے پارک اور میدان بنانا، شہروں اور گاؤں کی صفائی کے لیے اہتمام اور پرچار کرنا، بیماریوں کے انسداد کے لیے تدابیر سوچنا - ان فرائض کی ذمہ‌داری مرکزی حکومت

سے زیادہ مقامی حکام اور بلدے پر عائد ہوتی ہے - اسی لیے ہم نے یہاں حکومت کے لفظ کو اس کے عموسی معنی میں استعمال کیا ہے جس میں یہ سب جماعتیں شامل ہیں - ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ان جماعتوں نے اس کام کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں کی - توجہ ضرور کی ہے اور کہیں کہیں ان باتوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے لیکن کسی بڑے پیمانے پر کوئی ایسی تحریک نہیں اُٹھائی گئی جو اتنے بڑے ملک کے شایاں شان ہوتی جس میں حکومت اور جمہور دونوں متفق ہوکر اس زبردست مسئلے کو بحیثیت مجموعی حل کرنے کی کوشش کرتے - تعلیمی حکام اور معلموں نے مدرسے کے امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا - ایک تو انھوں نے نصاب تعلیم کو اس قدر مجرد اور نظری بنادیا ہے کہ جیسا ہم نے اوپر بتایا ہے بچوں کو وہاں اپنی جسمانی نشو و نما کا موقع نہیں ملتا - اس میں عملی اور تخلیقی مشاغل کی بہت کمی ہے اور دستکاری، جس کے بہت سے تعلیمی فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اُن کو صحت افزا کام میں لگاتی ہے، اس میں بطور ایک اہم عنصر کے شامل نہیں ہے - دوسرے اکثر مدرسوں میں کھیلوں اور ورزشوں کا کوئی مناسب اہتمام نہیں ہے اور باوجود اس تاکید کے جو آج کل کھیلوں کے متعلق کی جاتی ہے واقعہ یہ ہے کہ بہت سے مدرسوں میں طلبہ باقاعدگی کے ساتھ کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے - صرف چند طلبہ جو اچھے کھلاڑی ہوتے ہیں وہ نمائشی اغراض کے لیے کھیلتے ہیں باقی سب کھڑے تالیاں بجاتے ہیں، یا گپ شپ میں وقت ضائع کرتے ہیں - پھر محکمۂ تعلیم کی طرف سے طبی معائنہ غریب بچوں کی

خوراک، سیر و سیاحت وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہیں، غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ یہ تمام باتیں ہندوستان جیسے مفلس ملک کے لیے اسراف میں داخل ہیں، گو مغربی ممالک میں یہ نظام تعلیم کا جزو بن گئی ہیں - سچ پوچھیے تو اس قسم کی تعمیری اور اصلاحی کوششوں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت انہیں ممالک میں ہوتی ہے جو افلاس اور جہالت اور امراض کا شکار ہیں اور ان کے لیے یہ تعمیری کام ہرگز فضول خرچی میں شامل نہیں - لہذا جسمانی تربیت کا مسئلہ ایک وسیع مسئلہ ہے جس کے بہت سے پہلو ہیں - اس کے لیے طلبہ کی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عام معاشری بود و باش کی اصلاح درکار ہے - لوگوں کے ماحول کو زیادہ صحت افزا بنانے کی ضرورت ہے یعنی گاؤں اور قصبوں میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام کرنے کی اور بڑے شہروں میں علاوہ صفائی کے اہل شہر کے لیے تازہ اور کھلی ہوا مہیا کرنے کی ضرورت ہے جہاں وہ اپنی تنگ و تاریک گلیوں اور گھروں سے نکل کر تفریح کرسکیں اور بچوں کو کھیلنے کودنے بھاگنے دوڑنے کے لیے جگہ ملے - مدرسوں کی تعلیم میں عملی اور فعلی عنصر کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے جسم و دماغ دونوں سے کام کرنا سیکھیں اور دستکاریوں کے ذریعے ان کے ہاتھ کی تربیت ہو - جو تعلیم حاصل کرنے کا ایک نہایت اہم ذریعہ ہے - طلبہ کے لیے کھیل اور ورزش کا بھی مناسب انتظام ہونا چاہیے تاکہ عمر کے اس نازک زمانے میں ان کی جسمانی نشو و نما معطل نہ ہونے پائے - درسی زندگی کے دوران میں دو منزلیں ایسی آتی ہیں جب طلبہ کی نشو و نما خاص طور پر تیز

ہوجاتی ہے - ایک وہ زمانہ جب وہ شیرخوارگی سے لڑکپن میں داخل ہوتا ہے اور اس کی عمر چھ یا سات سال کی ہوتی ہے اور دوسرا جب وہ لڑکپن کے زمانے سے گزر کر بلوغ کی منزل میں قدم رکھتا ہے - ان دونوں زمانوں میں اس کی طبیعت کا توازن ڈانواں ڈول ہوجاتا ہے - کیونکہ اس کی زیادہ‌تر قوت جسم کی نشو و نما میں صرف ہوتی ہے اور وہ اپنے تعلیمی مشاغل کی طرف پوری توجہ نہیں کرسکتا - اس وقت فطرت شناس معلم کا فرض ہے کہ وہ اس نفسی ارتقاء کے عمل کو پہچانے اور درسی کاموں پر زیادہ زور نہ دے - اکثر اوقات ہندوستانی طلبہ کی صحت اس وجہ سے بہت خراب ہوجاتی ہے کہ اس خاص زمانے میں جب جسمانی ورزشوں کھیلوں اور کھلی ہوا کی ضرورت ہوتی ہے وہ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے لیے حد سے زیادہ دماغی محنت کرتے ہیں جس سے ان کی جسمانی نشو و نما رک جاتی ہے اور ان کو بسا اوقات اعصابی امراض لاحق ہوجاتے ہیں - تعلیمی حکام کا یہ فرض ہے کہ وہ علاوہ مندرجہ بالا تدابیر اختیار کرنے کے جن کا تعلق صحت کے قائم رکھنے سے ہے طبی معائنہ اور علاج کا معقول انتظام کریں اور وقتاً فوقتاً یہ معلوم کرائیں کہ کس قدر طلبہ آنکھ کان' ناک اور حلق وغیرہ کے امراض میں مبتلا ہیں - والدین اور استادوں کو ان بیماریوں کے علاج میں متفقہ کوشش کرنی چاہیے کیونکہ یہ نہ صرف جسمانی صحت کی بیخ کنی کرتی ہیں بلکہ طلبہ کی تعلیمی ترقی میں بھی حارج ہوتی ہیں - اس بحث کو ہم ایک ایسے مدرسے کے ذکر پر ختم کرتے ہیں جہاں بغیر حکام یا پبلک کی کسی خاص امداد کے ایک دھن کے پکے معلم

نے اپنے قائم کیے ہوئے مدرسے کو ایک ایسے ماحول میں تبدیل کر دیا تھا جہاں تربیت جسمانی کے لیے بہترین ذرائع اور وسائل مہیا کیے گئے تھے - بیرجس (Bierges) کا یہ مدرسہ جس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کرچکے ہیں بلجیم کے ایک معلم واسکونسلو (Vasconcellos) نے قائم کیا تھا - یہ شہروں کے شور و غل اور کشمکش سے دور ایک دیہاتی علاقے میں واقع تھا جہاں طلبہ کو فطرت کے گوناگوں مناظر سے لطف اندوز ہونے اور ان کے سکون بخش اثرات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا تھا - لیکن باوجود اس تنہائی کے وہ صنعتی زندگی اور شہروں کے کاروبار سے ناواقف نہ تھے کیونکہ ان کے استاد انہیں اکثر گرد و نواح کے کارخانوں اور صنعت و حرفت کے مرکزوں میں لے جاتے تھے جہاں وہ براہ راست مزدوروں کی زندگی اور تقسیم عمل کا مطالعہ کرتے تھے - مدرسے کے نصاب میں ان مشاغل کو بہت اہمیت دی جاتی تھی جن میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے اور وہاں بھی دیگر مدارس جدید کی طرح عملی سائنس کے لیے معمل' لوہاری اور نجاری کے لیے کارگاہیں' جلد سازی' ڈرائنگ اور مجسمہ‌سازی اور آرٹ کے لیے کمرے موجود تھے - پرندوں' مچھلیوں اور بہت سے مفید پالتو جانوروں کی رہائش کا انتظام تھا - مدرسے کی عمارت کے چاروں طرف جنگل اور باغات تھے - اور کاشت کے لیے زمین چھوٹی ہوئی تھی جس میں طلبہ باغبانی کرتے' ترکاریاں بوتے' اور انہیں اپنے باورچی خانے میں استعمال کرتے تھے - پھر کیا عجب ہے کہ اس مسرت بخش اور صحت افزا ماحول میں رہ کر' جہاں ان کو محض کتابوں کے مطالعے میں دیدہ‌ریزی کرنے

کے بجائے عملی کاموں کے مواقع نصیب تھے، ان کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑتا تھا اور اُن کی صحت اور تندرستی کو دیکھ کر لوگ رشک کرتے تھے - جسمانی ورزش اور کھیلوں کے علاوہ اس مدرسے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں دستکاری کی تعلیم بہت احتیاط کے ساتھ منظم کی گئی تھی - بانی مدرسہ خود اس کے متعلق لکھتا ھے :—

''جسمانی ورزش کی تکمیل اس قسم کی دستکاریوں کے ذریعے ھوتی ھے جیسے ٹوکریاں بنانا، برتن اور گتے کی چیزیں بنانا، جلد سازی، مجسمہ سازی، لکڑی اور لوھے کا کام وغیرہ - یہ سب طالب علم کی جسمانی اور دماغی نشو و نما کے نہایت قابل قدر ذریعے ھیں - اِن سے نہ صرف طلبہ کو اُس ذوق عمل کی تسکین ھوتی ھے جو اُن کی عمر کا خاصہ ھے، بلکہ مشاھدے، موازنے اور تخیل کی قوتیں نشو و نما پاتی ھیں اور ایجاد و جدت کی خواہش اُبھرتی ھے...... چھوٹے بچوں کو کاغذ اور گتے کی چیزیں بنانا، ڈرائنگ اور ماڈلنگ سکھائی جاتی ھے - ان کے بیرونی کاموں میں باغ کے روشوں کی صفائی، کیاریوں کی کاشت اور پالتو جانوروں مثلاً مرغیوں، خرگوشوں کی نگہداشت شامل ھے - دس سال کی عمر کے بعد وہ بڑھئی کا کام بھی سیکھتے ھیں اور جو زیادہ مضبوط ھوتے ھیں وہ لوھار خانے میں کام کرتے ھیں........''

ھم نے اس باب میں جسمانی تربیت کا جو نظریہ پیش کیا ھے اس کا خلاصہ کیا ھے؟ ھم یہ نہیں چاھتے کہ سب طلبہ پہلوان بن جائیں اور اپنے جسم کی پرداخت کو مقصود بالذات

سمجھنے لگیں - ہمارے نزدیک جسمانی تربیت کی تکمیل کے معنی یہ ہیں جب انسان تندرست اور طاقتور ہو اور اپنی طاقتوں کو اپنے مقاصد زندگی کی تحصیل میں استعمال کر سکے، اسے اپنے اعضا اور حواس پر پورا قابو ہو، اور وہ ان کے ذریعے سے اپنے ماحول کے ساتھ رابطہ قائم رکھے اور اس سے حسب ضرورت کام لے سکے اور بالخصوص اسے اپنے ہاتھوں کی حرکت پر پوری قدرت ہو اور وہ ان کے بےشمار امکانات عمل میں سے بعض کو مشق کے ذریعے ظاہر کر سکے - جب ہم جسمانی تربیت کا یہ وسیع مفہوم اختیار کرتے ہیں تو اس سے محض جسم کی پرورش مراد نہیں ہوتی بلکہ ان تمام جسمانی قوتوں اور امکانات کی نشو و نما جن سے ہماری دماغی اور عقلی تربیت میں مدد ملتی ہے اور ہم ان تعمیری اور تخلیقی مشاغل میں شریک ہوتے ہیں جو انسان کی خلاق طبیعت کا اظہار ہیں اور جن کے ذریعے وہ بعض اہم‌ترین جبلتوں کو تسکین دیتا ہے -

حصہ سوم

باب اول

اخلاق کا حقیقی مفہوم

ہم نے اس کتاب کے دوسرے حصے میں مدرسۂ جدید کے تعلیمی اصولوں سے بحث کی ہے اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید تعلیمی نظریوں کی رو سے مدرسے میں نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو کس طرح مرتب کرنا چاہیے کہ طلبہ کی ذہنی تربیت اور جسمانی نشو و نما بخوبی ہوسکے - اس ضمن میں ہم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے مدارس کے مروجہ نصاب اور تعلیمی طریقوں میں بہت سے ایسے نقائص ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے طلبہ کی شخصیت کی تربیت صحیح طریقے پر نہیں کرسکتے - ان کی ذہنی صلاحیتیں اکثر افسردہ ہو کر رہ جاتی ہیں - ان کے دل میں علمی اور عملی دلچسپیاں پیدا نہیں ہونے پاتیں اور وہ زندگی کے گوناگوں امکانات سے پوری طرح لطف اور فائدہ نہیں اٹھا سکتے - علاوہ اس امر کے کہ مروجہ تعلیم انفرادی نشو و نما کی ضامن

نہیں ہے اس کے خلاف یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ طلبہ کو موجودہ تمدنی زندگی کی ضرورتوں کے لیے تیار نہیں کرتی اور اس نے اب تک ان جدید تحریکوں اور اثرات کی اہمیت کو نہیں سمجھا جنھوں نے موجودہ زمانے کی معاشرت اور سیاست، اس کے نظام صنعت و حرفت، اس کی علمی جد و جہد کے رجحان کو بدل دیا ہے - تعلیم اور تمدنی رجحانات کو ہم‌آہنگ بنانے اور مدرسے کے ماحول میں افراد کی تربیت کے لیے بہترین محرکات اور اثرات مہیا کرنے کے لیے ماہرین تعلیم نے، نفسیات اور تمدنی علوم سے فائدہ اُٹھا کر، جدید تعلیمی تجربوں اور طریقوں کو رواج دیا ہے جن میں سے چند اہم تجربات کا ذکر ہم کر چکے ہیں -

اب ہم اس مسئلے کے دوسرے پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں - ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ تعلیم سے مراد صرف علم سکھانا نہیں بلکہ عرف عام میں یہ لفظ مجموعی تربیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے انسان کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کا ابھارنا، سنوارنا اور منظم کرنا - اس لیے تعلیم کے عملی پہلو سے بحث کرنے کے بعد، جس کا تعلق زیادہ تر ذہنی نشو و نما سے ہے، ہمارے سامنے یہ اہم اور نازک مسئلہ در پیش ہے کہ طلبہ معاشرتی زندگی میں حصہ لینے اور اپنے ملک اور زمانے کی بہترین اخلاقی قدروں اور اصولوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے کس طرح تیار کیے جاسکتے ہیں - واقفیت اور علم میں اضافہ کرنا آسان ہے لیکن انسان کے اصول زندگی پر اثر ڈالنا، اس کے جذبات اور حیات کو ایک عمدہ اور اعلیٰ نصب‌العین کے

تحت میں لاکر مہذب اور منظم کرنا اور اسے اپنی قابلیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دشوار ہے - لیکن یہ کام جس قدر مشکل ہے اسی قدر ضروری ہے اور معلم کو جو گویا ایک انسان برتر کی تخلیق میں مصروف ہے اس فرض کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے اور اس کی بجا آوری میں پوری کوشش کرنی چاہیے - یہاں اسے انسان کی نہایت قدیم اور بنیادی جبلتوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کے خیالات اور افعال پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہیں اور جب تک وہ بہت احتیاط اور ہوشیاری سے ان قوتوں کو راہ پر لگا کر اپنا معین و مددگار نہ بنائے گا اسے کامیابی نہیں ہو سکتی - اس لیے اسے نفسیات اطفال سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ ان قوتوں کو صحیح طور پر سمجھ کر رہنمائی کرے - لیکن محض علم النفس سے واقف ہونا اس کے لیے کافی نہیں کیونکہ اس کے ذریعے سے تو اسے صرف اسی قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ اسے کس مواد سے کام لینا ہے - یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ کس منزل کی طرف اپنا قدم بڑھائے، کس نصب العین کے حاصل کرنے کی کوشش کرے - مقصد کے تعین کے لیے اسے اخلاقیات اور عمرانیات سے مدد لینے کی ضرورت ہے - اور یہ جاننا لازم ہے کہ وہ کون سے اخلاقی اور معاشرتی اصول زندگی ہیں جن کو بہترین علما اور حکما نے تسلیم کیا ہے، تاکہ وہ اپنے طلبہ کو ان سے روشناس کرے اور انہیں ان پر عمل کرنے کی عادت ہو -

ہمیں اس موضوع پر نظر ڈالنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ذہنی اور اخلاقی تربیت

کی بحث میں ہم نے جو تقسیم قائم کی ہے وہ نفس امر کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اظہار خیال میں سہولت پیدا کرنے کے لئے اختیار کی گئی ہے - تعلیمی مباحث میں ہم نے اس اصول کو پیش نظر رکھا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ طالب علم کی شخصیت اور تعلیم کے عمل دونوں میں ایک اندرونی وحدت اور ربط ہے جس کو نظرانداز کرنا بہت بڑی غلطی ہے - اصل میں ہم انسان کی ہستی کو الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کر سکتے - یہ نہیں کہ سکتے کہ جسم اور دماغ، عقل اور اخلاق، روح اور مادہ بالکل مختلف چیزیں ہیں جن کو ایک دوسرے سے سروکار نہیں اور جن کی تربیت اور نشو و نما کے لیے بالکل جداگانہ تدابیر درکار ہیں - جس طرح آرٹ کے ہر بڑے شاہکار میں ایک مرکزی خیال یا جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو اسے ایک مخصوص وحدت (Unity) یا بقول ڈاکٹر نن (Nunn) کے "انفرادیت" (Individuality) بخشتا ہے، اس طرح انسان کی زندگی اور اس کی ذات میں جو قدرت کا سب سے بڑا شاہکار ہے ایک وحدت پائی جاتی ہے جو اس کے مختلف اعمال و افعال، اس کے مختلف عناصر کو باہم مربوط رکھتی ہے - اس خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کا عمل بھی ایک سالم عمل ہے جس کو جسمانی تعلیم، ذہنی تعلیم، اخلاقی تعلیم وغیرہ میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا - گو ہم اپنی آسانی کے لیے اور ایک وقت میں کسی خاص پہلو کو نمایاں کرنے کی غرض سے اس تقسیم سے کام لیتے ہیں، لیکن ہمیں یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ تعلیم کے یہ مختلف پہلو واقعی مستقل وجود رکھتے ہیں اور

ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں ڈالتے اور معلم ان میں سے ہر ایک کے لیے علحدہ علحدہ تدابیر اور وسائل سوچ سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ انتظام جو مثلاً جسمانی تعلیم کے لیے کیا جاتا ہے محسوس یا غیر محسوس طور پر طلبہ کی دماغی اور اخلاقی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اس طرح مدرسے میں جو وسائل ہم طلبہ کی علمی اور اخلاقی تربیت کے لیے اختیار کرتے ہیں وہ ان کی اخلاقی سیرت کی تشکیل میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ مروجہ اخلاقی تعلیم کی خرابی کی ایک بڑی وجہ جس کی توضیح ہم آئندہ چل کر کریں گے یہ ہے کہ بالعموم لوگوں نے اخلاقی تربیت کا جو مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے وہ بہت محدود اور ناکافی ہے۔ در اصل اس میں علم اور عقل دونوں کو بہت بڑا دخل ہے۔ اس لیے طلبہ کی علمی اور عقلی تربیت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کی سیرت اور طرز عمل میں تغیر واقع ہو۔ اس وجہ سے گو اب تک ہم نے فی نفسہ اخلاقی تربیت کے مسئلے کو نہیں اٹھایا لیکن گزشتہ بحثوں میں ضمنی طور پر بار بار اس کا ذکر آچکا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ مدرسے کے تمام کار و بار اور مشاغل کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیں کہ وہ کس حد تک اخلاقی تربیت میں معین یا مزاحم ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے ان کی تنظیم کس طرح کرنی چاہیے۔

سب سے پہلے ہمیں اخلاق کے صحیح مفہوم اور اس کی حدود کو سمجھ لینا چاہیے۔ لوگوں نے عام طور پر اخلاق کو انسانی زندگی کا ایک شعبہ سمجھ رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے

کہ زندگی بہت سے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ھے
کاروباری، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی وغیرہ - گویا ھر انسان بہ
سی مختلف اور غیر مربوط شخصیتوں کا مجموعہ ھے جن
وہ بہ مشکل ایک ساتھ تو رکھ سکتا ھے لیکن ھم آھنگ نہ
بنا سکتا - یہ سچ ھے کہ اس ناقص اور نا مکمل دنیا •
اکثر لوگوں کی حالت ایسی ھے کہ ان کے نفس میں تفر
اور انتشار پایا جاتا ھے - ھر شخص اپنے نفس کے مشاہ
اور دوسروں کی سیرت کے مطالعے سے اس بات کی تصد
کر سکتا ھے - چونکہ زیادہ تر لوگوں کے نفس میں یہ تة
دماغی جنوں کی حد تک نہیں پہنچتی اس لیے وہ
کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن جب وہ اسے انتہائی ص
میں دیکھتے ھیں مثلاً سٹیونسن (Stevenson) کے م
افسانے "ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ھائیڈ" r. Jekyll and
Mr. Hyde) میں نفس کی دوئی کی داستان پڑھتے
تو انھیں تعجب ھوتا ھے اور وہ سمجھتے ھیں کہ یہ کوئی
طبعی چیز ھے جس کو صحیح العقل انسانوں کے روزمرہ
تجربات سے کوئی تعلق نہیں - حالانکہ اس شخص میں
دو بالکل متضاد طبیعتیں رکھتا ھے، اور معمولی آدمیوں
فرق محض کمیت کا ھے کیفیت کا نہیں - وہ بھی د
کاروبار اور تجارت میں ایک اصول رکھتے اور برتتے ھیر
ذھنی امور یا خانگی زندگی میں بالکل دوسرے اصول
طرز عمل کے تابع ھوتے ھیں - انگریزی کی ایک ضرب
اس مروجہ تقسیم کو اس طرح ظاھر کرتی ھے کہ "ھفتے
چھے دن دنیاداری کے ساتواں دینداری کا " غرض یہ باد

ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عملی حیثیت سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کی شخصیت میں ہم آہنگی پائی جائے اور بالعموم اکثر لوگ اپنی زندگی کو مختلف اور غیر مربوط حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں - مگر یہ تعلیم و تربیت کی خرابی کا ثبوت ہے - ہم اس ناقابل اطمینان صورت حال کو اپنا منتہائے نظر نہیں بنا سکتے - صحیح تربیت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ وہ افراد کی شخصیت میں یہ انتشار پیدا ہونے نہ دے اور ان کی تمام علمی اور عملی قوتوں کو اس طرح مربوط اور منظم کر دے کہ وہ اعلیٰ ترین اخلاقی نصب العین کے حصول کے لیے استعمال ہوسکیں جو زندگی کے ہر شعبے میں یکساں طور پر شمع ہدایت کا کام دیتا ہے - لہذا ہمارے نقطۂ نظر سے اخلاق کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں اور تمام مشاغل کو محیط ہے اور اخلاقی سیرت کا اظہار انسان کے ہر کام میں ہونا چاہیے خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا تجارت سے یا صنعت اور مزدوری سے یا مذہب سے - اخلاق کا یہ مفہوم اس مروجہ مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع اور پر معنی ہے جو آداب نشست و برخاست اور طریقۂ کلام و طعام تک محدود ہے یا کبھی کبھی جنسی تعلقات کے لیے استعمال ہوتا ہے - عام طور پر جب لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا اخلاق اچھا ہے - تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی بات چیت اور برتاؤ میں شائستگی پائی جاتی ہے اور وہ ادب محفل سے واقف ہے لیکن اخلاق کے لفظ کو اس قدر محدود معنی میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسے ہم بیچ سمندر میں غوطہ لگانے کے بجائے محض اس کی سطح کو چھونے پر قناعت کریں - بے شک

ایک با اخلاق شخص کی گفتگو میں شیرینی اور اس کے برتاؤ میں حفظ مراتب کا خیال بھی ہونا چاہیے لیکن اگر یہ صفات اس کی تہذیب نفس کا نتیجہ نہیں ہیں تو پھر محض اوپری چیزیں ہیں جن کو ہم کوئی وقعت نہیں دے سکتے - بہت ممکن ہے کہ ایک بد باطن اور بد کردار شخص لوگوں کو فریب دینے کے لیے اس قسم کا جھوٹا اور نمائشی "اخلاق" ظاہر کرے - ہمیں روزمرہ کی زندگی میں اکثر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو باوجود اس سطحی "اخلاق" میں ماہر ہونے کے نہایت درجہ ذلیل اور بد اخلاق ہوتے ہیں - ممکن ہے کہ بعض لوگ جو وسیع تجربہ اور غائر نظر رکھتے ہیں ان کی ریاکاری کو پہچان سکیں اور کھرے اور کھوٹے سکے میں تمیز کرسکیں لیکن عام لوگ دھوکے میں آجاتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں - اس لیے ہمیں اخلاق کے اس سطحی مفہوم کو یک قلم مسترد کر دینا چاہیے - اسی طرح جو لوگ اخلاق کو جنسی تعلقات کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں اور "با اخلاق" کے لفظ کا اطلاق ان لوگوں پر کرتے ہیں جن کی زندگی کا صرف یہ پہلو قابل تعریف ہوتا ہے وہ بھی کل کے بجائے جزو پر قانع ہو جاتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ یہ بھی اخلاق کا ایک نہایت اہم حصہ ہے لیکن اس کو اخلاق کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ انسان پر زندگی کی گوناگوں کشمکش میں مختلف قسم کے فرائض عائد ہوتے ہیں - اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو ادا کرے اور باقی کی طرف سے بےاعتنائی برتے تو ہم اس کو اخلاقی اعتبار سے اچھا نہیں سمجھ سکتے - مثلاً اگر کسی شخص کا کردار جنسی تعلقات کے لحاظ

سے بالکل پاک و صاف ہے لیکن وہ نہ سچ بولتا ہے، نہ جائز ذرائع سے حصول معاش کرتا ہے، نہ اپنے خاندان والوں اور ہمسائیوں کے حقوق ادا کرتا ہے تو اس کو یقیناً بد اخلاق کہنا چاہیے - لہذا ان دونوں معنوں کو چھوڑ کر ہمیں اخلاق کا وہی مفہوم اختیار کرنا پڑے گا جو زندگی کے تمام مشاغل اور معاملات کو محیط ہو -

مدرسے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خارجی زندگی کے خیالات اور عقائد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - چونکہ سوسائٹی نے اخلاق کا مفہوم غلط سمجھ رکھا ہے اس لیے مدرسے میں بھی اخلاق سے متعلق ایک بہت محدود اور تنگ نقطۂ نظر رائج ہو گیا ہے اور اخلاق اور زندگی کے گہرے رابطے کو فراموش کر دیا گیا ہے - مدرسوں میں "اخلاقی تربیت" کے یہ معنی لیے گئے ہیں کہ بچوں کو چند اخلاقی اصول بتا دیے جائیں - بہت سے اُستادوں کو تو اس کی فرصت ہی نہیں ملتی یا سرے سے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اخلاقی تعلیم کا کوئی بندوبست کریں لیکن جن معلموں کو اس کا خیال ہوتا بھی ہے ان میں سے بھی اکثر اس بات پر قناعت کرتے ہیں کہ طلبہ کو اچھے اچھے مقولے اور اخلاقی نصیحتیں سنا دیں اور ان پر عمل کرنے کی تاکید کر دیں - بعض جو زیادہ ایماندار اور محنتی ہوتے ہیں اور احساس فرض کے بوجھ سے دبے جاتے ہیں وہ ان اصول کی تشریح و تفسیر بھی کر دیتے ہیں - اتنا کر کے وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کی مہم سر ہو گئی - بے شک بعض معلم ایسے بھی ہیں جو اپنی مثال اور شخصیت کے مقناطیسی اثر سے طلبہ کی زندگی میں سچا

اخلاقی احساس پیدا کر دیتے ھیں اور غیرشعوری طریقے پر ان کے معیار فکر و عمل، ان کے مذاق اور اخلاق کو بلند اور برتر کرتے رہتے ھیں - خال خال ایسے روشن دماغ معلم بھی مل جائیں گے جن کو شعوری طور پر یہ معلوم ھے کہ اخلاقی تربیت کے اصول کیا ھیں اور اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنی چاھییں - لیکن ان مستثنیٰ صورتوں کو چھوڑ کر اخلاقی تربیت کی عام کیفیت وھی ھے جو ھم نے اوپر بیان کی ھے - اس میں مطلق مبالغہ نہیں ھے - اس بےتوجہی اور بےاصولی کا نتیجہ صرف یہی نہیں کہ معلمین کا مقصد حاصل نہیں ھوتا بلکہ وہ اپنی غلط کوشش سے، گو وہ نیک نیتی پر مبنی ھوں، بچوں کی قدرتی نشو و نما میں حارج ھوتے ھیں اور اپنی مداخلت سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتے ھیں - ان کی نام نہاد اخلاقی تعلیم کو بچوں کی روزمرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ھوتا - انھیں اس کا موقع ھی نہیں دیا جاتا کہ اس تلقین کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنائیں - اس لیے اخلاقی نصیحتیں اور مقولے صرف ان کے کانوں تک پہنچ جاتے ھیں، دل میں نہیں اترتے، عمل کی شکل نہیں اختیار کرتے - وہ ان کو طوطے کی طرح رٹ لیتے ھیں اور جب ضرورت ھو فرفر سنا دیتے ھیں لیکن قول اور فعل کی علحدگی ان میں بلا ارادہ ریاکاری پیدا کرتی ھے اور مدرسے کی اخلاقی تعلیم سطحی، مصنوعی اور غیرموثر رہ جاتی ھے - خود مدرسے کی چاردیواری میں بھی اس کا کوئی خاص اثر ظاھر نہیں ھوتا اور مدرسے کو چھوڑنے کے بعد تو وہ بالکل ھی بےکار اور فضول ثابت ھوتی ھے -

اس بحث سے ھمیں اخلاقی تربیت کا پہلا بنیادی اصول

ہاتھ آتا ہے کہ اخلاق کی تعلیم کو وسیع اور جامع یعنی طلبہ کی پوری زندگی پر حاوی ہونا چاہیے اور اس کی بنیاد ان کے ماحول اور مشاغل اور ان کی فوری ضروریات اور فطری خواہشات پر رکھنا چاہیے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ تعلیم ایسی ہو جو بلا تفریق و امتیاز ان کی کل خواہشات پوری کرے یا ان کی روزمرہ کی زندگی اور مشاغل کی سطح سے بلند نہ ہونے پائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم تمام تر عملی ہو یعنی وہ طلبہ کی زندگی کے گوناگوں تجربات اور مشاغل کو پیش نظر رکھ کر ان میں بہتر تنظیم و ترتیب قائم کرے اور ان کو اخلاقی اصولوں کے تحت میں لائے نہ یہ کہ ان کی عملی ضرورتوں سے قطع نظر کر کے ان پر زبردستی مجرد اخلاقی اصول عائد کر دے۔ اس لیے مدرسے میں ہر اصول اور قاعدے کی تشریح، ہر قانون کی مثال طلبہ کی زندگی میں سے مہیا کرنی چاہیے۔ مثلاً فلسفۂ اخلاق کا ایک نہایت اہم اصول یہ ہے کہ معاشرتی زندگی اس وقت تک نہیں چل سکتی اور نہ افراد کو آزادیٔ عمل حاصل ہو سکتی ہے جب تک لوگ اس کے عادی نہ ہوں کہ ایک دوسرے کے ساتھ رعایت اور رواداری برتیں، اپنے اپنے حقوق اور فرائض پہچانیں اور دوسروں کے کام میں بےجا مداخلت کرنے سے باز رہیں۔ طلبہ کو محض اس اصول کا زبانی سمجھا دینا کافی نہیں کیونکہ جب تک یہ ان کے ذاتی تجربے کی مستحکم اور پائدار بنیاد پر قائم نہ ہو، ان کی اپنی کامیابی اور ناکامی کی مثالوں سے اخذ نہ کیا گیا ہو ان کے عمل کی رہبری نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مدرسے میں ایک معاشرتی ماحول مہیا

کیا جائے - تاکہ طلبہ اس کے نشیب و فراز سے واقف ہو کر خود اس نتیجے پر پہنچیں کہ حقوق کے ساتھ فرائض بھی وابستہ ہوتے ہیں اور اگر کوئی شخص چاھتا ھے کہ اسے اپنے مشاغل کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو تو اسے دوسروں کے مشاغل میں بےجا مداخلت نہیں کرنی چاھیے ورنہ وہ بھی اس کے کاموں میں دست اندازی کریں گے - انفرادی حقوق اور ان کی حدود کی یہ معرفت محض اُستاد کے بیان سے حاصل نہیں ہو سکتی - اس کے لیے بچے کو پڑھائی کے کمروں میں، بورڈنگ ہاؤس کی زندگی میں، کھیل کے میدان میں اور تمام مشترک مشاغل کے دوران میں اپنے ھمعمر اور اپنے سے چھوٹے بڑے ساتھیوں کے ساتھ تعاون عمل کی ضرورت ھے کیونکہ یہ ساتھی براہ راست اپنے مخصوص طریقوں سے یہ سبق اچھی طرح ذہن نشین کرا دیتے ہیں - اگر کوئی طالب‌علم مدرسے کے بن لکھے قوانین اور روایات کی خلاف‌ورزی کرتا ھے تو طلبہ خود مجرم کو قرار واقعی سزا دیتے ہیں اور اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ عام روایات اور طریقۂ عمل کی پیروی کرے - یہ سزا اسے ناگوار نہیں ہوتی یا کم سے کم اتنی ناگوار نہیں ہوتی جتنی استاد کی سزا، جو اکثر مبہم وجوہ پر مبنی ہوتی ھے جن کو سمجھنے سے وہ قاصر ہوتا ھے کپلنگ (Kipling) نے پبلک اسکول کی زندگی کے متعلق جو دلچسپ اور مشہور کتاب ''سٹاکی اینڈ کو'' (Stalky and Co.) لکھی ھے اس میں اس حقیقت کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ دکھایا ھے - خصوصاً ایک باب میں جس کا عنوان ''اخلاقی مصلحین'' ھے اس نے ایک سبق آموز

کہانی بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کے لیے جو تدابیر اکثر خود طلبہ اختیار کرتے ہیں، وہ کس قدر موثر اور کارگر ہوتی ہیں خواہ استادوں اور والدین کے سنجیدہ نقطۂ نظر سے وہ قابل اعتراض ہوں -

تعلیم اخلاق کے متعلق جو غلط فہمیاں رائج ہیں ان میں سے بہت سی ایک غلط نفسیاتی عقیدے پر مبنی ہیں، جس کی درستی کیے بغیر ہم اخلاقی تربیت کے اصول قائم نہیں کر سکتے - لوگوں میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ انسان کے نفس میں دو جداگانہ قوتیں ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے بر سر پیکار رہتی ہیں ایک طرف اس کی جبلتیں' اس کے جذبات اور اس کی خواہشیں ہیں جو اسے اپنی جانب کھینچتی ہیں اور دوسری طرف اس کی عقل ہے جو ایک مستقل اور آزاد قوت ہے - یہ اس کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتی ہے اور اسے جذبات اور جبلتوں کے فریب سے بچانے کی کوشش کرتی ہے - انسان اور حیوان میں عموماً یہی چیز ما بہ الامتیاز قرار دی جاتی ہے کہ انسان عقل کا تابع ہوتا ہے اور حیوانات اپنی خواہشوں کے بندے ہوتے ہیں - انسان کی کامیابی اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنی عقل کی ہدایت سے فائدہ اٹھا کر اپنی خواہشات اور جذبات کو زیر کرے بلکہ اگر ہو سکے تو انہیں بالکل مٹا دے - گویا عقل و ارادہ اور دوسری قوتوں میں لازمی کشمکش ہے اور اخلاقی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ عقل باقی تمام قوتوں پر غالب آ جائے - لیکن نفسیات کی جدید تحقیقات اس خیال کی تردید کرتی ہے - جیسا ہم ابھی

بتا چکے ہیں انسان کے نفس میں یہ حالت طبعی ہم آہنگی ہوتی ہے - اس کثرت مشاغل اور افعال میں جو اس کی زندگی میں نظر آتی ہے ایک خاص وحدت پوشیدہ ہے - اس کی تمام جسمانی اور دماغی، علمی اور اخلاقی قوتیں ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں - ان کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنا غلطی ہے کیونکہ ان سب کی ابتدا انہیں سادہ اور جبلی رجحانات سے ہوتی ہے جو تمام افراد کی فطرت میں پائے جاتے ہیں - نفسیات ہمیں سکھاتی ہے کہ انسان کی تمام اعلیٰ قوتیں رفتہ رفتہ ان اضطراری افعال، جبلتوں اور صلاحیتوں کے تعاون اور تعامل سے وجود میں آتی ہیں جو بچے کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں - یہی وہ سرمایہ ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے - اور انہیں چیزوں کی صحیح نگہداشت اس کی آئندہ دماغی اور اخلاقی تربیت کا دار و مدار ہے -

ابتدا میں یہ مختلف قسم کی حرکات بالکل غیر شعوری ہوتی ہیں اور محض ماحول کے رد عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں - انہیں سے شیرخوار کی ابتدائی منزل میں بقائے حیات کا کام انجام پاتا ہے - لیکن ابھی تک اس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ ان حرکات کے ذریعے اپنے جسم کو سنبھالے اور اس کی حفاظت کرے یا اپنے ماحول پر قابو حاصل کرے اور گرد و پیش کے معاملات اور مسائل کو سمجھ سکے - لیکن جوں جوں بچے کو مختلف قسم کے تجربات پیش آتے ہیں وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اس کے مظاہر اور خواص کو سمجھتا ہے اسے روزمرہ نئی مشکلات اور نئے مسائل پیش

آتے ہیں - فرد اور ماحول کے اس باہمی تعامل سے اس کی قوتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہونا اور ایک منظم صورت اختیار کرنا شروع کرتی ہیں - تکلیف اور آرام کا احساس جو اس کو مختلف چیزوں اور کاموں سے حاصل ہوتا ہے اس کے دل میں اپنے ماحول کے مختلف اجزا اور عناصر کے متعلق ایک احساس قدر پیدا کرتا ہے یعنی بعض کو وہ پسند کرتا ہے اور ان کو حاصل کرنے یا ان کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہے - بعض کو ناپسند کرتا ہے اور ان کو دور کرنا یا ان سے دور رہنا چاہتا ہے - اس طرح اوائل عمر ہی میں ایک قسم کا ابتدائی اور فطری معیار اقدار مرتب کر لیتا ہے' جو زیادہ‌تر محض اس کے ذاتی تاثرات پر منحصر ہوتا ہے یعنی جس چیز سے اس کے نفس کو تکلیف پہنچتی ہے اس کو ''برا'' سمجھتا ہے جس سے خوشی حاصل ہوتی ہے اسے ''اچھا'' سمجھتا ہے - مثلاً ڈاکٹر جو بچے کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے اس کا نام اس کی فہرست میں نہایت ناپسندیدہ لوگوں میں لکھا جاتا ہے اور بیوقوف نوکر جو اس کو وقت بےوقت مٹھائی کھلائے وہ اس کے نزدیک سب سے بہتر شخص ہے - اس طرح جو شخص بھی اس کو اس کے پسند کے برے اور مضر کاموں سے جنہیں وہ کرنا چاہتا ہے روکے وہ اس کو برا معلوم ہوتا ہے اور جو شخص اس کی ضدوں کو پورا کرے وہ اسے محبوب ہوتا ہے - ممکن ہے ان مثالوں پر غور کرنے سے کسی کو یہ خیال ہو کہ یہ معیار بہت ہی ناقص اور ادنیٰ ہے اور محض ذاتی تاثر کی بنا پر چیزوں اور آدمیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا بڑی غلطی ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ

یہ اصول انسانی فطرت کے نہایت مستحکم اور اٹل قوانین میں سے ہے - آگے چل کر اس کی شکل بدل جاتی ہے، اس کے استعمال کا طریقہ دوسرا ہو جاتا ہے لیکن انسان کی پسند اور ناپسندیدگی میں شخصی رنگ کی جھلک، یعنی فلاں کام یا فلاں شخص میرے لیے کیسا ہے، مجھے کیسا معلوم ہوتا ہے؛ اس کی شخصیت کی ہر ارتقائی منزل میں پائی جاتی ہے - جب انسان کی عقل اور تجربے اور وسعت نظر میں ترقی ہوتی ہے تو اس کے نزدیک تکلیف اور آرام، رنج اور خوشی کا مفہوم اور ان کے حرکات بھی بدل جاتے ہیں - اس کو بعض نئی چیزیں پسند آتی ہیں اور بعض چیزیں جو پہلے مرغوب تھیں ناگوار معلوم ہونے لگتی ہیں - لیکن ہر حالت میں وہ ان کے متعلق جو رائے یا طرز عمل رکھتا ہے اس کی بنا اسی پر ہوتی ہے کہ آیا ان سے اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے یا رنج - لیکن نفسیات کی اصطلاح میں خوشی اور رنج کا حقیقی مفہوم وہ نہیں جو عیش طلب لوگ سمجھتے ہیں - خوشی نام ہے اس احساس یا جذبے کا جو شخصیت کی توسیع اور ترقی سے انسان کے دل میں پیدا ہو - ہر وہ چیز جو میری شخصیت کو قوت پہنچاتی ہے، اس میں استحکام اور گہرائی پیدا کرتی ہے، میری خوشی کی باعث ہوگی خواہ اس کے حصول میں مجھے کتنی ہی محنت کرنی اور تکلیف اٹھانی پڑے - برخلاف اس کے جو چیز میری شخصیت کو محدود اور کمزور کرتی ہے وہ رنج پہنچاتی ہے خواہ بہ ظاہر مجھے اس سے آرام اور فائدہ محسوس ہوتا ہو - فرض کیجیے آج میرا خیال ہے کہ کسی کاروبار میں بہت

سا روپیہ لگانے سے میری شخصیت کو استحکام اور تقویت پہنچے گی - اس صورت میں میں اپنی تمام کوششوں کو اس مقصد کے لیے وقف کر دوں گا - ہر اس چیز کی جو اس میں معین ہوگی دل سے قدر کروں گا اور باقی تمام چیزوں کو اپنے لیے نقصان دہ اور باعث انتشار سمجھوں گا - لیکن اگر کل میرا خیال یہ ہو جائے کہ ملک میں مدرسے قائم کرنا نہایت ضروری ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی مفید کام نہیں تو میں اپنے روپے کو بے دریغ اس کار خیر میں صرف کروں گا اور میری نظر میں دولت کی حیثیت صرف اتنی ہوگی کہ وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی اعمال کا محرک ہمیشہ وہی ایک جذبہ ہوتا ہے یعنی شخصیت کا فروغ اور استحکام یا عزم القوہ - لیکن وہ اغراض و مقاصد جن کے لیے انسان جد و جہد کرتا ہے، اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے، اپنی قوتیں اور وسائل استعمال کرتا ہے، بدلتے رہتے ہیں -

اخلاقی تعلیم کا منشا اور منتہا یہ ہے کہ بچوں کے تمام کاروبار اور مشاغل کا رشتہ اعلیٰ ترین اقدار اور مقاصد سے جوڑے تاکہ وہ انہیں کو حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کریں ان کے اندر اپنی شخصیت کو محو کر دیں اور اس طرح اس کو زیادہ قابل قدر بنا کر دوبارہ حاصل کریں - بالفاظ دیگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچے کی توجہ کو اس کی ذات کی فوری اور عارضی ضروریات سے ہٹا کر مستقل اور بلندتر اجتماعی ضروریات کی جانب مائل کریں جن کو پورا کرنے میں اسے تکمیل نفس اور اظہار خودی کے بہترین مواقع مل سکیں - وہ کسی کام کو

محض اس خیال سے نہ کرے کہ اس سے اس کا نفس حیوانی "آرام" پاتا ھے، نہ کسی کام سے محض اس لئے پرہیز کرے کہ اس میں محنت اور تکلیف اٹھانی پڑتی ھے بلکہ وہ اپنی زندگی کی راہ کو کسی اپنے نصب العین کی روشنی سے منور کرے کہ اس کو سفر کی صعوبتوں اور تکلیفوں کی پروا نہ رھے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نفس کش زاھدوں کی طرح آرام کی خواھش ھی نہ کرے یا تکلیف اٹھانے کو فی نفسہ باعث ثواب سمجھے - البتہ اسے جسمانی آسائش اور جسمانی خواھشات کی تشفی کو بھی اعلیٰ تر مقاصد میں معین بنانا چاھیے - جہاں کہیں جسمانی آسائش کے مطالبات ارتقائے شخصیت کے مطالبات سے برسر پیکار ھوں اسے جسمانی آسائش کو ترک کر دینا چاھیے - اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ھے کہ صحت جسمانی کا احتیاط اور خورد و نوش کا اھتمام اسی حد تک ضروری بلکہ اخلاقی فرائض میں شامل ھے جہاں تک اس سے انسان کو اس کام میں مدد ملتی ھو جو اس کا مقصد حیات ھے - جسم روح کا خادم اور آلۂکار ھے اس لئے اس کی خبرگیری اور نگہداشت لازم ھے - لیکن تربیت جسمانی کو مقصود بالذات بنا لینا اور بعض جسم پرستوں کی طرح اس خبط میں مبتلا ھو کر زندگی کے اور تمام فرائض اور مطالبات سے غافل ھو جانا سراسر ناجائز ھے - اس کے معنی یہ ھیں کہ انسان نے برتر کو کمتر پر قربان کر دیا ھے اور وسیلے کو مقصد بنا لیا - اخلاقی تربیت کا سب سے اھم پہلو یہ ھے کہ طلبہ وسیلے اور مقصد میں تمیز کرسکیں اور مختلف مقاصد میں باعتبار ان کی اخلاقی قدر و قیمت کے ترتیب قائم کر سکیں -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ کو اس اخلاقی معیار سے کس طرح روشناس کیا جائے کہ وہ ان کی زندگی میں ایک اثر آفریں قوت بن جائے -

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ ابتدا میں بچے کی ناپسند اور ناپسندیدگی کا انحصار اس کی اپنی ذات کی نشو و نما اور آرام و آسائش پر ہوتا ہے - یہ اخلاق کی سب سے پہلی منزل ہے - اس کے بعد اسے گرد و پیش کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ اپنے والدین کو پہچاننے اور ان سے محبت کرنے لگتا ہے' اپنے عزیزوں کے ساتھ رہنا سیکھتا ہے' ہمسایوں اور پڑوسیوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے' مدرسے میں اپنے ساتھیوں سے ملتا جلتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کے خیالات اور جذبات' ان کی بود و باش' ان کی رسوم و روایات کو اپنا بنا لیتا ہے - اس معاشری تجربے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اب وہ اپنے اعمال اور افعال کو معاشرے کی پسندیدگی کے معیار پر پرکھنے لگتا ہے - اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے ہمعمروں اور بڑوں کی خوشنودی حاصل کرے - ان کی ناراضگی اس کے لیے تکلیف کا باعث ہوتی ہے اور اس کے احساس خودی کو کمزور کرتی ہے اور ان کی خوشنودی سے اس کے نفس میں احساس قوت پیدا ہوتا ہے - گویا اس کی ذات روز بہ روز وسیع ہوتی جاتی ہے اور اپنے محدود دائرے سے آگے بڑھ کر اپنے متعلقین کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتی ہے - اس طرح اس کے لیے ایک نیا معیار قائم ہو جاتا ہے جو ابتدائی معیار سے بلند تر ہے - اس کے اثر سے اس کو عمرانی زندگی کے اصولوں سے انس اور مناسبت پیدا ہوتی ہے اور وہ بہت سی ایسی باتیں سیکھ لیتا ہے جو اس کے معاشری ماحول کے

مروجہ اخلاق کا جزو ہیں - وہ عملاً یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر فرد کو اپنی نشو و نما کے لیے معاشرے کی اداروں اور انتظامات سے فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے لیکن اس حق کے بدلے میں معاشرے کی طرف سے اس پر فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کی پابندی اس کے لیے ضروری ہے مثلاً یہ فرض کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرے لیکن ان کے مشاغل میں بیجا مداخلت سے باز رہے - ممکن بلکہ اغلب ہے کہ ہمدردی، اشتراک عمل، معاشری کارکردگی کا نظری مفہوم ابھی تک اس کی سمجھ سے باہر ہو لیکن عمل کے ذریعے وہ اُن عادتوں کو پختہ کر لیتا ہے جن پر اخلاقی زندگی کی بنیاد ہے - اگر اوائل عمر میں ان عادتوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جائے تو آگے چل کر انسان کو اپنی ساری توجہ اور محنت ان جزئیات کی اصلاح میں صرف کرنی پڑتی ہے اور وہ اعلیٰ تر اخلاقی مقاصد کا حق ادا نہیں کر سکتا -

اس کے بعد اخلاقی تربیت کی تیسری منزل آتی ہے جب طالب علم بچپن کی حدود سے نکل کر شباب کی سرحد میں قدم رکھتا ہے اور نہ صرف جسمانی اور ذہنی اعتبار سے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھتا ہے - اب وہ اپنے ہر فعل کو اس معیار پر نہیں پرکھتا کہ اس سے مجھ کو آرام و آسائش حاصل ہوگی یا نہیں اور نہ یہ سوچتا ہے کہ اگر میں فلاں کام کروں گا تو میرے دوست اور عزیز میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے - اس وقت تک وہ اپنی ہدایت کے لیے کچھ اصول اور قاعدے معین کر چکتا ہے اور اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنی راہ چلے

اور اُن کی مدد سے زندگی کے سارے مرحلے طے کرے بلکہ بلوغ کے زمانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر نوجوان محض اظہار خودی کے لیے اس شاہراہ سے ہٹ کر جس پر دوسرے چلتے ہیں اپنے لیے نئے راستے پیدا کرتے ہیں تاکہ خود انہیں اور دوسروں کو یہ محسوس ہو کہ وہ ایک آزاد شخصیت کے مالک ہیں - لیکن یہ مبالغہ آمیز اظہار خودی محض ایک علامت ہے جس سے ہمیں یہاں بحث نہیں - ہمارے پیش نظر وہ مضبوط اور مستحکم اخلاقی سیرت ہے جو اپنے اصولوں کی خاطر آرام و آسائش کو قربان کرنے اور تکلیفیں اُٹھانے کے لیے تیار ہو اور محض دوسروں کی خوشنودی یا تعریف کی خاطر اُس طرز عمل کو نہ چھوڑے جو اس کے نزدیک انصاف و صداقت کا تقاضا ہو - یعنی اس منزل میں پہنچ کر نئے سرے سے انسان کی رہنما اس کی اپنی ذات ہو جاتی ہے لیکن اب یہ ذات پہلے کی طرح عارضی اور فوری خواہشوں کی غلام نہیں ہوتی بلکہ تربیت اور تہذیب کی بدولت اخلاقی اقدار مقاصد سے آشنا ہو جاتی ہے - اب وہ ہر بات کا فیصلہ محض جسمانی راحت اور تکلیف کی بنا پر نہیں کرتی بلکہ اُس کا معیار بہت بلند ہو جاتا ہے اور وہ اعلیٰ‌تر مقاصد کے حصول کو اپنی شخصیت کے اظہار اور عزم‌القوة کی تسکین کا ذریعہ بنا لیتی ہے -

یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اخلاقی تربیت کی ان تینوں منزلوں سے گذر کر اپنی سیرت کی تکمیل کرے - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ پہلی ہی منزل میں رہ جاتے ہیں اس سے آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے - وہ اپنی ساری عمر اس ادنیٰ اور پست سطح پر بسر کرتے ہیں جہاں اعمال

و کردار پر فوری خواہشات اور حفظ نفس کی حکمرانی ہوتی ہے - ان کی اخلاقی حالت بچوں کی سی ہوتی ہے بلکہ اس سے بدتر - کیونکہ بچوں کے لیے تو یہ چیز فطرت کے موافق ہے اور ان غلطیوں اور کمزوریوں میں بھی معصومیت کی ایک شان پائی جاتی ہے - لیکن یہ لوگ جن کی اخلاقی نشو و نما مسدود ہو جاتی ہے نہ اپنی عقل سے کام لیتے ہیں نہ تجربے سے' سوائے اس ابتدائی اور فطری تجربے کے جو انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہے اور انہیں بعض صریحاً مضر اور مہلک چیزوں سے بچاتا ہے - وہ دوسروں کی خوشنودی اور معاشرے کی رائے کا بھی خیال نہیں کرتے - بعض لوگ اس حالت سے آگے بڑھ کر اخلاق کی درمیانی منزل تک پہنچ جاتے ہیں - جس میں دوستوں اور ہمچشموں یا اپنے سے بہتر لوگوں کی تقلید اور رضاجوئی کی خواہش زندگی پر حاوی ہوتی ہے ان کی بات چیت' چال ڈھال' وضع قطع' ادب آداب' غرض سارے ذاتی اور معاشرتی معاملات کا معیار یہی ہوتا ہے کہ کوئی بات ایسی نہ کریں جو دوسروں کی نظر میں کھٹکے - اس قسم کے لوگ سراسر رسم پرست اور تقلید پرست ہوتے ہیں اور معاشرے کے بےبس غلام بن کر رہ جاتے ہیں - ایک عجیب بات یہ ہے کہ نوجوانوں کی نفسی زندگی میں جہاں ایک طرف اظہار خودی اور نمود کی خواہش بہت نمایاں ہوتی ہے وہاں بعض باتوں میں وہ معاشرے کے دستور کا حد سے زیادہ لحاظ رکھتے ہیں اور کم سے کم اپنے ہمچشموں کی مخالفت کرنے میں بہت جھجکتے ہیں - ان متضاد رجحانات کا اکثر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ نوجوان اپنے بزرگوں اور استادوں کے

سامنے خواہ مخواہ بڑھ بڑھ کے اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔
ہر بات میں ان کی مخالفت اور ان کے بتائے ہوئے راستے سے
ہٹ کر چلتا ہے۔ مگر یہی نوجوان اپنے ہمعمروں اور دوستوں
کے سابقے میں ہر معاملے میں مروجہ رسم اور دستور کی تقلید
اور حمایت کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔
ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ارتقاء نفس کا یہ دور مفید یا اہم
نہیں ہے کیونکہ کسی شخص کی اخلاقی سیرت اس وقت
تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ منزل سے نہ گزرے۔
ہر معاشرے کے اخلاقی اصول و اقدار اور معیار عمل صدیوں کی
جد و جہد اور تجربے کے بعد قائم ہوتے ہیں اور اس کے افراد
کی طبیعت اور زندگی میں سرایت کرتے ہیں کوئی شخص
آسانی سے ان تمام موثرات کی تفصیل اور ان کی نشو و نما کو
بیان نہیں کر سکتا جن سے کسی قوم کی اخلاقی زندگی کی
تشکیل ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ یہ اخلاقی
زندگی ہر بچے کو ابتدا ہی سے اپنے اثر میں لے لیتی ہے۔ اگر
معاشرے کی عام اخلاقی حالت قابل اطمینان ہے تو ایک
نوخیز ہستی کی تربیت کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ وہ اس
ماحول میں زندگی بسر کرے اور اس کے اخلاقی اصولوں کو
جذب کر کے ان پر عمل کرنے لگے۔ یعنی ایک طرف تو ذاتی
مطالعے اور مبادلۂ خیالات کے ذریعے گھر میں اور مدرسے میں
ان اصولوں کو نظری طور پر سمجھے اور ان کے حسن و قبح پر غور
کرے اور دوسری طرف اپنے کردار میں ان کو عملی جامہ پہنائے۔
چونکہ بعض لوگوں میں فطری کمزوریوں یا ماحول کی خرابی
کی وجہ سے یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ اس منزل سے آگے

بڑھ کر معاشری معیار اخلاق کو ذاتی طور پر پرکھیں اور معاملات کے متعلق اپنے ضمیر کی روشنی میں آزادی سے فیصلہ کرسکیں ۔ اس لیے مدرسے کا یہی فرض ہے کہ ان کو معاشرے کے بہترین اخلاقی اصول اور عمل سے روشناس کرے اور ان کے کردار کو اخلاق کی معمولی سطح سے نیچے نہ گرنے دے ۔

لیکن اس صورت حال کو ہم اپنا مطمح نظر نہیں بنا سکتے ۔ ہمارے نزدیک وہ اخلاقی تربیت ہرگز مکمل نہیں جس کا مرکز ثقل دوسرے لوگوں کی راے اور ان کی خوشنودی ہو' جس میں انسان کے اپنے ضمیر کو کوئی دخل نہ ہو بلکہ ہر معاملے میں معاشری روایات اور تعصبات کی پیروی کی جاتی ہو ۔ تاریخ کے اوراق میں ہمیں جو مثالیں اعلیٰ‌ترین انسانوں کی' بالخصوص مذہبی رہنماؤں کی ملتی ہیں' ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت انسان کی ارتقاء کا کمال یہ ہے کہ انسان نہ صرف اپنی نفسانی خواہشات اور فوری اغراض کی کشمکش سے بلند ہو جائے بلکہ اس کے اندر اتنی قوت' اعتماد نفس اور بصیرت پیدا ہو جائے کہ اپنے نور باطن کو اپنا رہنما بنائے اور جب کوئی ایسا اہم اور نازک موقع آ پڑے کہ ضمیر کی آواز اور حق کا مقتضا معاشرے کے مطالبے کے خلاف ہو اور ضمیر کی پیروی کرنے میں ساری دنیا کی ناخوشی کا اندیشہ ہو تو انسان اپنے آرام و آسائش' دنیاوی اغراض اور معاشرے کی پسندیدگی کو ٹھکرا کر اپنے عقیدے پر عمل کرے اور اس راستے پر چلے جو اس کے نزدیک سیدھا اور صحیح ہے ۔ نفسیات' فلسفہ اور مذہب تینوں کی تعلیم یہی ہے گو ان میں سے ہر ایک اس حقیقت کے اظہار میں مختلف انداز بیان اور اصطلاحیں

استعمال کرتا ہے مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کی روح آزاد ہے اس کو اپنی بھلائی برائی کا اختیار ہے اور وہ خود اپنی قسمت کو بناتا یا بگاڑتا ہے - نفسیات کا نظریہ یہ ہے کہ ہر ذی حیات ہستی میں انفرادیت کی شان اور اپنی رہنمائی آپ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اس کی صحیح نشو و نما صرف اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب تمام تعلیمی تدابیر اور وسائل اور ماحول کے اثرات اس کی انفرادیت کو ظاہر ہونے کا موقع دیں اور اسے تقویت پہنچائیں - فلسفہ بھی کانٹ کی زبان سے اس خیال کی تصدیق ان الفاظ میں کرتا ہے -

"ہر انسان بجائے خود ایک مقصد ہے، محض ذریعہ نہیں ہے" -

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر ایسے نظام یا ادارے کو ناقص اور خلاف انصاف سمجھتا ہے جو افراد کو محض دوسرے لوگوں کے مقاصد اور اغراض کا آلۂ کار بنا دے - اس میں شک نہیں کہ ایک لحاظ سے ہر شخص ذریعے کا کام کرتا ہے - وہ ان مشترک اغراض کی تحصیل میں کوشاں ہوتا ہے جو معاشرے کی مادی یا ذہنی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے - لیکن اُس صورت حال کو ہم کسی طرح اخلاق کی رو سے جائز قرار نہیں دے سکتے جو مثلاً لاتعداد انسانوں کو محض کارخانوں کا مزدور بنادے اور ان کے تمام انسانی حقوق اور صلاحیتوں کو بالکل نظرانداز کر دے - اسی طرح تمام بڑے بڑے مذاہب نے مختلف پیرایوں میں یہ تعلیم دی ہے کہ انسانی

روح کو براہ راست اپنے خالق سے تعلق ھے اور انسان خود اپنے اختیاری افعال و اعمال سے اپنی روح کو عظمت اور بلندی کی طرف لے جاتا ھے یا ذلت اور پستی میں گرا دیتا ھے اس کو خارجی طاقتوں کے ھاتھ میں بےبس سمجھنا بہت بڑی غلطی ھے -

"ھم نے انسان کو بنایا اور اسے اختیار دیا کہ خواہ وہ (ھماری دی ھوئی نعمتوں کا) شکر ادا کرے (یعنی ان کو صحیح مصرف میں لائے) یا کفران نعمت کرے (یعنی ان کا غلط استعمال کر کے ان کو ضائع کردے)"

(قرآن شریف)

اگر ھم انسانی روح اور انسانی شخصیت کی اس قدر مطلق کو تسلیم کر لیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ھے کہ انسان پوری طرح آزاد اور تربیت یافتہ اسی وقت ھوتا ھے جب وہ اپنے اعمال کی پوری ذمہ‌داری خود قبول کرے اور اس کی سیرت اخلاقی کمال پر اس وقت پہنچتی ھے جب وہ اپنے اھم فرائض کو اپنے علم اور اپنی پسند سے انجام دے نہ اس وجہ سے کہ معاشرے کی نظر میں اچھا سمجھا جائے - ورنہ محض دوسروں کی تقلید میں یا ان کی خوشنودی کے خیال سے تو حیوان بھی بہت سے کام کرتے ھیں - بعض جانور مثلاً کتے، بندر، گھوڑے وغیرہ اس طرح سدھائے جاتے ھیں کہ وہ اپنی طبعی حرکات میں تبدیلی کر کے ایسے کام سیکھ جائیں جو انسان کے لیے مفید یا مرغوب ھوں لیکن اس "سدھانے" میں اور انسان کی "اخلاقی تربیت" میں بڑا فرق ھے - جانوروں کو اپنے ان کاموں کی غرض اور غائت سے کوئی سروکار

نہیں ہوتا، نہ وہ اخلاقاً ان کے نتائج کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بر خلاف اس کے انسان ایک مکلف اور ذمہ دار ہستی ہے اور جب تک اسے یہ بات حاصل نہ ہو کہ ضرورت کے وقت معاشرے کی بندشوں سے آزاد ہو کر کام کر سکے اس کی ذمہ داری کوئی معنی نہیں رکھتی -

تربیت کو معاشرے کی تقلید تک محدود رکھنے میں بہت بڑا عمرانی نقصان یہ ہے کہ نظام اخلاق میں ارتقاء اور اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی - تعلیم محض موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس کا یہ مقصد اعلیٰ فوت ہو جاتا ہے کہ وہ "حیات برتر" کی کفیل ہو - ہم نے اس کتاب میں برابر تعلیم کے اس جامد مفہوم کی مخالفت کی ہے جس کی رو سے مدرسے کا فرض محض اتنا ہے کہ فرد اور ماحول میں مطابقت پیدا کی جائے - اخلاقی تعلیم کی بحث میں بھی ہم اس جامد نقطۂ نظر کو قبول نہیں کر سکتے کہ تعلیم مروجہ اخلاق کو اپنا منتہائے نظر سمجھ کر طالبہ کو اسی کے لیے تیار کرے - اگر ابتدائے تمدن سے یہ خیال کارفرما ہوتا تو شاید آج تک انسان اپنی قدیم وحشیانہ حالت سے آگے نہ بڑھ سکتا -

اکثر قوموں اور جماعتوں پر ایسے زمانے گزرے ہیں کہ ان کی اخلاقی حالت بہت ذلیل ہوگئی تھی اور معاشرے نے خوبیوں کو برائیاں اور برائیوں کو خوبیاں سمجھ لیا تھا - ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں نظام تعلیم کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ اس معیار اخلاق کو بچوں اور نوجوانوں میں رائج کرے - معاشری اخلاق کی صحت اور اصلاح کی ضمانت بھی

ہے کہ افراد میں اپنے اور دوسروں کے اعمال کا محاسبہ کرنے کی قابلیت ہو اور وہ ہر مروجہ عقیدے اور اصول کو آنکھیں بند کر کے تسلیم نہ کر لیں - اگر افراد کے نفس سے یہ صلاحیت جاتی رہے اور معاشرے کی حالت بہت ابتر ہو تو اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی انقلاب آفرین شخصیت پیدا ہو جو دلیری سے کام کر کے موجودہ نظام کو تہ و بالا کر دے اور لوگوں کو بہتر معیار اور اعلیٰ تر قدروں سے روشناس کرے - تاریخ میں بارہا ایسا ہی ہوا ہے - حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے رومی سوسائٹی کی کیا حالت تھی ؟ سب لوگ دولت پرستی اور عیش پسندی میں مبتلا تھے، انسانوں میں مساوات اور ہمدردی باقی نہیں رہی تھی - لوگ قوت کو انصاف کا مرادف جانتے تھے - غریب ہونا انتہائی ذلت کا باعث تھا اور انسان کو اس کے انسانی حقوق سے محروم کر دیتا تھا - کیا اس مصلح اعظم نے ان خیالات اور حالات کے سامنے سر تسلیم کر دیا ؟ نہیں اس نے ہر قسم کی مخالفت کے باوجود اپنا انقلاب انگیز پیغام معاشرے کے سامنے پیش کیا اور اس فرض کے ادا کرنے میں نہ ذاتی مصیبتوں کی پروا کی نہ اپنے زمانے کے تعصبات اور عقائد کا پاس کیا اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم نظام اخلاق کو درہم برہم کر دے گی گویا "دیوانہ بکارگہ شیشہ گر رسید!" کا معاملہ ہو جائے گا - لیکن محض ان کی شخصیت اور بےخوف جد و جہد کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے ایک ایسے معیار اخلاق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جو مروجہ اخلاق سے کہیں بلند اور برتر تھا -

اسی طرح مہاتما بدھ نے اپنی سیدھی سادھی پاک صاف تعلیم ہندوستان میں پھیلائی اس وقت معاشرے کی اخلاقی حالت بہت خراب ہو چکی تھی - مذہب مہمل رسوم میں مبتلا ہو کر اپنی معنویت کھو چکا تھا اور لوگ ذات پات کی بندشوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ انسان کی بطور انسان کے نہ کوئی حیثیت تھی نہ حقوق - اس زمانے میں بدھ کی تعلیم بہت خطرناک معلوم ہوتی ہوگی اور کہنے والوں نے یقیناً یہ کہا ہوگا کہ اگر ایسے خیالات دنیا میں پھیل گئے تو نظام تمدن برباد ہو جائے گا - لیکن انہوں نے اپنے نور باطن کی ہدایت پر عمل کیا اور معاشرے کے اخلاق میں انقلاب کر دکھایا -

اسی قسم کے اثر کی سب سے زبردست مثال عرب میں حضرت محمد رسول اللہ کی ذات میں نظر آتی ہے جنھوں نے بیس پچیس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی قوم کی کایا پلٹ دی جس کے اندر ہر قسم کی اخلاقی خرابیاں اور عیوب صدیوں سے رچ گئے تھے - اس کی حالت کا جیتا جاگتا نقشہ حالی نے اپنے مسدس میں کھینچا ہے - اس کی زندگی کا شائد ہی کوئی اصول یا عقیدہ ایسا ہو جو ناانصافی' بد دیانتی اور بد اخلاقی پر مبنی نہ ہو - جب اس قوم کے سامنے حضرت محمد نے اپنی پاک تعلیم پیش کی تو لوگوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا دین و مذہب' تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں اور انہوں نے انتہائی شدت کے ساتھ اس نئی تعلیم کی مخالفت کی - لیکن پیمبر اور مصلح کا کام ہی یہ ہے کہ مخالفتوں کا مقابلہ کرے اور لوگوں کو راہ دکھائے

خواہ اسے اس فرض کی ادائگی میں اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پڑے - چنانچہ حضرت محمد نے ایسا ہی کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جنگجو قبیلے ایک زبردست منظم اور بااخلاق قوم بن گئے - ان تمام مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص جو کسی قوم کے لیے مصلح بن کر آتا ہے محض مروجہ اخلاق کی اشاعت پر قناعت نہیں کر سکتا -

اس سے کم درجے پر یہی فرض ہر معلم پر عائد ہوتا ہے - اس کو چاہیے کہ طلبہ میں ایسی صلاحیت پیدا کرے کہ وہ ضرورت کے وقت معاشرے کی قیود اور بندشوں سے آزاد ہو کر راے عامہ کے خلاف ایسے کام کر سکیں جو ان کے نزدیک صحیح ہوں - یہ سچ ہے کہ عام لوگوں کو ایسے مواقع آئے دن پیش نہیں آتے اور ممکن ہے بعض کو کبھی ایسا موقع پیش ہی نہ آئے لیکن یہ اخلاقی جرأت انسانی سیرت کا اعلیٰ زیور ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص انسانیت کی انتہائی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا - مندرجۂ بالا مثالیں ایسے زمانوں کی ہیں جن میں معاشرے کی اخلاقی حالت خاص طور پر خراب ہو گئی تھی لیکن جو فرض وہاں ان مصلحین اعظم کا تھا وہ آج کل بھی ہر ملک اور قوم میں معلموں اور مصلحوں پر عائد ہوتا ہے - دنیا میں کوئی معاشرہ ایسا نہیں جس میں اصلاح کی گنجائش نہ ہو' جس میں ایسے ادارے اور رسوم و قوانین نہ پائے جائیں جو ہر ذی حس اور انصاف پسند آدمی کے نزدیک قابل اعتراض نہیں - لہذا ہر جماعت میں ایسے دل و دماغ کے لوگوں کی ضرورت ہے جو اس کے

نظام اخلاق کی تنقید اور احتساب کرسکیں اور ان تمام رسوم اور قوانین کے خلاف بغاوت کریں جو ان کے نزدیک افراد اور معاشرے کے لیے مضر اور انسانیت کے منافی ہوں اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم دنیا کے مختلف معاشروں کے نام لے کر یہ بتائیں کہ وہاں ایسے لوگوں کی کس قدر ضرورت ہے جو آزادی کے ساتھ اپنی عقل و ضمیر کے مطابق کام کریں اور لوگوں کی نکتہ‌چینی اور ملامت کی پروا نہ کریں - مثال کے طور پر اگر ہم اپنے ہی ملک کی حالت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی خرابیاں موجود ہیں اور اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے - معاشرے میں عورتوں کا مرتبہ اور ان کی تعلیم' امیروں غریبوں کے باہمی تعلقات' محنت اور محنت کرنے والوں کے ساتھ تعلیم یافتہ طبقے کا رویہ' دولت کا بےجا استعمال' کاروباری دیانت کی کمی' تعصبات اور توہم پرستی' غرض ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو ہمارے قوم کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں - جب تک نئی تعلیم یافتہ نسلوں میں اتنی اخلاقی جرأت نہ ہو کہ وہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کریں اور لوگوں کی مخالفت اور ہنسی کو خاطر میں نہ لائیں عمرانی اصلاح ممکن نہیں - اس وجہ سے معلم کا ایک نہایت اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں اخلاقی جرأت پیدا کرے

باب دوم

اخلاق اور عمل

اب اخلاقی تربیت کا مسئلہ بحیثیت مجموعی واضح ہوگیا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اخلاق کی حدود کس قدر وسیع ہیں اور ایک نوخیز شخصیت کو اخلاقی سیرت کی تحصیل و تکمیل میں کن منازل سے گزرنا پڑتا ہے - ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ ہے کہ مدرسوں میں اخلاقی تربیت کے کیا وسائل اور ذرائع موجود ہیں اور ان سے کس طرح کام لینا چاہیے - اس بحث کے آغاز ہی میں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اخلاقی سیرت محض زبانی تعلیم و تلقین کے ذریعے مستحکم نہیں ہو سکتی - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی قسم کی تعلیم و تربیت بھی جس کا انحصار لفظی تعلیم و تعلم پر ہو موثر اور کامیاب نہیں ہو سکتی - جسم کی تربیت کے متعلق تو یہ بالکل ایک بدیہی امر ہے کہ جب تک ہم ورزش نہ کریں اور جسمانی صحت کو قائم رکھنے کے لیے مختلف مناسب ذرائع اور وسائل اختیار نہ کریں جسمانی نشو و نما کا امکان ہی نہیں خواہ ہمیں علم

حفظانِ صحت سے کتنی ہی گہری اور وسیع واقفیت ہو۔ صحت کو قائم رکھنے کا علم یقیناً ضروری اور مفید ہے لیکن بجائے خود کافی نہیں جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔ یہی حال ذہنی تعلیم کا ہے۔ جب تک علم، عمل کی کسوٹی پر نہ کسا جائے اور قوت سے فعل میں نہ آئے وہ ایک جسدِ بےجان ہے معلومات کا ایک جامد اور بےروح مجموعہ ہے۔ جس سے انسان مطلق فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اخلاقی تربیت پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ بلکہ اخلاق تو نام ہی عمل کا ہے۔ اس لئے یہاں یہ بات اور بھی زیادہ وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بچوں کو بہترین اخلاقی اصول اور عقائد کا یاد کرا دینا اور سمجھا دینا اس بات کی ضمانت نہیں کہ وہ ان پر عمل بھی کریں گے۔ واقفیت اور سمجھ بجائے خود بہت اچھی چیزیں ہیں اور بالغ و راشد ہو جانے کے بعد انسان کو ہر کام سوچ سمجھ کر اس کی بھلائی برائی دیکھ بھال کر کرنا چاہیے ورنہ اس کی حالت بالکل ایک مشین کی سی ہوگی۔ لیکن محض واقفیت کافی نہیں۔ اس کے ساتھ قوتِ عمل کی بھی ضرورت ہے، جو مشق یا عادت اور جسم اور دماغ پر قابو حاصل کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اور جوش جذبات کی بھی۔ جب تک یہ تینوں عناصر جمع نہ ہوں انسان ان طرح طرح کی ترغیبوں اور تحریصوں پر قابو نہیں پاسکتا جو اس کو راہِ راست سے برگشتہ کر دیتی ہیں اور اس کی سیرت اخلاقی اصول و اقدار کے مطابق تشکیل نہیں پاسکتی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ خیالات میں بجائے خود یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ افعال کو اخلاق کے سانچے میں

ڈال دیں - اگر ہم کسی بچے کو اخلاق اور نیکی اور راست‌بازی کے متعلق چند باتیں بتادیں یا ایمانداری، سچائی، ہمدردی کی خوبیاں اس کے ذہن نشین کر دیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خود بخود بااخلاق نیک اور راست‌باز بن جائے گا - یہ صفات اس کی سیرت کا جزو صرف اس صورت میں ہوسکتی ہیں جب اس کو روزمرہ کی زندگی میں اس کی مشق کرائی جائے کہ وہ بے‌ایمانی سے پرہیز کرے اور ایمان‌داری سے کام لے - جھوٹ سے بچے اور سچ بولے - اپنے دوستوں اور عزیزوں اور ضرورت‌مندوں کے ساتھ ہمدردی کرے اور کسی کا دل نہ دکھائے - واقعہ یہ ہے کہ ذہنی تربیت کی طرح اخلاقی تربیت میں ذاتی اور بلاواسطہ تجربے اور ارادے کی اہمیت بہت زیادہ ہے - اخلاق کے دائرے میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم محض دوسروں کے تجربے سے سیکھ سکتے ہیں - یہاں قدم قدم پر خود محسوس کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے - بے شک والدین، اُستاد اور معاشرے کے دوسرے افراد بچوں اور نوجوانوں کو مختلف طریقوں سے اپنے تجربوں کے نتائج سے آگاہ کرتے رہتے ہیں - لیکن جب انہیں خود سبق‌آموز اخلاقی تجربے حاصل نہ ہوں وہ ان کی نصیحتوں اور مشوروں کے معنی سمجھ ہی نہیں سکتے - یہ سچ ہے کہ وہ ہر قسم کے تجربے خود حاصل نہیں کرسکتے لیکن کسی اخلاقی اصول کی تہ تک پہنچنے کے لیے اُنہیں اس نوعیت کے کچھ نہ کچھ تجربے ضرور ہونے چاہئیں تاکہ وہ ان کی بنا پر دوسروں کے تجربوں اور ان کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں کو معنی پہنا سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں -

اس کی توضیح ایک مثال سے ہوسکتی ہے - فرض کیجئے
آپ بحیثیت ایک معلم کے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نوجوان
طالب علم کو وطن کی محبت اور وفاداری کا سبق سکھائیں
اور یہ اصول اس کے ذہن نشین کریں کہ باہمی ہمدردی اور
اشتراک عمل کے بغیر کسی قوم کا کام اچھی طرح نہیں چل
سکتا - اس کا ایک پرانا اور مروجہ اصول تو یہ ہے کہ آپ اس
موضوع پر لکچر دیں اور نظری طور پر یہ ثابت کر دکھائیں کہ
محبت اور ہمدردی نہایت ضروری صفات ہیں جن کا اظہار
ہر فرد کے عمل میں اور افراد کے باہمی تعلقات میں ہونا
چاہیئے - اگر طالب علم کی ذہنی نشو و نما اس حد تک
ہو چکی ہے کہ وہ اس بحث اور ان دلائل کو سمجھ سکتا ہے
تو ممکن ہے یہ باتیں اس پر اثر کریں اور وہ اس اصول پر
عمل کرنے کی کوشش کرے - لیکن اس کوشش میں کامیابی
بہت مشکل ہے - اول تو جب تک اس میں یہ صلاحیت نہ
ہو کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ان مطالب کی تعبیر اپنی
ذہنی اور عملی زندگی میں کر سکے وہ ان کی پوری اہمیت کو
سمجھ ہی نہیں سکتا - یعنی اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوم
اور ملک اور اشتراک عمل وغیرہ کا تصور کرنے کے لئے اپنے گھر اور
مدرسے کی زندگی اور اس کے مشاغل اور تعلقات کو پیش نظر
رکھے - اور ان چیزوں کے اندر سے ان تصورات کی جھلک دکھائی
دے - علاوہ بریں یہ اشتراک عمل کا اصول اس وقت تک اس
کی عملی زندگی پر محیط نہیں ہوگا جب تک اسے بچپن اور
جوانی کے زمانے میں چھوٹے پیمانے پر اس پر عمل کرنے کا موقع
نہ ملے - لہذا مندرجۂ بالا مثال میں معلم کو پوری کامیابی

اسی صورت میں حاصل ہوتی جب بچوں کی خانگی اور مدرسے کی زندگی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ انھیں ہر روز امداد باھمی مبادلۂ خیالات اور تجربات میں شرکت کے مواقع ملیں اور عملاً ان کے دل میں اس جماعت یا گروہ کے ساتھ وفاداری کا احساس پیدا ہو جس کے وہ رکن ہوں اور جس کی رکنیت کی وجہ سے انھیں بہت سے حقوق اور اختیارات حاصل ہوتے ہیں - اگر ابتدائی زندگی میں انہیں مسلسل اس قسم کے واقعی تجربے حاصل ہوں گے تو جب وہ آئندہ بڑی جماعتوں کے رکن بنیں گے تو وہ قومیت اور شہریت کا صحیح مفہوم سمجھیں گے اور اس رشتے کی اہمیت کو پہنچانیں گے جو فرد اور جماعت میں ربط پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھ چکے ہوں گے کہ ان کی اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی کامیابی اور قیام کے لیے ایسے ہی تعلقات کی ضرورت ہے - علاوہ بریں وہ ذہنی اور جسمانی عادتیں جو اس اجتماعی زندگی کے بسر کرنے سے قائم ہوں گی آگے چل کر بہت کام آئیں گی اور ان کے راستے میں یہ رکاوٹ حائل نہ ہوگی جو عام طور پر پیش آتی ہے کہ ”دل تو آمادہ ہے لیکن جسم میں سکت نہیں“ -

اس مثال سے ایک اور تعلیمی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کو ایسے اخلاقی اصول اور قوانین نہیں بتانے چاہییں جن کی ضرورت انہیں ابھی اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوئی اور جن کا تعلق اُن حالات اور مواقع سے ہے جن سے بچوں کو سابقہ نہیں پڑا - بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر مدرسے کو ایک اثر آفریں اخلاقی ماحول بنانا مقصود ہے تو اس میں بچوں کے لیے ایسے عملی مواقع

اور وسائل مہیا کرنے چاہئیں جن میں اخلاقی اصول و قوانین کی ضرورت پڑے اور نوعمر طالب علم بعض صورتوں میں اُن کو نظری طور پر سمجھنے سے پہلے ہی ان پر عمل کرنے لگیں اور اس طرح ان میں اخلاقی عادتیں پختہ ہو جائیں - بعض ماہرین تعلیم اور ارباب فکر کا یہ خیال ہے کہ بچوں کی مطلق کوئی عادتیں ڈالنی ہی نہیں چاہئیں - چنانچہ روسو (Rousseau) کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے کہ :—

"امیل (Emile) صرف یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ وہ کوئی عادت نہ ڈالے" -

لیکن یہ خیال جو در اصل بعض خاص حالات کے خلاف ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوا تھا، غلط ہے اور نفسیات اطفال کا علم اس کی تائید نہیں کرتا - بچوں کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ اوائل عمر ہی میں مفید اور عمدہ عادتیں سیکھیں جو آئندہ چل کر ان کے لیے سہولت کا باعث ہوں - اس معاملے میں مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمز (William James) کی رائے زیادہ صائب ہے - وہ کہتا ہے کہ عمدہ عادتوں کو بطور ایک سرمائے کے سمجھنا چاہیے - کہ جب ہم اسے جمع کر لیتے ہیں تو اس کا سود ہمیں عمر بھر ملتا رہتا ہے ! ان عادتوں کی وجہ سے انسان اپنے روزمرہ کے معمول اور معینہ فرائض کو بغیر کسی دقت یا تامل کے پورا کر لیتا ہے اور جب کوئی نازک یا کٹھن موقع آکر پڑتا ہے تو وہ ان عادتوں کے بل پر

دیکھو ان کی مشہور تعلیمی تصنیف "Talks to Teachers" معلموں سے دو دو باتیں -

اکثر بڑے بڑے کام کر جاتا ہے اور عارضی اور وقتی تحریکات پر
غالب آ جاتا ہے اس لیے موجودہ زمانے کے اکثر ماہرین تعلیم
اس امر پر متفق ہیں کہ مدرسے کو ایک خوشگوار ماحول اور
خوش اسلوب جماعت کی شکل میں مرتب کرنا چاہیے
جس میں حقوق اور فرائض کی باقاعدہ تقسیم ہو، جس کو
تمام اراکین جماعت خوشی کے ساتھ قبول کریں، اور جماعتی
زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے فرائض محنت اور شوق سے
ادا کریں اور اپنے حقوق سے جائز طور پر فائدہ اٹھائیں - اس
طرح وہ قدرتی طور پر اخلاقی مسائل اور مشکلات سے دوچار
ہوں گے اور خود بخود ان کو حل کرنے کی کوشش کریں گے - ان
کی کامیابی اور ناکامی ان کے لیے معلم کا کام دے گی اور وہ ایک
مصروف، عملی زندگی کے دوران میں بعض اہم‌ترین اخلاقی
اصول سیکھ لیں گے - بہت سے جدید تعلیمی تجربے مثلاً
مس ہیلن پارکھرسٹ، (Helen Parkhurst) کا طریقہ ڈالٹن
(Dalton Plan) اور میڈم منٹسوری (Montessori) کے
مدرسے اسی اصول پر قائم ہیں کہ طلبہ میں احساس، فرض
اور انفرادی اور اجتماعی قوت عمل اسی وقت پیدا ہو سکتی
ہے جب انہیں ابتدا ہی سے چھوٹے چھوٹے فرائض کی
بجاآوری کی عادت ڈالی جائے جن کو وہ اپنی مرضی اور
خوشی سے بغیر بیرونی مداخلت کے انجام دے سکیں - جن
مدرسوں میں تقسیم فرائض کا یہ تجربہ کیا گیا ہے وہاں
ثابت ہوا ہے کہ اسی طرح طلبہ میں نہایت مفید اخلاقی
عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو انہیں عمر بھر کام دیتی ہیں
بشرطیکہ معلم اپنی مثال اور شخصیت کے اثر سے ان میں جوش

اور خلوص کو قائم رکھے - جہاں کہیں منصوبی طریقہ (Project Method) استعمال کیا گیا ہے وہاں بھی یہی تجربہ ہوا ہے کہ اس سے نہ صرف ذہنی بیداری اور قوت اجتہاد پیدا ہوتی ہے بلکہ شخصی ذمہ‌داری اور امداد باہمی کا احساس بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے جو اخلاقی سیرت کی تکمیل کے لیے بہت ضروری ہے - لہذا معلوم ہوا کہ اخلاقی تربیت کا سب سے موثر اور اہم وسیلہ یہ ہے کہ مدرسے کی معاشری زندگی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ طلبہ عملاً ان تجربوں کو حاصل کریں جن پر اخلاق کا انحصار ہے -

بعض ماہرین تعلیم بالخصوص امریکا کے تعلیمی مفکرین کا خیال ہے کہ اخلاقی اور معاشری تربیت بالکل ہم معنی ہیں اور ان دونوں کے حدود ایک ہی ہیں - یعنی اگر ہم کسی شخص کو معاشری زندگی کے تمام فرائض سکھا دیں اور اسے ان کی ادائگی کے لیے تیار کر دیں تو اس کی اخلاقی تربیت بھی مکمل ہو جائے گی - ہمیں اس نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق نہیں - یہ مانا کہ اخلاقی تربیت کا ایک بہت بڑا حصہ ان حقوق و فرائض پر مشتمل ہے جو معاشری زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اخلاق کا دائرہ ان تعلقات کی حدود سے بھی زیادہ وسیع ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں - مشرق کے معلمین اخلاق نے ان حقوق کو جو کسی فرد پر عائد ہوتے ہیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے - اول حقوق اللہ یعنی وہ حقوق جو خالق کو اپنے بندوں پر حاصل ہیں اور جن کو پہچانے اور ادا کیے بغیر انسان اپنی پوری حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا -

دوسرے حقوق العباد یعنی وہ حقوق جو ہمارے ابنائے جنس کو ہم پر حاصل ہیں اور جن کی وجہ سے تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھ ایک رشتے میں مربوط ہیں - تیسرے حقوق النفس یعنی وہ حقوق جو خود ہمارے نفس کو ہم پر حاصل ہیں - انسان کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ تینوں قسم کے حقوق کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرے - وہ لوگ جو اخلاقی تربیت کو معاشری تربیت کا مرادف قرار دیتے ہیں محض حقوق العباد پر زور دیتے ہیں باقی دونوں قسموں کے حقوق کی پوری اہمیت تسلیم نہیں کرتے - ممکن ہے کہ نظری طور پر فلسفہ ان تینوں کو ایک ثابت کر دے اور یہ واقعہ یہی ہے کہ یہ تمام حقوق و فرائض ایک دوسرے سے وابستہ اور مربوط ہیں' بالکل علحدہ اور بےتعلق نہیں - لیکن عمل کے اعتبار سے ان کی نوعیت میں فرق ہے - لہذا یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اپنے معاشری فرائض ادا کرتا ہو لیکن حقوق اللہ اور حقوق نفس کی طرف سے بالکل غافل ہو ؟ مثلاً وہ معاشری خدمت انجام دے' ہمسایوں اور شہر والوں کے حقوق ادا کرے - لیکن ان قدروں سے بےاعتنائی برتے جن کا حامل مذہب ہے - یا وہ اپنی جسمانی صحت اور تہذیب نفس کی مطلق پروا نہ کرے اور اسے اس کا احساس نہ ہو کہ خود اس کی ذات میں اعلی درجے کی صلاحیتیں موجود ہیں جن کو قوت سے فعل میں لانا اس کا فرض ہے - علاوہ بریں جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اخلاق کی تکمیل کے لیے محض معاشری محرکات اور موانعات کافی نہیں یعنی کسی شخص کو اچھے کام محض اس لیے نہیں کرنے چاہییں کہ معاشرے

کے فرائض اور اخلاقی اصول اس کے متقاضی ہیں۔ نہ برے کاموں سے صرف اس وجہ سے پرہیز کرنا چاہیے کہ وہ معاشری اخلاق کے خلاف ہوں گے۔ مکمل اخلاق کا مقتضا یہ ہے کہ جب انسان بالکل تنہا ہو یعنی سوائے اپنی ذات یا اپنے ضمیر کے اس کا کوئی نگراں نہ ہو اس وقت بھی اس کے خیالات اور جذبات میں پاکیزگی پائی جائے اور وہ خیال میں بھی برے افعال کا مرتکب نہ ہو۔ وہ اس بات کو محسوس کرے کہ ایمان، دیانت داری، راستی اور پاکبازی نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ ان کی وجہ سے معاشری کار و بار اچھی طرح چلتے ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کے بغیر وہ اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا اور عزت نفس کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ محبت اور عبودیت کے وہ جذبات رکھے جو اس کی مختصر اور بظاہر بےمعنی زندگی کو ابدی اور روحانی قدروں سے وابستہ کرتے ہیں اور اس کا رشتہ سرچشمۂ حیات سے جوڑتے ہیں، اگرچہ ان کا اثر براہ راست معاشری تعلقات پر نہیں پڑتا اور نہ ان کی جڑ معاشری زندگی میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اخلاق اور مذہب کی حدیں آکر مل جاتی ہیں اور انسان اپنے اعمال اور خیالات کا محاسبہ محض معاشری اخلاق کی بنا پر نہیں کرتا بلکہ احترام ذات اور قانون الٰہی کو اپنا رہبر بنا کر ان کی اصلاح کرتا ہے اور جہاں انسانی قانون کا دسترس نہیں، وہاں بھی اپنے آپ کو ایک اعلیٰ تر قانون کا پابند جانتا ہے۔

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے بعد ہمیں اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اخلاقی تربیت کا بہت بڑا حصہ معاشری زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور طلبہ کی تربیت اس طرح ہو سکتی ہے کہ وہ مدرسے کی معاشری زندگی، اس کی کشمکش اور جد و جہد میں پوری طرح حصہ لیں اور جو عملی مواقع وہاں بہم پہنچائے گئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھائیں - جس تربیت کی بنیاد بچوں کے گوناگوں معاشری تجربات پر نہ رکھی جائے گی اس کا اثر بہت جلد زائل ہو جائے گا اور اس سے آئندہ زندگی کے معاملات میں کام لینا ممکن نہ ہوگا - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اخلاق اور معاشرت کے قریبی تعلق سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

" اخلاقی تربیت کے متعلق ہمارے جو تصورات اب تک رہے ہیں وہ سب بہت تنگ اور محدود تھے اور ان کی بنا زیادہ‌تر رسم و دستور پر تھی اور ان کا تعلق محض معاشرت کی حالت مرض سے تھا - ہم نے اخلاق کے مفہوم کو چند مخصوص اعمال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے جن کو ہم " نیکیاں " کہتے ہیں اور انہیں باقی تمام مشاغل اور کاروبار سے بالکل علحدہ سمجھتے ہیں - یعنی اخلاقی اعمال، معاشری ماحول سے جدا کر کے دیکھے جاتے ہیں...... حالانکہ در حقیقت انسانی زندگی میں سوائے اس کے اور کوئی اخلاقی محرکات اور اخلاقی قوتیں نہیں ہیں کہ انسان میں معاشری عقل ہو، یعنی معاشری معاملات اور حالات کا مشاہدہ کرنے اور ان کو سمجھنے کی قابلیت، اور معاشری قوت ہو، یعنی ضبط نفس کی

تربیت یافتہ صلاحیتیں جو معاشری اغراض و مقاصد کے حاصل کرنے میں استعمال ہو سکیں" - ۱

لیکن مدرسے کو اثر آفریں اخلاقی ماحول بنانے کے لیے ایک شرط نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا اور بیرونی دنیا کا تعلق برابر قائم رہے تاکہ وہ ایک قدرتی ماحول کی شکل اختیار کرے نہ کہ ایک بالکل مصنوعی ماحول کی جس میں بچے گرم خانے کے پودوں کی طرح نشو و نما پائیں - مدرسہ ایک ادارہ ہے جس کو معاشرے نے اپنی حیات اجتماعی کی بقا اور ترقی کے لیے قائم کیا ہے تاکہ جن اصولوں اور قدروں کو وہ عزیز رکھتی ہے اور اہم سمجھتی ہے وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کی جائیں - اسی وجہ سے مدرسے پر بہت بڑی اخلاقی ذمہ‌داری عائد ہوتی ہے - جس سے وہ اس وقت تک عہدہ‌برآ نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اندرونی تنظیم انہیں اصولوں کے ماتحت نہ ہو جو بیرونی دنیا میں کارفرما ہیں - اسے اپنے نوعمر طلبہ میں ایسے معاشری عادات اور جذبات پیدا کرنی چاہییں کہ جب وہ اس چھوٹے سے دائرے سے باہر نکل کر معاشرے کی زندگی کے وسیع میدان میں قدم رکھیں تو انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں - جہاں کے دستور و قوانین بالکل مختلف ہیں - اس سے یہ مراد نہیں کہ مدرسے میں معاشری زندگی کے خراب عناصر کو بھی جگہ دی جائے مثلاً افراد اور جماعتوں کی باہمی نزاع اور مسابقت کی حد سے

---

۱ - Education Essays صفحہ ۵۷—۵۸ -

بڑھتی ہوئی حوائش ہو جس کا آج کل دور دورہ ہے - اس لیے کہ جیسا ہم کتاب کے آغاز ہی میں بتا چکے ہیں، مدرسہ معاشرے کا ایک چھوٹا سا نمونہ تو ضرور ہے لیکن ایک عمدہ اور منتخب نمونہ نہیں ہے - لہذا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو بہترین معاشری حالات بیرونی دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ مدرسے میں پیدا کریں - اگر ہمارے مدرسے زندگی کی کشمکش اور اس کے رسم و آئین سے بے تعلق اور ناواقف رہیں گے، جیسے وہ آج کل بالعموم رہتے ہیں، تو نہ ان میں بچوں کی مکمل ذہنی تربیت ہو سکے گی نہ اخلاقی - ان کے پیش نظر جو مقاصد ہیں ان کا مطلب اور مفہوم واضح نہیں ہو سکے گا کیونکہ بچوں میں ہم جن قوتوں کو نشو و نما دینا چاہتے ہیں ان کو آئندہ معاشری زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال ہونا ہے - اگر ان قوتوں کی نشو و نما ایک مصنوعی ماحول میں ہو اور ان میں اور زندگی کے واقعی مشاغل میں ربط نہ پیدا کیا جائے تو ہم کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ مدرسے کی تربیت اس کے باہر بھی کام آئے گی؟ اس لیے مدرسے کے مشاغل کی اخلاقی قدر کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں معاشرے کے مشاغل کو معیار قرار دینا چاہیے - اور انہیں کو پیش نظر رکھ کر نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کا تعین کرنا چاہیے - یعنی مدرسے کو ایک زندہ معاشری ادارہ بنانا چاہیے جس میں مفید عادتیں اور رجحانات تربیت پائیں جس طرح تیرنا سیکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ آدمی پانی میں کود پڑے اور ہاتھ پاؤں مارے اسی طرح اخلاقی سیرت کی تعمیر بھی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ کچھ

میں اور مدرسے میں بچہ ایسے کاموں میں مشغول رہے جو اخلاقی اور عمرانی اہمیت رکھتے ہوں - نہ تیرنا ہوا میں تیراکی کے کرتب دکھانے اور اس کے گر یاد کرنے سے آتا ہے نہ اخلاقی سیرت کی تکمیل اس زبانی اور نظری تعلیم سے ہو سکتی ہے - جو طالبہ کی روزمرہ کی زندگی سے بالکل بے تعلق اور بے ربط ہو - "مدرسہ اس وقت تک طلبہ کو معاشری زندگی کے لیے تیار نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے گرد و پیش کے خاص خاص اہم ترین معاشری حالات کا نمونہ اپنے اندر مہیا نہ کر لے" کیونکہ کسی کام کے لیے تیاری کا موثر ذریعہ یہی ہے کہ اس کام میں عملاً شرکت کی جائے - اس لیے مدرسۂ جدید کا تمام نظام اس طرح مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے طالبہ کے محرکات عمل معاشری ہوں اور ان کے پڑھنے' لکھنے' کھیلنے' کودنے غرض تمام مشاغل میں امداد باہمی اور اشتراک عمل کا وہی اصول کارفرما ہو جس پر تمدنی زندگی کا دارمدار ہے -

ہم اس بات پر بار بار زور دے چکے ہیں کہ تعلیم کے ہر شعبے میں ہمیں اس وحدت کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو طالبہ کے نفس کی خصوصیت ہے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے مربوط اور سابقہ رکھتی ہے - ہم ان کی شخصیت کو عملاً دماغی' جسمانی معاشری اور اخلاقی شعبوں میں تقسیم نہیں کر سکتے - وہ ہر کام اور ہر بات میں اپنی پوری شخصیت کا اظہار کرتا ہے' گو یہ ممکن ہے کہ ایک خاص وقت میں اس کا کوئی ایک پہلو مثلاً عقلی یا اخلاقی پہلو زیادہ نمایاں ہو اور باقی سب پوری

طرح ظاہر نہ ہوں - اس لیے اس کی شخصیت کی مکمل، متناسب اور ہم‌آہنگ تربیت اس وقت ہو سکتی ہے جب اس کے ماحول کے تمام اثرات کا رجحان ایک ہی ہو، جب مدرسہ اور گھر دونوں اس کو ایک ہی معیار اخلاق کے مطابق تعلیم دیں اور تعلیمی زندگی کا ہر پہلو، مطالعہ، کھیل نصاب تعلیم، ضبط و تادیب اپنی اپنی جگہ پر اس کی سیرت کی صحیح تشکیل میں حصہ لے - مدرسے کے اس مجموعی نظام اور طلبہ کی معاشری زندگی کا اثر ان کی سیرت پر نہایت زبردست اور دیرپا ہوتا ہے - بشرطیکہ اس کے تمام عناصر یعنی اُستادوں کی سیرت اور شخصیت ان کا طرز تعلیم مدرسے کے تعلیمی مقاصد ان کی عام فضا یہ سب چیزیں بچوں کی اخلاقی تربیت میں مدد دیں اور ان کی ذہنی تعلیم ان کی روزمرہ کی زندگی کا جزو بنا دی جائے، اس سے اس طرح علحدہ نہ رکھی جائے جیسے اسے اخلاقی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں - ہم ابھی یہ بحث کریں گے کہ ان تمام عناصر کو اخلاقی تربیت میں کہاں تک دخل ہے - لیکن اس بحث کی ضرورت اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم اخلاق کے مذکورۂ بالا مفہوم ذہن میں رکھیں - اخلاق کا اطلاق ان تمام کاموں اور باتوں پر ہوتا ہے جو ہم روز کرتے رہتے ہیں جس طرح معاشری زندگی میں ایک بالغ آدمی کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں - اسی طرح مدرسے میں بچے کی مختلف حیثیتیں ہیں - اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ ان تمام حیثیتوں میں اپنے فرائض کو عمدگی کے ساتھ اصول اخلاق کے مطابق ادا کرے تو نہ صرف اس کے جذبات کی تربیت ضروری

ہے بلکہ اس کے جسم اور دماغ اور عادات سب کی نشو و نما
ایسی ہم آہنگی کے ساتھ کرنی چاہیے کہ وہ اس کی زندگی کے
انتہائی اخلاقی مقصد میں معین ہوں - اس لحاظ سے ایک
طالب علم کو تاریخ' ادب یا سائنس کی مناسب تعلیم دینا '
اس کی طبیعت میں فنون لطیفہ کا ذوق پیدا کرنا ' اسے علمی
تحقیقات اور اختراع کا شوق دلانا اور اس کے طریقے سکھانا '
مادری زبان یا غیر زبانیں پڑھانا جن کے ذریعے سے وہ لوگوں کے
خیالات اور جذبات خود سمجھ سکے اور اپنے خیالات دوسروں کو
سمجھا سکے' اس کی جسمانی نگہداشت کا اہتمام کرنا '
اس کے آنکھ اور ہاتھ کی اس طرح تربیت کرنا کہ وہ اپنے
اندرونی جذبات اور میلانات کو کسی مرئی شکل میں ظاہر
کر سکے' اس کو محنت' کوشش اور امداد باہمی کی عادتیں
سکھانا ' یہ سب وسیع معنی میں اخلاقی تربیت کے اجزا
ہیں بشرطیکہ بچہ ان تمام صلاحیتوں کو اس طرح استعمال
کرے کہ ان سے نہ صرف اس کی ذات کو فائدہ پہنچے بلکہ
عمرانی مقاصد میں بھی امداد ملے - اگر مدرسہ اپنے ہر کام میں
اخلاقی مقصد کو مقدم رکھے گا تو وہ طلبہ کی شخصیت کو
مستقل طور پر جیسا چاہیے متاثر کر سکے گا -

باب سوم

عقلی اور اخلاقی تربیت کا تعلق

مدرسے کی اخلاقی تنظیم کے معاملے میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم، عقل اور اخلاق میں کیا تعلق ہے اور عقلی تربیت کس طرح اخلاقی تربیت میں معین ہو سکتی ہے۔ اس مسئلے

عقل اور اخلاق کا تعلق

میں ارباب فکر کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ مثلاً افلاطون، کانٹ وغیرہ کا خیال ہے کہ عقل ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی بصیرت پیدا ہوتی ہے اور عقل ہی اخلاقی افعال کی محرک ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے بعض حکما کا خیال ہے کہ انسان عقل کی بھول بھلیاں میں پڑ کر اکثر سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے اور اس قوت کو دوسروں کے نقصان اور تخریب کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بعض نے عقل اور وجدان یا عقل اور عشق کو متضاد ٹھہراکر انسان کو فریب خرد سے متنبہ کیا ہے۔ چنانچہ منجملہ اور بہت سے مشرقی شعراء اور فلسفیوں کے اقبال نے بھی اپنے کلام میں جا بجا اس مضمون کو ادا کیا ہے نقش فرنگ [1] میں ''پیام'' کے عنوان سے وہ

---

[1] ''پیام مشرق'' کا ایک حصہ۔

دانایان فرنگ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :—

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتارتر است
برق را این بجگر می‌زند آن رام کند
عشق از عقل فسون پیشہ جگرداتر است
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
آتش اندوختۂ دل ز کف انداختۂ
آہ زان نقد گران مایہ کہ در باختہ!

علاوہ ان فلسفیانہ خیالات سے عام لوگوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ عقل اور اخلاق ایک دوسرے کی ضد نہیں تو کم از کم ایک دوسرے سے بےتعلق ضرور ہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ روزمرہ کے معاملات میں دانش‌مندی اور تدبر کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے اور اخلاق کا کچھ اور کم از کم نظری طور پر وہ اخلاق کے حکم کو عقل کے مشورے سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں - ہمارے ملک میں عقل اور اخلاق کی یہ تقسیم اور تفریق بہت عام ہے - ہم لوگوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ فلاں شخص بےوقوف تو ہے مگر نیک بہت ہے - یا اس کا دل تو بہت اچھا لیکن دماغ کمزور ہے اور بالعموم اس قسم کے جملے تعریف کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں - یہاں نیکی اور دل کا تعلق اخلاق سے فرض کیا گیا ہے - اور دانش‌مندی اور دماغ کا تعلق عقل سے' اور اگر ایک شخص کے اخلاق میں کوئی قابل اعتراض بات نہ ہو تو اس کے بےوقوف یا سادہ لوح ہونے میں چنداں نقصان نہیں سمجھا جاتا -

ہم نے انسانی شخصیت کی تہ میں جس وحدت کو کارفرما تسلیم کیا ہے اس کے لحاظ سے ہم اس تضاد کو صحیح نہیں سمجھ سکتے - اگر بالفرض ہم اس "بےوقوف لیکن نیک" شخص کی نیک نیتی کے معترف بھی ہوں تب بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ایسا آدمی اپنے نیک ارادوں کو عمل میں نہیں لا سکتا کیونکہ ارادے کو عمل میں لانے کے لیے عقل اور علم درکار ہیں جو اس میں موجود نہیں - اول تو اس کے لیے یہی بہت مشکل ہے کہ زندگی کے پیچ در پیچ معاملات میں صحیح رائے قائم کر سکے اور سمجھ سکے کہ کس موقع پر کون سا طریق عمل نیک اور "اخلاق" کے مطابق ہے اور کون سا اس کے منافی - دوسرے اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیں کہ کسی خاص موقع پر وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے تو اس میں وہ مصلحت بینی، دور اندیشی اور مشکلات کو حسن تدبیر سے دور کرنے کی قابلیت کہاں سے آئے گی جو اخلاقی افعال کے لیے ناگزیر ہے - اس لیے جس شخص کے افعال و اعمال علم و عقل کی ہدایت سے محروم ہوں گے وہ صحیح معنی میں اخلاقی زندگی بسر نہیں کر سکتا - یہ ممکن ہے کہ وہ ایک مشین کے پرزے کی طرح دوسروں کے اشارے پر چلے ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرے اور اس کے ہاتھ سے "اچھے" کام عمل میں آئیں لیکن اس قسم کے افعال کی وہ اخلاقی قدر نہیں ہو سکتی جو ایک سمجھ دار اور معاملہ فہم آدمی کے کاموں کی ہوتی ہے جس کے دل میں ذمہ داری کا احساس ہے اور جس کے اعمال کی محرک اس کی اپنی تربیت یافتہ ذات ہے - علاوہ بریں

زندگی میں جدت اور تنوع کی کارفرمائی ہے - اس میں آئے دن نئے مسائل اور نئے مواقع پیش آتے رہتے ہیں - یہاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کسی ایک معمول کا دھراتے رہنا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا - اسی لیے اور بھی عقل کی ضرورت ہے کہ وہ نئی گتھی کو سلجھاتی رہے - اگر ہمارے مشین نما ''نیک آدمی'' کو کوئی ایسا نیا موقع پیش آجائے جہاں وہ اپنے مقررہ طریقۂ عمل کو کام میں نہ لاسکے تو وہ بالکل بےبس ہو کر رہ جائے گا اور ممکن ہے وہ کوئی بہت خطرناک غلطی کر بیٹھے - اسی لیے کہا گیا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے -

علم اور اخلاق کے اس لازمی رشتے پر جس کا ہم نے ذکر کیا ہے ایک اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے - کہا جاتا ہے کہ علم بجائے خود حسن عمل کے لیے کافی نہیں - تجربہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں بات اچھی ہے اور فلاں بات بری ہے - لیکن وہ اس علم پر عمل نہیں کرتے اور اچھی باتوں کو چھوڑ کر بری باتوں کی طرف راغب ہوتے ہیں - لہذا ان کو ''جاننے'' سے کیا فائدہ ؟ یہ وہی اعتراض ہے جو ارسطو نے سقراط کے اس مشہور قول پر کیا تھا کہ علم اور خیر ایک ہی چیز ہے اور کوئی شخص جان بوجھ کر شر کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ انجان پن کی وجہ سے ایسا کرتا ہے - بادی النظر میں سقراط کا یہ خیال بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم آئے دن یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ باوجود خیر کا علم ہونے کے شر کے مرتکب ہوتے ہیں - لیکن یہ اعتراض دراصل علم کے غلط مفہوم پر مبنی ہے -

پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اخلاق کے نظریوں سے بحث کرتے ہوئے اس غلطفہمی کا ازالہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ "علم" سے سقراط کی مراد سطحی واقفیت نہیں جو دوسروں کی وساطت سے حاصل ہو اور ذہن پر محض ایک بار ہو کر رہ جائے - اس کی رائے میں "نظری طور پر خیر کا مفہوم سمجھنا (یعنی اس کا حقیقی علم حاصل کرنا) اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان سالہا سال ضبط نفس اور عمل کی منزلوں میں سے نہ گزر چکا ہو - خیر کا علم ایسی چیز نہیں جو کتابوں سے یا دوسرے لوگوں سے ہاتھ آسکے - وہ طویل اور مسلسل تربیت کے بعد نصیب ہوتا ہے اور زندگی کے پختہ‌کارانہ تجربات کا ماحصل ہے" - ۱

بات یہ ہے کہ "علم" کا ایک لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے - اس کے ایک معنی تو وہ ہیں جو افلاطون کے پیش نظر تھے - یعنی وہ مضبوط اور راسخ عقیدہ جو ذاتی تجربے اور تنقید کے بعد حاصل ہو اور انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے - یہ علم کا حقیقی اور گہرا مفہوم ہے - دوسرے معنی وہ ہیں جو بالعموم لوگوں میں اور بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں بھی رائج ہیں یعنی وہ سطحی واقفیت جو دوسروں کے واسطے سے حاصل ہو جائے - جس میں ہمیں ذاتی کاوش نہ کرنی پڑے اور ہمارے ذاتی تجربے اور مشاہدے کو دخل نہ ہو - اگر علم سے ہماری مراد یہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا اثر ہماری سیرت اور ہمارے طرز عمل پر یا تو بالکل نہ ہوگا یا اتنا کم کہ نہ

۱ - Democracy and Education صفحہ ۴۱۲ -

ہونے کے برابر ہو - مدرسے کے طلبہ جو باتیں کتابوں میں پڑھ کر یا استادوں سے سن کر یاد کرلیتے ہیں ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے، اور اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتا، کہ وہ ضرورت کے وقت ان باتوں کو دہرا دیں - ان کی وجہ سے ان کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہو سکتا - علم کا یہ مفہوم صریحاً بہت ناقص اور محدود ہے اور اُستاد کو ہرگز اس قسم کا علم سکھانے پر قناعت نہیں کرنی چاہیے - وہ ہرگز یہ توقع نہیں رکھ سکتا ہے کہ اس "علم" کو اخلاقی تربیت میں ذرا بھی دخل ہوگا - تعجب یہ ہے کہ ایک طرف ہم تعمیر سیرت کو تعلیم کا اعلیٰ‌ترین مقصد قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف تعلیم کے عقلی پہلو کو جس میں مدرسے کا بیشتر وقت صرف ہوتا ہے ہم نے ایسے غلط اصولوں پر مبنی کیا ہے کہ اس سے اس مقصد اعلیٰ کی تکمیل میں کوئی مدد نہیں ملتی - اس دوئی کی وجہ سے اخلاقی تعلیم بالکل بےمعنی اور بےاثر ہو کر رہ جاتی ہے - مدرسے کا معمول اپنی بندھی ٹکی چال چلتا رہتا ہے اور اس کو اخلاقی تربیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا - البتہ بعض خاص موقعوں پر اُستاد اپنے طلبہ کو اخلاق اور فرائض کے متعلق چند باتیں بتا دیتے ہیں جن کو وہ کم و بیش بددلی کے ساتھ سنتے ہیں اور ضرورت ہو تو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں - ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں وہ اُستادوں یا بزرگوں یا معاشرے کی خاطر ان باتوں پر ایک حد تک عمل بھی کریں - لیکن اس عمل کا محرک ان کی عقل یا ان کا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا بلکہ ایک خارجی اثر ہوتا ہے - کبھی صورت حال اس سے بھی بدتر ہوجاتی ہے یعنی اخلاقی

ھدایتیں جبراً ان پر عائد کی جاتی ھیں جن کو وہ بغیر سمجھے بوجھے محض خوف کی وجہ سے قبول کرلیتے ھیں ۔ اس حالت میں بھی ان کے عمل کی ذمہ‌داری دوسرے لوگوں پر ھے ۔ جب کبھی رائے عامہ کا دباؤ یا اُستاد کا اندیشہ دور ھوجاتا ھے تو اس کا اثر بہت خراب پڑتا ھے یعنی انسان کا اخلاق توازن بالکل بگڑ جاتا ھے ۔ چونکہ خود اس کے نفس میں کسی قسم کا اخلاقی ضبط نہیں ھوتا اور بیرونی اثرات جو اس کو ایک حد تک روکے ھوئے تھے ھٹ جاتے ھیں اس لیے وہ موقع پاتے ھی کھل کھیلتا ھے اور اخلاقی اصول اور قوانین کو پس پشت ڈال کر اپنی خواھشات اور خارجی تحریکات کا غلام ھو کر رہ جاتا ھے ۔ اس کے علم اور اخلاق کے درمیان کوئی ایسا مضبوط اور مستحکم رابطہ قائم نہیں ھوتا کہ وہ اپنی ذاتی ھدایت کی ذمہ‌داری اپنے سر لے سکے ۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ھے جب مدرسے کے تعلیمی نظام کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ وھاں بچے جو کچھ سیکھیں، جو علم حاصل کریں اس کا اثر براہ راست ان کے طرز عمل پر پڑے ۔ شوق اس کا محرک ھو اور تجربہ اور مشاھدہ اس کی بنیاد، اور اس طرح وہ عقیدے کی سی پختگی حاصل کرے اور خود بخود ھماری طبیعت میں اور ھمارے کاموں میں ظاھر ھو ۔ روزمرہ کی زندگی میں ھم ھر وقت اس علم کو استعمال کرتے ھیں جو اس درجہ ھماری طبیعت اور سیرت کا جزو ھوگیا ھے کہ اسے نظرانداز کرنے کا خیال بھی ھمیں کبھی نہیں آسکتا ۔ اس کی مثالیں ھر وقت ھمارے سامنے ھیں ۔

جب کبھی کوئی شخص بجائے جلتے ھوئے چولہے پر بیٹھنے

کے کرسی پر بیٹھتا ھے یا بارش میں چھتری لے کر نکلتا ھے یا بیماری میں ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ھے یا ان ھزاروں کاموں میں سے جو اس کا روزمرہ کا معمول ھیں کوئی کام کرتا ھے تو وہ اس بات کو ثابت کرتا ھے کہ علم ایک خاص حالت کو پہنچ کر خود بخود عمل کی صورت میں ظاھر ھوتا ھے"۔ ا

علم کی یہ خاص حالت اسی وقت ھو سکتی ھے جب انسان اس کو اپنے تجربے اور مشاھدے کے ذریعے حاصل کرے اور وہ اس طرح اس کی طبیعت میں رچ بس جائے کہ اس کو بھولنا یا اس کی طرف سے بے پروائی برتنا ممکن ھی نہ ھو بلکہ استعمال کے وقت اس کو شعوری طریقے پر سوچنے کی ضرورت بھی نہ پڑے - یہی اصول اخلاق پر، جو ھماری زندگی کی رھنمائی کرتا ھے، صادق آتا ھے۔ اگرچہ اس کے حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے میں زیادہ مشکلات ھیں اور زیادہ عقلمندی کی ضرورت ھے - جب ھم خیر اور اخلاق کا مفہوم اور اپنے فرائض کی ادائگی کا سبق گھر کی عملی درس گاہ میں یا مدرسے کے منظم ماحول میں، یا بیرونی دنیا کی کشمکش میں سیکھتے ھیں اور خود ھمارے تجربات اور مشاھدات ھمارے معلم ھوتے ھیں تو یہ چیزیں ھمارے فلسفۂ زندگی کا جز بن جاتی ھیں اور ھمارے محرکات عمل میں شامل ھو جاتی ھیں - یہاں علم و عمل، عقل و اخلاق کی وہ تفریق مٹ جاتی ھے جس کی وجہ سے آج کل ھمارے مدرسوں کی تعلیم اس

ا—Democracy and Education صفحہ ۴۱۲ -

درجہ ناقص ہو گئی ہے ۔

علم و اخلاق کی اس بحث سے مدرسے کی تنظیم کے متعلق کئی قابل قدر نتائج نکلتے ہیں ۔ اگر ہم ان دونوں کے درمیان یہ رشتہ تسلیم کریں تو اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ مدرسے کو ایک عمرانی جماعت کی شکل میں مرتب کرنا چاہیے جس کے ہر شعبے میں معاشری اصول اور محرکات کی کارفرمائی ہو یعنی بچے ایسے مشاغل میں مصروف ہوں جو ایک دوسرے کی مدد سے تکمیل کو پہنچائے جائیں اور جن کی بدولت وہ معاشری معاملات کو سمجھنا اور اس میں دلچسپی لینا سیکھیں ۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں، کھیلیں، کودیں، گائیں، پڑھیں اور مختلف قسم کی انجمنیں بنا کر فرصت کے اوقات میں اپنے اپنے پسندیدہ مشاغل سے لطف اور فائدہ اٹھائیں ۔ اور اس طرح ان عمرانی اور اخلاقی اصولوں کی اہمیت اور مفہوم کو سمجھیں جن کا ذکر وہ کتابوں میں پڑھتے ہیں یا استادوں سے سنتے ہیں ۔ اس تبدیلی سے مدرسے کا وہ پرانا مفہوم قائم نہیں رہے گا جس کے مطابق یہ محض ایک ''جائے درس'' سمجھا جاتا ہے جہاں بچے لکھنے پڑھنے آتے ہیں جس کو ان کی جبلتوں اور فطری دلچسپیوں اور بیرونی دنیا سے کوئی سروکار نہیں اس کے بجائے ہم مدرسے کو جیسا کہ ہم وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں، چھوٹے پیمانے پر جماعتی زندگی کا ایک نمونہ بنانا چاہتے ہیں جہاں طلبہ مشاہدات اور تجربات سے مالا مال اور راحت اور مسرت سے معمور زندگی بسر کریں جس میں ان کی مخصوص جبلتوں کو اظہار اور نشو و نما کا موقع ملے اور وہ اپنی ضروریات اور

خواہشات کے مطابق تحصیل علم میں ترقی کرتے رہیں - اس مدرسے میں عمل پر، زندگی پر، فعالیت پر زور دیا جائے گا اور علم اس طرح سکھایا جائے گا کہ بچے اس کی مدد سے ان مسائل کو حل کر سکیں جو ان کے پسندیدہ مشاغل کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں - اسی وجہ سے جدید تعلیمی تحریکوں کی کوشش یہ ہے کہ نصاب تعلیم میں بجاے غیر مربوط اور مجرد اسباق کے مختلف قسم کے مسلسل عملی مشاغل داخل کیے جائیں - ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے ہم ان کی اہمیت کو واضح کر چکے ہیں لیکن اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بھی وہ بہت ضروری ہیں - ان مشاغل کے دوران میں بچے جو تخلیقی کوشش کریں گے اس میں ان کو نہ صرف جسم اور دماغ کی ہم آہنگ تربیت کے مواقع ملیں گے بلکہ مدرسے کی ساری فضا میں اشتراک عمل اور عمرانی زندگی کے اصولوں کی کارفرمائی ہوگی - بہت سی جدید تعلیمی تحریکیں مثلاً نصاب میں دستکاری اور صنعت و حرفت کے عناصر کا شامل کرنا، سائنس میں عملی کام کی اہمیت پر زور دینا، طلبہ میں حکومت خود اختیاری کا اجرا ان سب میں یہ مقصد مشترک ہے کہ طلبہ کو معاشری ضبط اور تربیت حاصل ہو جو اخلاقی تربیت کی بنیاد ہے -

یہ بھی ممکن ہے کہ مدرسے کے ماحول میں امداد باہمی اور اشتراک عمل کے مواقع مہیا ہوں اور بچے مل جل کر کھیلیں، کام کریں، رہیں سہیں، اور آپس میں ہمدردی اور دوستی کا برتاؤ کریں لیکن ان کی یہ عادتیں اور صلاحیتیں ایک مخصوص اور محدود ماحول کے ساتھ اس طرح وابستہ

ہوجائیں کہ جب مدرسے سے باہر نکل کر زندگی کے مشاغل میں شریک ہوں تو ان صفات کا مناسب حال استعمال نہ کرسکیں اور ان اصولوں کو سب لوگوں کے ساتھ نبھانے میں کامیاب نہ ہوں یہ اندیشہ ایسی حالت میں زیادہ ہوتا ہے جب مدرسے کی زندگی اور بیرونی زندگی میں کوئی زندہ رابطہ نہ ہو اور طالب علم تمدنی زندگی کے مسائل اور محرکات سے بےتعلق ہو کر مدرسے میں بالکل قلعہ بند ہوجائے جہاں نہ باہر کے اثرات پہنچ سکیں نہ باہر کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور اتحاد اغراض و مقاصد پیدا ہو سکے - جن مدرسوں میں تاریخی حالات کی وجہ سے خاص رسوم و روایات قائم ہو جاتی ہیں وہاں یہ بےتعلقی بہت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے - اس کی ایک نہایت واضح مثال انگلستان کے پبلک اسکول میں ملتی ہے - ان اسکولوں کی محدود چاردیواری میں ایک خاص قسم کی فضا اور روایات پیدا ہوگئی ہیں جن کی بدولت وہ نہایت کامیابی کے ساتھ ان عادات اور خصوصیات کو نشو و نما دیتے ہیں جو ان کے نزدیک قابل قدر ہیں - اور اپنے طلبہ میں ایک مخصوص سیرت کی تشکیل کرتے ہیں - لیکن ان کا نقطۂ نظر اور تخیل دونوں تنگ ہیں - اس وجہ سے ان کی تربیت ناقص اور نامکمل رہتی ہے - ان میں باہمی ہمدردی یک جہتی اور تعاون کی جو صفات پرورش پاتی ہیں وہ اپنی جماعت اور اپنے طبقے کے لوگوں تک محدود ہیں - ان کے دائرے میں خود اپنی قوم کے کل افراد تک شامل نہیں ہوتے - ان میں ایک "پبلک اسکول کی ذہنیت" پیدا ہو جاتی ہے جو قوم کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیتی ہے - ایک وہ جس

نے ان اسکولوں میں تعلیم پائی ہے دوسرا وہ جو اس شرف سے محروم رہا ہے - وہ موخرالذکر طبقے کے لوگوں کو جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اپنے آگے حقیر جانتے ہیں اور معاشری معاملات میں انہیں اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے - ظاہر ہے کہ جمہوری معاشرے میں اس قسم کی صورت قوم کے لیے مفید نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اس تفریق کو اور مستحکم بناتی ہے جس کو دور کرنا جمہوریت کا اولین فرض ہے - ہمارے ملک میں یہ تفریق کسی قدر مختلف صورت میں پائی جاتی ہے - ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی زبان اور آداب معاشرت سیکھ کر گویا ایک نئی تہذیب اور نیا تمدن اختیار کر لیا ہے - یہ لوگ خود کو باقی تمام ابنائے وطن سے، جن کو یہ تعلیم یا کسی طرح کی تعلیم بھی نصیب نہیں ہوئی، بالکل مختلف اور ممتاز سمجھتے ہیں ان کا کام اور تفریح، ان کا طرز خیال اور طرز معاشرت، ان کے اغراض و مقاصد غرض سب چیزیں عام لوگوں سے مختلف ہو جاتی ہیں - تعلیم یافتہ طبقے اور جمہور کی یہ باہمی اجنبیت ملک و قوم کے اخلاقی، معاشری اور سیاسی مفاد کے لیے بہت مضر اور خطرناک ہے - اگرچہ گزشتہ بیس سال میں زیادہ‌تر سیاسی وجوہ سے اس میں مقابلتاً کمی واقع ہوئی ہے لیکن اب بھی کالجوں اور اسکولوں کے تعلیم یافتہ لوگوں اور ملک کی بے‌شمار دیہاتی آبادی کے درمیان ایک سد سکندری ہے جس کو دور کرنا قومیت کی نشو و نما کے لیے نہایت ضروری ہے - علاوہ اس کے ہم کسی ایسے نظام اخلاق کو مکمل نہیں مان سکتے جس کا

دائرہ ایک خاص جماعت یا طبقے تک محدود ہو کیونکہ اخلاق کی بنیاد کسی امتیازی خصوصیت مثلاً رنگ یا نسل یا وجاہت ظاہری یا تعلیم یا مالی اور معاشری حیثیت پر نہیں رکھی جاتی بلکہ انسانیت کے اس عنصر پر قائم ہے جو تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہے حقیقی اخلاق اور سچی تہذیب کی پہچان صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جن لوگوں کی سیرت میں اخلاق کے اصول محض ظاہری شائستگی اور آداب محفل کی سطح پر نہیں رہتے بلکہ تہ تک اتر جاتے ہیں ان کا خلق اور ہمدردی باران رحمت کی طرح ہر شخص کے لئے ہوتا ہے - اس میں امیر اور غریب، جاہل اور عالم کا امتیاز نہیں ہوتا - اخلاق طبیعت کا ایک خاصہ ہے جو مشک کی خوشبو کے مانند ہر جگہ اور ہر موقع پر ظاہر ہو کر رہتا ہے - ہم اپنے مدرسوں میں اس اخلاق کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس کے دائرے میں تمام عالم انسانی آجائے - یہ آرزو اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب مدرسے کی زندگی اور بیرونی زندگی میں اچھی طرح ربط ضبط پیدا ہو جائے اور ایک طرف مدرسے میں عمرانی زندگی کے بہترین عناصر اور مشاغل مہیا ہوں اور دوسری طرف طالب علم اپنی تعلیم و تربیت کے نتائج کو بیرونی زندگی میں استعمال کرے اور دیکھے کہ انصاف، تقسیم عمل، امداد باہمی، ادائے فرض، راست بازی، معاشری وفاداری کے اصول نہ صرف مدرسے کی زندگی میں ضروری ہیں بلکہ دنیا کے کار و بار کو کامیابی اور عمدگی کے ساتھ چلانے کے لئے بھی ناگزیر ہیں اور تمام نظام تمدن میں ان کی کارفرمائی ہے اور ہونی چاہئے - لہذا اخلاقی تربیت

کے لیے لازم ہے کہ مدرسۂ جدید کے نصاب کو معاشری ضرورت اور مقاصد کے لیے مطابق تربیت دیں اور اس کے طریقۂ تعلیم کو عمرانی زندگی کے طریقۂ کار کے ساتھ ہم‌آہنگ بنائیں تاکہ طلبہ تمدنی زندگی کے اخلاقی اصول عملی طور پر سیکھ لیں -

نصاب تعلیم کی اہمیت

مدرسے کا نصاب اخلاقی تربیت میں کیونکر معین ہو سکتا ہے اور اپنے طلبہ میں معاشری صلاحیت کس طرح پیدا کر سکتا ہے؟ نصاب تعلیم کی بحث میں ہم بتا چکے ہیں کہ نصاب بنانے والوں کو معاشری زندگی کے مختلف شعبوں سے ان بہترین اور اہم‌ترین عناصر کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کے مستقل اقدار و مقاصد کے حامل ہوں تاکہ ان کے مطالعے سے طالب علم کے ذہن میں نظام تمدن کو سمجھنے کی قابلیت اور بصیرت پیدا ہو اور وہ اپنی سیرت کو اس کے ساتھ ہم‌آہنگ بنا سکے - اگر نصاب کے تمام مضامین کا مطالعہ محض اس نظر سے کیا جائے کہ ان سے معلومات میں تھوڑا بہت اضافہ ہو اور امتحان میں کامیابی حاصل ہو جائے تو ان کی کوئی خاص اخلاقی یا عمرانی اہمیت نہ ہوگی - برخلاف اس کے اگر ان کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان سے طلبہ کو معاشری زندگی کے اصول و اساس سے واقفیت ہو اور بہتر زندگی بسر کرنے میں مدد ملے تو ان کی اخلاقی قدر میں کوئی شبہہ نہیں - اس کی تشریح کے لیے ہمیں درسی مضامین کی نوعیت کے متعلق اس تمام بحث کا اعادہ کرنا پڑے گا جو ہم ایک دوسرے سلسلے میں اس سے پہلے کر چکے ہیں - اس کا تو یہاں موقع نہیں - لیکن ہم اخلاقی تربیت کے نقطۂ نظر سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس مقصد کے

لیجے بعض اہم درسی مضامین کی تنظیم و ترتیب میں کیا تبدیلی لازم آتی ہے۔

سب سے پہلے تاریخ کو لیجئے۔ اگر تاریخ محض پرانے واقعات اور بھولے بسرے انسانوں کا مجموعہ سمجھ کر پڑھی اور پڑھائی جائے' جیسا بالعموم ہمارے مدارس میں ہوتا ہے تو اس سے نہ عمرانی تربیت میں مدد ملے گی نہ اخلاقی تربیت میں۔ لیکن فرض کیجئے ہم تاریخ کی تعلیم میں ارتقائی نقطۂ نظر اختیار کریں اور ماضی کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ اس سے موجودہ تمدنی اور سیاسی حالات پر روشنی پڑے تو تاریخ نظام معاشرت اور اس کے تمام پیچیدہ اور ترقی یافتہ اداروں کی تفسیر کا ذریعہ بن جائے گی۔ معاشری زندگی کے تمام شعبوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ان کی ابتدا بہت سادہ اور محدود ہوتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ اور وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ تاریخ کا فرض یہ ہے کہ وہ اس عمل ارتقا کی تشریح کرے اور طلبہ کو یہ سمجھائے کہ انسانی جد و جہد سے تمدن کے ہر شعبے میں کس طرح ترقی ہوئی ہے۔ اگر طلبہ اس کا مطالعہ سمجھ بوجھ کر اور صحیح نقطۂ نظر سے کریں گے تو وہ انسانی ارتقاء کی نوعیت' اس کی رفتار اور اس کے رجحانات کو پہچاننے لگیں گے۔ اور وہ اپنے عمرانی فرائض کو عمدگی سے پورا کریں گے اور اپنے حقوق سے اچھی طرح فائدہ اٹھائیں گے نصاب تاریخ کے انتخاب میں جن امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ہمیں اس مضمون کی تعلیم میں انسانی معاشرت کی ارتقاء کے بعض

خاص پہلو نمایاں کرنے پڑیں گے ۔ مثلاً ابتدائی زمانے کے وحشیوں کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوگی کہ اول اول انسان اور فطرت کس طرح ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے تھے اور کس طرح رفتہ رفتہ انسان نے فطرت کی طاقتوں کو مطیع کر کے ان کو بجائے دشمن کے دوست بنا لیا - قدیم آریوں کی زندگی کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوگا کہ انہوں نے کس طرح اپنی مخصوص ضروریات پوری کرنے کے لیے متمدن زندگی کے وہ ادارے قائم کیے جو آج زیادہ مکمل شکل میں موجود ہیں - اسی طرح مختلف قوموں کی تاریخ در اصل مختلف انسانی کمالات کے ارتقاء اور کامیابی کی داستان ہے - تاریخ روما کا مطالعہ سیاست اور ملک گیری کے کمال کا، تاریخ یونان کا مطالعہ علوم و فنون لطیفہ کی ترقی و نشو و نما کا، سلطنت مغلیہ کی تاریخ کا مطالعہ آئین سلطنت کی تنظیم اور فن تعمیر کی تکمیل کا مطالعہ ہے - بحیثیت مجموعی علم تاریخ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ موجودہ تمدن کے رنگارنگ تار و پود کے ملنے سے کس طرح یہ جامہ تیار ہوا، وہ کون سے محرکات تھے جو مختلف ایجادوں، دریافتوں اور جغرافی سیاحتوں کا باعث ہوئے اور ان چیزوں نے کس طرح زندگی کے نئے نئے طریقوں کی بنیاد ڈالی - طالب علم کے دل میں اس عظیم‌الشان ارتقاء کا احساس پیدا ہونا اور اس کا معاشری معاملات اور مسائل کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنا اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے -

اسی طرح جغرافیہ چند اصطلاحوں اور ناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی معاملات اور ان کی باہمی وابستگی کو

سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ اس کے مطالعے میں معاشری اور انسانی پہلو مقدم رکھا جائے - تاریخ اور جغرافیہ دونوں میں انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے - فرق یہ ہے کہ تاریخ انسان کا تعلق وقت اور زمانے سے دکھاتی ہے یعنی اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اس کی زندگی اور تمدن میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں - جغرافیہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کے تعلق سے بحث کرتا اور یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نشو و نما کس حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہے - بہر حال دونوں کو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سروکار ہے - جغرافیہ کی اخلاقی اہمیت یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط کو ظاہر کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ وہ کیسے عالم طبیعی کے واسطے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور کس طرح اقتصادی اور مادی زندگی کی بقا اور اصلاح و ترقی کے لیے لوگوں کا باہمی تعامل ضروری ہے اور تقسیم عمل کے اصول پر زراعت، صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں کی تنظیم لازم آتی ہے - اسی کے ساتھ جغرافیہ انسانی تخیل اور ہمدردی کا دائرہ وسیع کرتا ہے اور اسی طرح طالب علم کی عمرانی تربیت میں مدد دیتا ہے -

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ادب کی تعلیم صحیح اصول پر مرتب کی جائے تو وہ اخلاقی تربیت کا کس قدر موثر ذریعہ بن جائے گی - ادب انسانی خیالات اور جذبات انسانی آرزؤں اور اُمنگوں، انسانی کامیابیوں اور ناکامیابیوں کا ترجمان ہے اور انسان کے قلب و روح کی واردات اور جد و جہد کا آئینہ دار - اس کے ذریعے سے ہم نہ صرف مختلف قسم کی مفید معلومات

حاصل کرتے ہیں (یہ تو ادب کا سب سے ادنیٰ فائدہ ہے) بلکہ قدیم اور جدید خیالات اور جذبات' اور دنیا کے بہترین ارباب فکر کے شاہکاروں سے روشناس ہوتے ہیں - اس کے مطالعے سے ہماری نظر زیادہ وسیع' ہماری ہمدردی زیادہ عام' ہماری قدرشناسی کی حس زیادہ تیز ہو جاتی ہے - اعلیٰ ترین ادب ہمیں نہ صرف معاشری معاملات اور مسائل کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے' نہ صرف اپنی سحر آفرینی سے گزشتہ زمانوں اور شخصیتوں کو دوبارہ زندہ کر دکھاتا ہے بلکہ ان صفات کو جو انسانیت کے جوہر ہیں نشو و نما دے کر اخلاقی تربیت میں معاون ہوتا ہے - وہ ہمیں براہ راست اخلاقی تلقین اور نصیحت نہیں کرتا بلکہ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کرتا ہے اور واقعات اور افسانوں کو اس پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ ان کا مجموعی اثر ہمارے جذبات کی تہذیب کا باعث ہوتا ہے - جن تصانیف میں پند و نصیحت کا رنگ غالب آجاتا ہے اور مصنف اپنے لطیف کے اصول کو نظر انداز کر کے عمداً اخلاقی تعلیم کی کوشش کرتا ہے ان کا ادبی معیار بالعموم زیادہ بلند نہیں ہوتا - ناولوں' ناٹکوں اور افسانوں میں بھی جب کبھی خیالات و عقائد کی تبلیغ کی خواہش آرٹ پر غالب آجاتی ہے تو ان کا اثر جاتا رہتا ہے - اس لیے ادب عالیہ کی پہچان اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طریقے پر طالب علم کے بہترین خیالات اور جذبات کو ابھارے اور خود بخود اس کی سیرت میں سرایت کر جائے - جس شخص میں ادب کا صحیح ذوق ہوتا ہے اسے ہمیشہ ایک اعلیٰ درجے کا مضمون یا نظم یا افسانہ پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس

کی ذات میں ایک نئی وسعت اور گہرائی اور اس کے احساسات میں تیزی اور شدت پیدا ہو گئی ہے - اکثر لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہوا ہو گا کہ جب وہ کوئی ایسی چیز پڑھتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگے تو کم از کم عارضی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نفس سے بہت سے ادنیٰ جذبات اور تعصبات دور ہو گئے ہیں اور طبیعت میں گداز اور نرمی اور محبت پیدا ہو گئی ہے - گویا بقول ارسطو' ان کا روحانی تنقیہ[1] ہو گیا ' ہے - لہٰذا ایک صاحب نظر اور صاحب دل معلم کے ہاتھ میں ادب کی تعلیم تربیت اخلاق کا ایک نہایت اہم اور موثر ذریعہ بن جاتی ہے - بشرطیکہ اس کی غرض محض زبان سکھانا اور الفاظ کی مشق کرانا نہ ہو بلکہ اس میں انسانی جذبات اور تجربات کے مطالعے پر زور دیا جائے اور اس کی وساطت سے طلبہ کو بنی نوع انسان کے بہترین خیالات اور احساسات میں شرکت کا موقع ملے -

سائنس کی تعلیم جس کو عام طور پر محض مادی مفاد کے حصول اور صنعت و حرفت کی ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے در اصل اس زمانے میں اخلاقی اور عمرانی تربیت کا جزو لازم ہو گئی ہے کیونکہ اس کی مدد سے ہم موجودہ تمدن کو سمجھتے ہیں جس کی بنیاد بڑی حد تک سائنس اور اس کے استعمال پر ہے اور اسی کے ذریعے سے ہم فطرت کی طاقتوں کو تسخیر کر کے انہیں اپنے مقاصد کے لیے کام میں لاتے ہیں - سائنس کے مطالعے سے ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان نے دنیا میں جس قدر مادی ترقی کی ہے اس میں

[1] - Catharsis —

سب قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے اور جب تک تمام ماہرین سائنس اپنی اپنی عملی تحقیقات کے نتائج سے اپنے شرکائے کار کو مطلع نہ کریں اور ان میں نہایت قریبی اشتراک عمل نہ ہو سائنس ترقی نہیں کر سکتی - علاوہ بریں سائنس نے انسان کو سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز سبق یہ سکھایا ہے کہ وہ خود اپنی تربیت یافتہ عقل کے ذریعے اپنے معاملات کی ہدایت اور رہنمائی کر سکتا ہے اور اس کی قسمت کا انحصار نامعلوم اور خوفناک قوتوں کی مرضی پر نہیں ہے - وہ قدیم زمانے کے وحشیوں کی طرح جن کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ماحول کے تمام مظاہر ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں' ہمت شکن توہمات اور خطرات کا غلام نہیں ہے - سائنس کی مدد سے انسان نے اپنے گزشتہ تجربات کو منظم کر کے انہیں آئندہ کی ترقی کا ذریعہ بنا لیا ہے اور اس خوف سے جو اس کے دل پر طاری تھا رہائی حاصل کر کے اپنے لیے آگے بڑھنے کے بےشمار راہیں کھول دی ہیں - اگر سائنس اس طرح انسانی تجربات کی تنظیم کر کے ان سے مفید نتائج نہ نکالتی تو یہ تجربات یا تو بالکل اکارت جاتے یا انسان کے دماغ کے لیے ایک بوجھ بن کر رہ جاتے - جن لوگوں پر سائنس کے مخصوص منہاج و نقطۂ نظر کا اثر نہیں پڑا وہ یا تو عادت اور روایات کے مطابق عمل کرتے ہیں یا تقدیر پر بھروسا کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں - ان میں معاملے کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے اور اس کے موافق اور مخالف دلائل کو تولنے کی قابلیت نہیں ہوتی - اور وہ اپنے افعال کی ذہنی ذمہ‌داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے - ظاہر ہے کہ اس ذہنیت کے لوگ کبھی زیادہ

ترقی نہیں کر سکتے اور خصوصاً اس زمانے میں جو حرکت اور تبدیلی کا زمانہ ہے وہ علمی اور معاشری ترقی میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے - ہندوستان میں اس قسم کے لوگ بہت ہیں جو قسمت پر شاکر رہنا پسند کرتے ہیں اور جد و جہد کے قائل نہیں - قومی سیرت کی تشکیل کا تقاضا یہ ہے کہ اس ذہنی کیفیت میں انقلاب پیدا کیا جائے - اس کا بہترین طریقہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یہی ہے کہ مدرسوں کے نصاب میں سائنس کو معقول حصہ ملے اور طلبہ صحیح طریقے پر اس کا مطالعہ کریں تاکہ وہ معاشری زندگی کے ان شعبوں میں کامیابی کے ساتھ شریک ہو سکیں جن کی بنیاد سائنس کے علم پر ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) لکھتے ہیں :

" نصاب تعلیم میں بھی سائنس کا کام وہی ہے جو اس نے نسل انسانی کے لیے انجام دیا ہے یعنی تجربے کو اس کی مقامی اور عارضی پابندیوں سے آزاد کرنا اور عقلی ترقی کی ایسی راہیں کھول دینا جن میں شخصی عادات اور رجحانات کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو - اس طرح جب کوئی خیال اس مخصوص اور محدود دائرے سے جس میں وہ پیدا ہوا ہے نکال کر ایک مجرد تصور بنا دیا جائے اور اس کو زیادہ وسیع معنی دے دیے جائیں تو انفرادی تجربے کے نتائج سب لوگوں کے کام میں آ سکتے ہیں اور انجام کار فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سائنس عمرانی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے " - ۱

- Democracy and Education—1

ہم نے اخلاق کا جو مفہوم پیش کیا ہے اس کے مطابق سائنس سے عمرانی برکات کے علاوہ اخلاقی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ اس عقیدے سے بڑھ کر کون سی اخلاقی صفت ہو سکتی ہے کہ انسانی ترقی اور اصلاح خود انسان ہی کی کوشش سے ممکن ہے اور یہ کوشش صرف باہمی اشتراک عمل کے ذریعے کامیاب ہوسکتی ہے؟ اس عقیدے کے طفیل میں انسان عاجزانہ تقدیر پرستی سے نجات پاکر[1] نظام عالم میں اپنی اہمیت اور اپنے فرائض کو پہچانتا ہے اور یہی خودشناسی خدا شناسی کی سیڑھی ہے - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سائنس قدرت کی کارسازی کے وہ حیرت انگیز کرشمے دکھاتی ہے اور دنیا کے لاتعداد اور بظاہر متضاد مظاہر میں قانون الٰہی کی حکومت کا ایسا بین ثبوت دیتی ہے کہ اگر ہم عقیدت اور احترام کے ساتھ چشم بصیرت سے اس کا مطالعہ کریں تو وہ ہمیں بلاواسطہ معرفت الٰہی کی منزل پر پہنچا دیتی ہے -[1] اگر گنجائش ہوتی تو ہم نصاب کے باقی مضامین سے بحث کر کے دکھا سکتے تھے کہ اخلاقی تربیت میں ان کا کیا حصہ ہے - بہر حال ان سب کی تنظیم میں شرط مشترک یہی ہے کہ ان کی تعلیم صحیح طریقے پر دی جائے - حساب جیسا خشک اور بظاہر بے روح مضمون بھی جس کا بادی النظر میں اخلاقی تربیت سے کوئی رشتہ معلوم نہیں ہوتا، دراصل نہایت اہم اخلاقی اور عمرانی قدروں کا حامل

---

۱ - سائنس کے فوائد اور برکات کی مفصل اور مکمل بحث کے لیے اسپنسر کی فلسفۂ تعلیم کا مطالعہ کرنا چاہیے -

ہے۔ اس کے ذریعے سے ہم ان تمام معاشری معاملات اور مسائل کو سمجھتے ہیں جو اعداد و مقادیر کی صورت میں ظاہر کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے بغیر اس مادی دنیا میں ہماری بہت سی کوششیں یا تو بالکل ضائع ہو جاتی ہیں یا ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، سائنس کی تحقیقات، روزمرہ کے کار و بار میں ہمیں برابر حساب کی ضرورت پڑتی ہے اور وہی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور معاشری کار و بار کو ناپنے تولنے اور ان کا صحیح اندازہ کرنے میں کام آتا ہے۔ دوسری طرف حساب کی تعلیم میں ہمیں ہر ہر قدم پر صحت عمل، نقد و تنقید اور ذہنی دیانت‌داری کی صفات درکار ہوتی ہیں کیونکہ یہ ان علوم صحیحہ میں سے ہے جن میں غلطی اور صحت کے مابین کوئی درمیانی راہ نہیں ہوتی۔ یہاں طالب علم الفاظ کی گنجلک کے ذریعے نہ اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہے نہ دوسروں کو مغالطے میں ڈال سکتا ہے۔ لہذا حساب کی صحیح تعلیم کے ذریعے جو ذہنی صفات اور عادتیں پیدا ہوتی ہیں وہ اخلاقی تربیت کا جزو بن جاتی ہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم انتقال قوت اکتسابی[1] کے غلط نظریے کو صحیح مانیں۔ دستکاری اور فنون لطیفہ کی اہمیت اور نصاب میں اس کی قدر و قیمت سے ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ وہ نہ صرف طلبہ کی جسمانی اور دماغی نشو و نما کے لیے مفید ہیں بلکہ

1. Transfer of Trainnig—

اخلاقی تربیت کے لیے بھی ضروری ہیں ۔ ماہرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بچوں کی شخصیت کی نشو و نما اور تشکیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک انہیں مسلسل عملی اور تخلیقی مشاغل میں شرکت کا موقع نہ ملے شرط یہی ہے کہ ان کی تعلیم بالکل رسمی اور خشک نہ بنا دی جائے کہ بچوں کو سوائے چند کم و بیش مفید قاعدوں کو سیکھنے کے تخلیقی اظہار کا موقع نہ ملے - اس صورت میں نہ تو ان فنون کے سیکھنے سے بچوں میں معاشری احساس پیدا ہوگا نہ ایسے تعلیمی طریقے اختیار کیے جاسکیں گے جن میں اشتراک عمل باہمی ہمدردی اور ذہنی تعاون کی گنجائش ہو - ان میں بھی اسی رشک و خودغرضی اور باہمی مسابقت کی کار فرمائی ہوگی جو بدقسمتی سے دوسرے درسی مضامین میں داخل ہوگئی ہے - برخلاف اس کے اگر ان چیزوں کی تعلیم میں بچوں کے فطری میلانات اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھا جائے' فعالیت کے اصول پر زور دیا جائے اور وہ اپنا کام آزادی کی فضا میں کریں تو ان میں اعتماد ذات' تعاون عمل اور تخلیقی اظہار کی صفات پیدا ہوں گی جو معاشری زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہیں -

طریقۂ تعلیم اور معاشری تربیت

نصاب کی مندرجۂ بالا بحث میں ضمنا طریقۂ تعلیم کی بحث بھی آگئی ہے اور ہم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ محض نصاب تعلیم کو باقاعدہ اور معقول طور پر مرتب کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہمیں وہ تمام علمی اور اخلاقی نتائج حاصل ہوجائیں جن کی تفصیل اوپر کی گئی ہے کیونکہ جو علم کتابوں میں

محفوظ ہے وہ ہمارے لیے کوئی اہمیت اور قدر نہیں رکھتا جب تک ہم اس کو اپنے تجربات کی شکل میں تحویل نہ کریں اور وہ ہماری زندگی اور عمل کا جزو نہ بن جائے - اس عمل تحویل کا ذریعہ طریقۂ تعلیم ہے - اگر وہ بچوں کی فطرت کے موافق ہے، ان کو عمل کا موقع دیتا ہے، اس کے اندر جدت پسندی اور ذاتی ذمہ‌داری کے ساتھ کام کرنے کی گنجائش ہے تو وہ جو کچھ سیکھیں گے ان کا جزو طبیعت بن جائے گا اور ان کی سیرت پر اثر ڈالے گا ورنہ ان کی تمام معلومات دماغ پر بار ہوکر رہ جائے گی اور ان کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ نہ لے گی - مجھے اپنے ایک پرانے سائنس ماسٹر کا یہ قول اکثر یاد آتا ہے کہ "تم ان چیزوں کو حفظ کر رکھو کسی وقت خود بخود کام آئیں گی" - یہ بیچارے طریقۂ تعلیم کی اہمیت اور اثر سے بالکل ناواقف تھے - انہیں یہ خیال کبھی نہیں گزرا تھا کہ جب بغیر چبائے ہوئے جسمانی غذا بھی ہضم نہیں ہوتی تو دماغی غذا کیسے کوئی مفید اثر پیدا کرسکتی ہے اگر وہ بغیر ہضم کئے حافظے میں ٹھونس لی جائے؟ ان کی یہ غلطی کوئی غیر معمولی جہالت کی دلیل نہیں بلکہ ایک خاص تعلیمی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہے جس کی حکومت صدیوں تعلیم کی قلمرو پر رہی ہے اور جس نے نہ جانے کتنے غریب طالبہ کی تعلیمی زندگی برباد کی ہے - اُستادوں کی تمام کوششیں مدتوں اس مقصد کے لیے وقف رہیں کہ طالبہ کسی طرح وہ بے‌اندازہ معلومات حاصل کر لیں اور یاد کر رکھیں جو وہ اپنی سمجھ کے مطابق ان کے لیے مفید سمجھتے تھے - ان کو اس امر سے بحث

نہ تھی کہ ان علوم کی تحصیل کے لیے وہ خود اور ان کے
شاگرد نیا طریقے اختیار کرتے ہیں - کومینیس (Comenius)
اور اس کے ہم خیال معلموں کے ہمہ دانی پر مبنی نظام تعلیم
کا ذکر ہم کر چکے ہیں - ان لوگوں کا زور تمام تر موضوع پر تھا،
طریقۂ تعلیم پر نہ تھا اور ظاہر ہے کہ علوم کی تعداد اور وسعت
اتنی ہے کہ ایسی حالت میں معلم کو طریقۂ تعلیم کی طرف
سے خواہ مخواہ بے توجہی کرنی پڑے گی اور تمام ذہنی قوتوں
کو نظرانداز کر کے صرف حافظے سے کام لینا ہوگا - مشرقی ملکوں
میں بالعموم اور خود ہمارے ملک میں بھی قدیم نظام تعلیم
کی بنیاد اسی خیال پر تھی - اس کا منشا یہ تھا کہ جو
طلبہ اعلی تعلیم حاصل کرنا چاہیں وہ مختلف علوم مثلاً
فلسفہ، ریاضی، طب، قانون، اخلاق وغیرہ کی تکمیل کریں -
اس نظام کی خرابی اور کمزوری تو ظاہر ہے لیکن ہم یہ
اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس زمانے میں جو لوگ
طالب علم کا سچا شوق رکھتے تھے وہ اپنی تعلیم پر اتنی توجہ
اور مدت صرف کرتے تھے کہ ان میں سے بعض مستعد اور قابل
افراد مختلف علوم میں کمال پیدا کر لیتے تھے - لیکن
جیسا ہم وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں جب سائنس اور
دوسرے تجربی علوم نے جدید دور ارتقاء میں قدم رکھا تو علوم
کی تعداد اور وسعت میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہونا
شروع ہوا اور موجودہ زمانے میں کسی شخص کے لیے یہ
ممکن نہیں کہ تمام علوم کا تو کیا ذکر ہے ان کے دسویں یا
سوویں حصے پر بھی عبور حاصل کر سکے - علاوہ اس کے یہ
زمانہ خصوصی قابلیت کا ہے - علوم بھی پہلے سے بہت زیادہ

منظم ہو گئے ہیں اور ان کے بہت سے علحدہ شعبے
گئے ہیں جن میں سے ہر ایک میں کمال پیدا کر
ایک ماہر خصوصی کی ضرورت ہے - موجودہ تمدن
سے مشاغل ایسے ہیں جن کے لیے مخصوص قابلیت
ہے - اس وجہ سے موجودہ حالات میں یہی مناسب
ایک شخص ثانوی تعلیم پانے کے بعد جو عام تہذیب
ناگزیر ہے، کسی ایک علم یا فن میں مہارت حاصل
یا چند ایسے علوم و فنون کا مطالعہ کرے جن میں
قریبی تعلق ہے، بجائے اس کے کہ وہ بہت سے
قسم کے علوم میں سطحی واقفیت پیدا کرے
نصاب تعلیم کی وسعت محدود کرنا صرف اسی
میں جائز ہو سکتا ہے جب طریقۂ تعلیم میں ایسی
کی جائے کہ طلبہ میں ذہنی آزادی، اعتماد نفس
مطالعے کی قابلیت پیدا ہو اور وہ آئندہ زندگی میں
ضرورت کے مطابق جس علم کو چاہیں حاصل کر
صلاحیت معلومات کے اس ذخیرے سے بدرجہا بہتر
انسان ایک دفعہ غیر معمولی محنت اور کوشش
کرے لیکن آگے چل کر اچھی طرح استعمال نہ
ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے یہ صلاحیت بہت قابل
اور اسی وجہ سے موجودہ نظریۂ تعلیم میں طریقۂ
اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے -

ہم نے کتاب کے حصۂ اول میں جن سیاسی ا
انقلابات کا ذکر کیا ہے ان کی وجہ سے انسانی س
فعال صفات کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے - جمہ

اس دور میں انفرادی ترقی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی کے ساتھ حصہ لینے کے لیے ہمت، حوصلہ اور قوت اجتہاد کی ضرورت ہے - اگر بچے ذہنی جمود میں مبتلا رہیں اور انہیں دوسروں پر بھروسا کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی عادت پڑ جائے تو وہ کشمکش حیات میں ناکامیاب رہیں گے - جہاں تک مدرسے کے علمی مشاغل کا تعلق ہے فعالی صفات انہیں تعلیمی طریقوں کے ذریعے نشو و نما پائیں گی جو طلبہ کی تعمیری اور تخلیقی قوتوں کو اظہار کا موقع دیں تاکہ وہ معلومات کو محض جذب نہ کر لیں بلکہ اسے مختلف طور پر استعمال بھی کریں - فطرت اطفال کا مقتضا بھی یہی ہے۔ کیونکہ ان میں قدرتاً یہ خواہش اور بےچینی ہوتی ہے کہ وہ کام کریں، چیزیں بنائیں اور بقول فروبل (Froebal) کے "جو کچھ ان کے اندر ہے اسے باہر لائیں" - جس قدر نئے تعلیمی تجربے حال میں ہوئے ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے، سب میں یہ امر مشترک ہے کہ وہ فعالیت پر زور دیتے ہیں اور طالب علم کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ پر بھروسا کرے، مشکلات پر قابو پائے، جسم اور دماغ کی قوتوں سے کام لے کر وسائل اور ذرائع کی تنظیم کرے اور اپنے مقاصد کو تکمیل تک پہنچائے - میڈم مونٹسوری کے طریقۂ تعلیم میں، طریق ڈالٹن اور گیری اسکیم (Gary Scheme) میں اور دوسرے تعلیمی طریقوں میں جو انفرادی نشو و نما کے اصول پر مبنی ہیں معلم کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچوں کے لیے ایک موزوں ماحول مہیا کرے جس میں ہر نوع کے مشاغل کا امکان ہو، ہر قسم کے عمل کے محرکات

موجود ہوں، ہر طرح کے ضروری سامان اور آلات فراہم ہوں تاکہ وہ اپنے شوق سے علمی تعلیم حاصل کر سکیں - معلم کی حیثیت ایک دوست اور رہبر کی ہے جو راستہ دکھاتا ہے لیکن اس راستے پر چلنا طالبہ پر چھوڑ دیتا ہے - وہ خوف یا لالچ کے ذریعے بچوں کو زبردستی اپنے ساتھ نہیں کھینچتا - بلکہ کام کی نوعیت ایسی ہوتی ہے اور وہ پیش اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ خود بخود اس کی طرف کھنچتے ہیں اور اس میں منہمک ہو جاتے ہیں - جوں جوں انہیں مشاغل میں کامیابی حاصل ہوتی ہے انہیں خوشی کا احساس ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت عمل میں اضافہ ہو رہا ہے - کسی مفید کام میں دلچسپی لینا، اور اس کو پوری توجہ اور محنت سے کرنا، اپنی ذات کو کم سے کم کچھ عرصے کے لیے اس میں کھو دینا، اور ہر منزل کو طے کرنے کے بعد یہ محسوس کرنا کہ ہماری علمی اور عملی قوتیں بڑھ رہی ہیں، یہ ایسی صورت حال ہے جس کی اخلاقی قدر و قیمت کا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا - کون کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں محض اسی سبب سے کس قدر ملال اور افسردگی، مایوسی اور ناکامی پائی جاتی ہے کہ اکثر لوگوں کو اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جس کو وہ مجبوراً روزی کمانے کے لیے کرتے ہیں؟ ان کو زندگی کا حقیقی لطف کبھی میسر نہیں ہوتا - وہ روزانہ کام کے اوقات میں اپنا آٹھ دس گھنٹے کا معمول بہت بد دلی کے ساتھ پورا کرتے ہیں اور اس کے بعد یا تو اس قدر تھک جاتے ہیں کہ کسی اور شغل میں حصہ ہی نہیں لے سکتے، یا نہایت ادنیٰ اور سستے تماشاگاہوں

میں جا کر چند گھنٹے کے لیے خود فراموشی خرید لیتے ہیں - حقیقت یہ ہے کہ روزمرہ کے کام کا اور ان جذبات کا جو اس کام سے وابستہ ہوں انسان کی تہذیب نفس اور اخلاق پر بہت گہرا اور پائدار اثر پڑتا ہے - لوگوں کے روحانی اضطراب اور ان کی اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ یہ نہیں کہ وہ بہت معمولی قسم کے کام کرتے ہیں اور انہیں اس میں بہت قلیل آمدنی ہوتی ہے - اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے کام ان کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں اور انہیں ان میں نہ دلچسپی ہوتی ہے نہ ہوسکتی ہے - اگر ایک خاکروب کو بھی اس امر کا سچا اور پورا احساس ہوجائے کہ وہ اپنے روز کے کام سے ایک نہایت اہم معاشری خدمت انجام دے رہا ہے اور اس کے بغیر نظام معاشرت میں بہت بڑی خرابیاں واقع ہوں گی تو اس کے کام کی نوعیت بالکل بدل جائے گی اور اسے خوش دلی، خلوص اور انہماک کے ساتھ کرے گا - اگر اس کے ساتھ ہی اور سب لوگوں میں بھی اس خدمت کی اہمیت کا احساس پیدا ہو جائے تو ان کا رویہ بھی اس کی جانب سے بدل جائے گا اور وہ اس کی اسی قدر عزت کرنے لگیں گے - لیکن جب کوئی شخص کارلائل کے لوہار کی طرح "ہتوڑے کی ہر چوٹ پر خدا کے دسوں قوانین توڑ ڈالے" تو اس کو اپنے کام میں کوئی مسرت نصیب نہیں ہوسکتی خواہ اس کی آمدنی اور معاشری حیثیت کتنی ہی زیادہ ہو - مدرسے کا ایک نہایت اہم اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کے دل میں کام کا ہر مفید اور دیانت دارانہ خدمت کا، احترام پیدا کرے اور ان کی شخصیت اور ان کی درسی اور معاشری مشاغل کے درمیان وہ

رشتہ جوڑے جو ایک ہنرمند دستکار یا صناع اور اس کے فن میں ہوتا ہے یعنی کام کی محبت اور عزت اور اس سے قلبی اور روحانی تعلق - اگر مدرسے میں طلبہ کو یہ بات حاصل ہوجائے تو وہ باہر نکل کر عملی زندگی یعنی اپنے کار و بار یا پیشے یا ملازمت میں بھی اسے قائم رکھیں گے - اس مقصد کے حصول کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور ذہنی آزادی پیدا کی جائے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ مدرسے میں ایسے مشاغل اور تعلیمی طریقوں کو رائج کیا جائے کہ وہ مل جل کر کام کرنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا سیکھیں اور ان میں معاشری خدمت کا ولولہ پیدا ہو - لیکن موجودہ صورت حال جس کا مختصر سا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اس کے بالکل برعکس ہے - مدرسوں میں بچوں سے کام لینے کے لیے مختلف قسم کی خارجی تحریکیں استعمال کی جاتی ہیں یعنی امتحان میں پاس ہونے اور نمبر پانے کا لالچ استاد کا خوف یا لحاظ ' اپنے ساتھیوں کی رقابت وغیرہ - اخلاقی نقطۂ نظر سے اس قسم کی محرکات عمل کو استعمال کرنا نہایت قابل اعتراض ہے - جب بچے سالہا سال تک ان اغراض کی بنا پر کام کریں گے تو ظاہر ہے کہ ان کی طبیعت پر اس کا مجموعی اخلاقی اثر بہت برا پڑے گا - نہ وہ کام کو کام سمجھ کر اس کی قدر کریں گے نہ ان میں کسی قسم کا معاشری احساس یا جذبہ پیدا ہوگا بلکہ تمام عمر اپنے ادائے فرائض کے لیے اسی قسم کے سہاروں کے محتاج رہیں گے - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب خارجی اثرات کارفرما نہ ہوں گے تو یا تو وہ برے راستے پر پڑ جائیں گے یا بالکل نکمے ہو کر وہ

جائیں گے اور ان پر جمود اور کاہلی غالب آجائے گی - اس لیے تربیت اخلاق کا مقتضا یہ ہے کہ طلبہ جلد سے جلد ان تحریصوں کے اثر سے آزاد ہوجائیں اور وہ جو کچھ کام مدرسہ میں کرتے ہیں اس کی حقیقی قدر کو پہچانیں اور یہ محسوس کریں کہ اس کا ان کی موجودہ اور آئندہ زندگی سے کس قدر قریبی تعلق ہے اور اس کو محنت اور خوش دلی سے انجام دینے سے انہیں نہ صرف اس وقت خوشی اور تقویت حاصل ہوگی بلکہ آگے چل کر بھی وہ بہت مفید ثابت ہوگا - لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر ہر قدم پر ذاتی مفاد کے ساتھ معاشری مفاد بھی مد نظر رہے تاکہ ان میں خود غرضی اور نفس پرستی نہ پیدا ہونے پائے -

طریقۂ تعلیم کے اس معاشری پہلو کی اہمیت دو وجوہ سے بہت زیادہ ہے - اول تو یہ وہ پہلو ہے جس سے ہمارے مدرسوں میں بہت زیادہ غفلت برتی گئی ہے - یعنی نہ تو نصاب کی ترتیب میں نہ طریقۂ تعلیم کے تعین میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ بچوں کو اشتراک عمل اور امداد باہمی کے موقع دیے جائیں - دوسرے ہمارے ملک کی سیاسی اور عمرانی حالت کا تقاضا ہے کہ نوخیز نسلوں میں باہمی وابستگی اور اتحاد مقاصد کے اس احساس کو پختہ کیا جائے اور مدرسوں میں اتفاق و یکجہتی کے ساتھ کام کرنے کی عادت ڈالی جائے - کیا ہمارے مدرسے اپنے موجودہ طریقۂ تعلیم کے ذریعے سے یہ تقاضا پورا کر رہے ہیں ؟ ہرگز نہیں - جیسا ہم نے ابھی بتایا ہے وہ طلبہ سے کام لینے کے لیے اُن کے ادنیٰ جذبات کو اُبھارتے ہیں - بہت سے اُستاد جو اپنے آپ کو نہایت

قابل اور ہوشیار سمجھتے ہیں نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں
کہ درسی تعلیم میں طلبہ کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرائیں۔
ایک بیدار مغز ہیڈ ماسٹر کا مجھے ذاتی تجربہ ہے جس
کا تعلیمی اصل اصول یہ ہے کہ ہر اُستاد روزانہ ہر طالب علم
کو نمبر دیا کرے تاکہ نمبر حاصل کرنے کی خواہش میں سب
طلبہ محنت اور توجہ سے کام کریں! ان تمام عقلمندیوں کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ طلبہ میں خود غرضی اور
نفسا نفسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور تقسیم عمل اور
تعاون کے ذریعے بڑے بڑے کام انجام دینے کے بجائے وہ سب
اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں اور یہ
کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح امتحان میں ایک دوسرے
پر سبقت لے جائیں اور استادوں کی نظر میں سرخ روئی
حاصل کریں۔ گویا انسانی کامیابی کا معیار متحدہ خدمت
نہیں بلکہ انفرادی برتری اور دائمی مسابقت ہے! اُستاد یہ
غلطی کرتے ہیں کہ اپنی تعلیم اور طلبہ کے محنت کے نتائج
کو بالکل خارجی اور مشینی معیاروں پر جانچتے ہیں۔
مختلف استعداد اور طبیعت کے طلبہ میں امتیاز نہیں کرتے
اور ان کی محنت کا اندازہ لگانے میں اور اس کی داد دینے
میں وسعت خیال اور ہمدردی سے کام نہیں لیتے۔ ان کے
نزدیک ذی روح افراد بھی گویا لکڑی کے پیمانے میں ناپے یا
اوجھے کی ترازو میں تولے جاسکتے ہیں۔ جو طالب علم مروجہ
امتحانوں میں اچھا رہتا ہے وہ ان کے نزدیک ہر طرح قابل
تعریف ہے اور اس کی کامیابی ان کے طریقۂ تعلیم کی کامیابی
کی دلیل ہے۔ باقی طلبہ جو امتحانوں میں اچھے نمبر

نہیں پاتے نالائق یا سست یا کام‌چور سمجھ لیے جاتے ہیں -
انہیں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ ممکن ہے اس ناکامی کی وجہ
ان کے طرز تعلیم کی خرابی یا طلبہ کا اختلاف طبائع ہو -
اس کا اثر دونوں قسم کے طلبہ پر بہت برا پڑتا ہے - جو طلبہ
امتحانوں کے معیار سے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ایسی
تیاری کرسکتے ہیں جس سے خوب نمبر حاصل ہوں وہ اپنی
جگہ پر بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں - ان کو اپنی قابلیت کا
غلط اور مبالغہ آمیز گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے لیے اور
زیادہ محنت کرنے اور قابلیت حاصل کرنے کی کوئی تحریص
نہیں رہتی - کسی شخص کو نوعمری ہی میں یہ خیال پیدا
ہو جانا کہ وہ معراج کمال پر پہنچ گیا ہے اس کی ذہنی
قوتوں کو بالکل معطل کردیتا ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس
قسم کے تیز طالب علم اپنی محدود کامیابی سے پوری طرح
مطمئن ہو جاتے ہیں اور ان کی آئندہ ترقی قطعاً مسدود
ہو جاتی ہے - برخلاف اس کے کمزور طلبہ میں یعنی ان طلبہ
میں جو امتحان میں نمبر نہیں پاسکتے احساس شکست
پیدا ہو جاتا ہے - ان کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے' حوصلہ پست
ہو جاتا ہے اور کچھ مقابلے میں ناکامیاب رہنے سے' کچھ استاد
کی دل‌شکن باتوں سے انھیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ان میں
کسی طرح کی قابلیت نہیں - یہ احساس کم‌مائگی
بھی انسان کے لیے بہت مضر ہے - کیونکہ یہ ترقی کی
خواہش اور حوصلے کی بالکل بیخ‌کنی کردیتا ہے اور طبیعت
پر مایوسی اور افسردگی چھا جاتی ہے - یہ خرابیاں تو تمام
طلبہ کے لیے مشترک ہیں لیکن اس نظام تعلیم میں سب

سے زیادہ نقصان اُن بچوں کو پہنچتا ہے جو فطرتاً زیادہ زود حس ہوتے ہیں، جن کا رجحان طبع زیادہ غور و فکر کی طرف یا فنون لطیفہ کی طرف ہوتا ہے - وہ مثلاً کسی علمی کتاب یا مضمون کا مطالعہ کر کے اس کے مطالب کو خوب سمجھ سکتے ہیں اور تحریر و تقریر میں اس پر بہت اچھی طرح بحث کر سکتے ہیں یا کوئی عمدہ نظم پڑھ کر اس سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں یا مصوری یا دستکاری میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں - مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ امتحانوں میں بھی اچھے رہیں کیونکہ وہاں انہیں اپنے ذوق اور مطالعے کے بہترین نتائج فرصت اور دلجمعی کے ساتھ پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا - بلکہ کم سے کم وقت میں ایک خاص طرح کی واقفیت کا اظہار کرنا ہوتا ہے جس کا گر ہر شخص کو نہیں آتا - ان کی برتر اور لطیف‌تر صفات کا نہ کوئی امتحان ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے - گزوں سے ناپنے والا معلم اپنے سطحی پیمانے سے سوائے طول کے اور کچھ نہیں ناپ سکتا - طبیعت کی شائستگی اور گہرائی، ذوق حسن، معاشری احساس شہادت کی قابلیت، اور اس قسم کی تمام اعلیٰ صفات کو نظرانداز کر دیتا ہے اور ایسے طالبہ کی قدر کرتا ہے جن کو وہ نمائشی اور سطحی لیاقت ہوتی ہے جس کا اندازہ ان امتحانوں کے ذریعے آسانی سے ممکن ہے - اسے یہ معلوم نہیں کہ انسان کی روح راز سربستہ ہے اور کیا عجب ہے کہ جس وقت طالب علم کی قوتیں بظاہر خوابیدہ معلوم ہوتی ہوں اور وہ اپنے درسی مشاغل اور معمول کی طرف سے بےتوجہی برتتا ہو، بقول برگسان (Bergson) کے ”وہ اپنی ہستی کی

گہرائیوں میں ایک نئی شخصیت کی تشکیل میں مشغول ہو" ایسی شخصیت کے معلم کو خاص طور پر احترام کرنا چاہیے - کیونکہ علمی اور تخلیقی کاموں کے لیے عموماً اُنہیں صفات کی ضرورت ہے جو امتحانوں کی کسوٹی پر نہیں کسی جاسکتیں - تجارتی اور اقتصادی معاملات میں یقیناً مقابلے اور مسابقت کی بہت گنجائش ہے لیکن علمی مشاغل اور فنون لطیفہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اشتراک احساس اور اشتراک عمل کا قانون کارفرما ہے - اس لیے مدرسے میں ہمیں تمام درسی مشاغل کی تنظیم اسی قانون کے مطابق کرنی چاہیے اور ان مشاغل کو بچوں کے سامنے ایسے انداز میں پیش کرنا چاہیے کہ اُنہیں ان سے وہی خوشی حاصل ہو جو ایک محقق یا صناع کو اپنے کام سے ہوتی ہے - وہ خوشی نہیں جو محض عارضی تفریح کے مرادف ہے بلکہ وہ جو شوق اور انہماک کے ساتھ کام کرنے سے پیدا ہوتی ہے - مدرسے میں دستکاری اور عملی مشاغل رائج کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُن میں اجتماعی مقاصد کے لیے کوشش کرنے کا موقع ملتا ہے اور طلبہ میں معاشری اتحاد اور یکجہتی کا احساس پیدا ہوتا ہے - بقول پروفیسر ڈیوئی :—

"ہر ایسے طریقۂ عمل کو مدرسے میں رائج کرنے سے، جو بچے کے عملی رجحانات کو اُبھارے اور اس کی قوت تعمیر و تخلیق کی تربیت کرے، ایسے مواقع پیدا ہوتے ہیں کہ اس کے اخلاقی احساس کا مرکز ذاتی اور خود غرضانہ مشاغل سے ہٹاکر معاشری خدمت کی طرف منتقل کر دیا جائے -" [1]

---

[1] Educational Essays—1 صفحہ ۲۱ -

لیکن اگر مدرسے کو محض رسمی درس کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہ ہو، اور سیکھنے اور کرنے، علم و عمل میں ربط قائم نہ کیا جائے تو سیرت کی تشکیل اور علم کی تحصیل میں کوئی تعلق پیدا نہ ہوگا اور اس کی وجہ سے دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ پر ناقص رہ جائیں گی اسی سبب سے اکثر ماہرین تعلیم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دستکاری کو نصاب میں محض ایک جداگانہ مضمون کے طور پر داخل کرنا کافی نہیں بلکہ اس کو تمام مضامین نصاب میں ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیے۔ اگر معلم طریقۂ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کریں اور مدرسے کے نصاب اور مشاغل اور تعلیمی طریقوں کو اس طرح منظم کریں کہ طلبہ میں مذکورۂ بالا صفات پیدا ہوں تو تعلیم میں ایک انقلاب عظیم ہو جائے گا۔ مدرسے کی اخلاقی تربیت محض حلقۂ درس اور اوقات تعلیم تک محدود نہ رہے گی بلکہ وہ ہر وقت اور ہر کام کے ذریعے اس کام کو انجام دے گا۔ اس حالت میں طلبہ کے تمام مشاغل کی ایک اخلاقی اہمیت ہوگی اور ان سے ان کو اخلاقی سیرت کی تشکیل میں مدد ملے گی۔ تحصیل علم میں صحیح طریقۂ عمل اختیار کرنے کی بدولت جو صفات طلبہ میں نشو و نما پاتی ہیں وہ محض علمی اور ذہنی اعتبار سے نہیں بلکہ اخلاقی اور عمرانی لحاظ سے بھی نہایت قابل قدر ہیں۔ معاملات پر غیر جانبداری اور بے تعصبی سے غور کرنا، کام میں خلوص اور انہماک، وسعت نظر، استقلال اور حوصلہ، اجتماع توجہ، اعتماد ذات، احساس و ذمہ داری، یہ تمام چیزیں اخلاقی سیرت کا جزو لازم ہیں۔ جس شخص میں یہ صفات پائی جائیں گی وہ ہر کام کو، خواہ اس کا تعلق کسی شعبۂ زندگی سے ہو، ایمانداری اور قابلیت کے ساتھ انجام دے گا۔

باب چہارم

ضبط و تادیب کا نظریۂ جدید

طلبہ کی سیرت کی تشکیل میں مدرسے کے قواعد اور قوانین اور ضبط و تادیب کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ طریقۂ تعلیم کی بحث میں ہم نے بتایا ہے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور امداد باہمی کی عادت ڈالنی ضروری ہے۔ اور اگر یہ صحیح اصولوں پر مرتب کیا جائے تو درس اور تدریس کے ضمن میں ان صفات کی نشو و نما خود بخود ہو جائے گی۔ لیکن ان صفات کی ضرورت علاوہ علمی کاموں کے زندگی کے دوسرے تعلقات اور فرائض میں بھی پڑتی ہے۔ مثلاً معاشری مشاغل میں عمرانی فرائض کی ادائگی میں اور ہر قسم کے ذاتی مشکلات سے عہدبرا ہونے میں۔ معلم کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ان فرائض کے لیے طلبہ کو کس طرح تیار کرے۔ جب بہت سے ہم عمر اور ہم مقصد بچے ایک مدرسے میں جمع ہوتے ہیں، ساتھ لکھتے پڑھتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں کھیلتے کودتے ہیں تو ان میں علاوہ علمی تعلقات کے بہت سے معاشری تعلقات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں آپس میں دوستی ہو جاتی ہے، جن مقاصد میں انہیں مشترک طور پر

دلچسپی ہوتی ہے ان کے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد سے کوشش کرتے ہیں، کلب اور انجمنیں بناتے ہیں، انفرادی آزادی کو برقرار رکھنے اور اجتماعی نظام قائم کرنے کے لیے قاعدے بناتے ہیں تاکہ ہر فرد اور ہر گروہ اپنا اپنا کام بغیر خارجی مداخلت کے کرسکے خواہ اس کا تعلق درسی مشاغل سے ہو یا فرصت کے اوقات کی تنظیم و تعمیر سے - اس طرح رفتہ رفتہ مدرسے میں معاشری روایات قائم ہوجاتی ہیں اور عمل کے اخلاقی معیار بن جاتے ہیں - اس میں ایک خاص ''فضا'' پیدا ہو جاتی ہے جس سے تمام طلبہ خود بخود متاثر ہوتے ہیں - ہر نیا طالب علم بہت جلد ان روایات کو اور رائے عامہ کے احکام کو قبول کر لیتا ہے - اس قسم کی معاشری زندگی اور اس کے اثرات مدرسوں میں ہمیشہ سے چلے آتے ہیں لیکن اس کی اہمیت پوری طرح ابھی تک نہیں سمجھی گئی - البتہ جدید نظریۂ تعلیم نے اس کو مدرسے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر مانا ہے اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ معلموں کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے - مدت تک استادوں نے طلبہ کے باہمی میل جول کی طرف سے یا تو بالکل بے اعتنائی برتی یا اس کو قابل اعتراض جان کر روکا کیونکہ وہ تو درسی تعلیم کے علاوہ ہر چیز کو مدرسے کے مقصد کے خلاف سمجھتے تھے - لیکن باوجود اس کے بچے اکثر اپنی فطرت کے مقتضا سے مجبور ہو کر مدرسوں میں معاشری زندگی کی بنیاد ڈال لیتے ہیں اور کھیلوں میں بالخصوص اس کا اظہار ہوتا ہے - مگر ہمارے معلموں نے اب تک اس کی باقاعدہ تنظیم کر کے اس سے اخلاقی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی -

ملکوں مثلاً انگلستان ، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی
کے بہت سے مدرسوں میں طلبہ کی اجتماعی
مطالعہ کیا گیا ہے ۔ اور اس کے نفسی و معاشری
کتابیں لکھی گئی ہیں جن کے مطالعے سے
ں کے تجربے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ آپس
طلبہ کی سیرت پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے اور اگر
ولوں پر منظم کیا جائے اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا
محسوس طریقے پر طلبہ کی سیرت کو بہترین
ال سکتا ہے اور اپنی طرف سے خواہ مخواہ
ت کیے بغیر معاشری ضبط و تادیب سے کام
ں کی مداخلت کو بچے اور نوجوان خوشی سے

ہم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مدرسے کے ماحول
د افراد کی تربیت میں بہت دخل رکھتا ہے
فائدہ اس وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب معاشری
خود طلبہ کے ہاتھ میں ہو اور اسکول کی
و نظام کی بنیاد ان کے معاشری احساس پر
بالفاظ دیگر ان میں حکومت خوداختیاری
اور اس چھوٹی سی ریاست کا انتظام ، اور
ور اختلافات کی گتھیوں کو سلجھانے کا کام
کر دیا جائے ۔ جب تک انہیں معاشری
دی عمل حاصل نہ ہوگی وہ باہمی مشورے
ندگی کے مسائل کو طے کرنا اور اپنی غلطیوں
سبق حاصل کرنا نہیں سیکھیں گے ، اور نہ ان

میں اعتماد ذات پیدا ہوگا نہ باہمی مراعات و مفاہمت کی عادت ' جس پر تمدنی زندگی کا انحصار ہے - خصوصاً موجودہ زمانے کا جمہوری نظام ایسے افراد کا طالب ہے جن میں اعتماد ذات کے ساتھ دوسروں پر بھروسا کرنے کی صلاحیت بھی ہو ' جن میں اجتماعی اتحاد اور شہریت کے فرائض کا پورا احساس ہو ' جو موقع پر قیادت کا کام انجام دے سکیں اور ضرورت کے وقت خلوص اور وفاداری کے ساتھ اپنے قائد کی اطاعت کرنے کو تیار ہوں - ہماری تعلیم گاہیں ' جمہوری شہریت کے لیے موزوں افراد اسی حالت میں پیدا کرسکتی ہیں جب ان کی اندرونی تنظیم خود مختار جماعتوں کی سی ہو اور اس کے طلبہ کو ذمہ دارانہ طریقے پر انتظامی فرائض ادا کرنے کا موقع ملے - جن مدارس میں حکومت خود اختیاری کا تجربہ کیا گیا ہے اور مطالعہ کے کمروں ' کھیل کے میدانوں اور دارالاقامہ میں طلبہ کو آزادی کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں بھی دی گئی ہیں وہاں بالعموم بہت عمدہ نتائج حاصل ہوئے ہیں اور ان کے طلبہ نے اعتماد ذات ' قوت عمل اور معاشری رواداری کا ثبوت دیا ہے - ان مدرسوں کے معلموں کو اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ہر وقت جاسوس کی طرح اپنے شاگردوں کی غلطیوں اور شرارتوں کی ٹوہ میں رہیں اور نکتہ چینی اور عیب جوئی کا ناگوار فرض ادا کرتے رہیں جن کی وجہ سے اکثر استادوں اور شاگردوں کے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں - وہاں ضبط و تادیب کے فرائض طلبہ خود انجام دے لیتے ہیں - معلموں کو اتنی مہلت ملتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت سے اس چھوٹے سے معاشرے کی علم فضا پر عمدہ اثر ڈالیں - اس کے

افراد فرائض اور ذمہ‌داریوں کو آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی اپنے کام میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ خود اس سے بازپرس کرتے ہیں اور اس کے لیے سزا تجویز کرتے ہیں - علاوہ بریں اس انتظام میں ان طلبہ کو قیادت اور سرداری کے فرائض انجام دینے کا موقع ملتا ہے جو فطرتاً اس کے اہل ہوتے ہیں اور باقی سب مل جل کر احکام کی تعمیل کرنا سیکھتے ہیں -

حکومت خود اختیاری کے تجربات صرف عام مدارس ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ بعض ماہرین نفسیات اور معلموں نے انہیں نوعمر مجرموں کی اصلاح اور تعلیم میں بھی استعمال کر کے دیکھا اور بہت کامیاب پایا - ان کی تجویز یہ تھی کہ ان مجرموں کو جو بالعموم شہروں کی خراب اور گمراہ کرنے والے ماحول ہی میں بگڑتے ہیں وہاں سے نکال کر ایسی جگہ منتقل کیا جائے جہاں ان کو آزادی کی فضا ملے اور خود اپنی زندگی کو نئے سرے سے تنظیم کرنے کا موقع حاصل ہو - چنانچہ یہی ہوا اور یہ نوجوان اور بچے ان اصلاحی مدارس یا بستیوں میں رکھے گئے جہاں حکومت خود اختیاری کے اصولوں کی کار فرمائی تھی - یہ لوگ خود قانون بناتے تھے اور تمام ذمہ‌داریوں اور فرائض کو آپس میں تقسیم کر لیتے تھے - ان پر کوئی بیرونی تعزیر عائد نہیں کی جاتی تھی بلکہ جو افراد جماعت کے قانون کی خلاف‌ورزی کرتے تھے جماعت ان کو خود ہی سزا دے لیتی تھی - ان پر ایک بہت بڑا اصلاحی اثر یہ ڈالا گیا کہ ان کے لیے خود اپنی محنت سے روزی کمانا لازم کر دیا گیا اور اس طرح انہیں

باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے کی عادت پڑی جو اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے بہترین چیز ہے - جو اراکین جماعت ابتدا میں چند روز یا چند ہفتے تک اپنی پرانی عادتوں کی وجہ سے کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے ان کے لیے کوئی جسمانی سزا مقرر نہیں تھی لیکن انھیں اپنے ساتھیوں کی خیرات پر گزارہ کرنا پڑتا تھا جس سے زیادہ تکلیف دہ اور شرمناک محتاجی اور کیا ہو سکتی ہے؟ چنانچہ اس کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا تھا کہ وہ خود ہی کام کرنا شروع کر دیتے تھے اور جماعت کے فرائض میں شریک ہو جاتے تھے - اس طرح اکثر نوجوانوں کے مجرمانہ رجحانات کی اصلاح بہت جلد ہوگئی اور ان میں وہ عادتیں پختہ ہونے لگیں جو کامیاب اور مفید شہری بننے کے لیے ضروری ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو محنت اور باقاعدہ کام کرنے کی ذمہ داری سے ان کی طبیعت کی اصلاح ہوتی اور دوسری طرف ان کی بہت سی عملی صلاحیتیں اور مفید حوصلے جن کو واقعات اور حالات نے دبا رکھا تھا اور اسی وجہ سے ان کے نفس میں ایک مستقل اور مسلسل کشمکش رہتی تھی اب مناسب صورتوں میں ظاہر ہونے لگے - آزادی اور ذمہ داری کی اس نئی فضا میں آنے والے افراد کو یہ محسوس ہوا کہ اب وہ کسی بیرونی اور خارجی طاقت سے بر سر پیکار نہیں جو ان کی مخالفت پر آمادہ ہے بلکہ اپنے ہی ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں جو کچھ عرصے پہلے انھیں کی طرح معاشرے اور اس کے قوانین سے باغی تھے لیکن اب اس جماعت کے ذمہ دار اراکین بن گئے ہیں جو خود قانون وضع کرتے ہیں اور خود ہی

اسے نافذ کرتے ہیں - اس لیے اس قانون کی مخالفت میں نہ انہیں کوئی لطف آتا ہے نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے - لہذا رفتہ رفتہ جماعتی زندگی کے اصول اور قوانین کو قبول کر کے بقول شخصے "جنگل کے چور ہی جنگل کے محافظ بن جاتے ہیں" اور کچھ عرصے کے بعد اس قابل ہوجاتے ہیں کہ ان کی اصلاحی بستیوں سے نکل کر معاشرت کی طبعی زندگی میں بحیثیت ذمہ دار شہریوں کے حصہ لے سکیں - اگر یہ لوگ ایسی فضا میں نہ رکھے جاتے جو اخلاقی تربیت کا وسیلہ ثابت ہوتی ہے تو وہ بھی معمولی مجرموں کی طرح جیل خانوں میں رہ کر مختلف قسم کی سزائیں اور معاشرے کی مخالفت برداشت کر کے عادی جرائم پیشہ بن جاتے اور تمام عمر معاشرتی اور اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کرتے رہتے - ان تجربوں کی نہایت دلچسپ اور سبق آموز تفصیل بہت سی جدید تعلیمی تصانیف میں بیان کی گئی ہے - جن میں سے ہومر لین (Homer Lane) کی کتاب "Little Commonwealth" اور امریکا کی ایک اصلاحی بستی "George Junior Republic" کے حالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں - اس کے نفسیاتی پہلو سے سرل برٹ (Cyril Burt) نے جو ایک انگریز عالم نفسیات ہیں ' اپنی مستند اور قابل قدر کتاب "The Young Delinquent" (نوعمر مجرم) میں بحث کی ہے - علمی تحقیق اور عملی تجربات دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ حکومت خود اختیاری کے طریقے اور تجربات صرف انہیں طلبہ کے لیے مفید نہیں جو بعض خارجی یا خلقی اسباب کی وجہ سے دماغی کمزوریوں اور اخلاقی خرابیوں

میں مبتلا ہیں بلکہ مدرسوں کے معمولی طالبہ کے لیے بھی، جن کی دماغی اور اخلاقی حالت طبعی ہے، اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کارآمد ہیں، کیونکہ ان طالبہ کو سابقہ خرابیوں اور کمزوریوں کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑتی بلکہ شروع ہی سے آزادی کی فضا میں ان کی تربیت کی صحیح بنیاد پڑجاتی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری میں اخلاقی اصول و قوانین کی پابندی کرنا سیکھ لیتے ہیں -

ہم نے حکومت خود اختیاری کے جو اصلاحی اور طبعی فوائد بیان کیے ہیں ان میں بہت اختصار سے کام لیا ہے اور بہت سی ایسی عملی مشکلات سے بحث نہیں کی جو اس کے دوران میں پیدا ہوتی ہیں اور بعض اوقات اس تجربے کو کامیاب نہیں ہونے دیتیں - لیکن ہم نے اپنی بحث قصداً اصولوں تک محدود رکھی ہے اور جہاں تک اس اصول کا تعلق ہے جس پر حکومت خوداختیاری کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کی صحت اور مقبولیت میں شک و شبہے کی گنجائش نہیں گو اسے عمل میں لانے کے لیے بہت کچھ احتیاط اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے - ضبط و انضباط کا یہ نیا نظریہ جو آزادی اور ذمہ داری کے ستونوں پر قائم ہے اور دونوں کو برابر اہمیت دیتا ہے ادب و تادیب کے پرانے اصولوں سے بہت مختلف ہے - اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ہمیں پھر ایک بار اس غلط نفسی عقیدے کی تردید کرنا چاہیے جس کا ہم نے اس حصے کے باب اول میں ذکر کیا ہے اور جس کی وجہ سے اخلاق کے مفہوم کے متعلق غلط فہمیاں پھیل گئی

ھیں - اکثر زبانوں میں' زیادہ‌تر مذھب کی تعلیم کی وجہ سے' یہ خیال رائج رہا ھے کہ انسان بالطبع شر کی طرف مائل ھے اور بہت کچھ مشکلیں اور تکلیفیں اٹھانے' اور اپنے نفس کو مارنے کے بعد' وہ ایک حد تک خیر کی طرف قدم بڑھا سکتا ھے - مذھب عیسوی کے نظریۂ اخلاق و نجات کی بنیاد اسی عقیدے پر رکھی گئی ھے اور جہاں کہیں رھبانیت اور ریاضت کی تعلیم دی گئی ھے وھاں کسی نہ کسی شکل میں اسی خیال کی کارفرمائی پائی جاتی ھے - اس نظریے کے مطابق انسان کے نفس میں قوت ارادی اور خواھشات کے درمیان ھمیشہ جنگ رہتی ھے - خواھشات اس کو برائی اور بدی کی جانب لے جاتے ھیں اور قوت ارادی کا یہ کام ھے کہ وہ اس کو جبراً اُس راہ پر چلنے سے روکے - گویا وہ ایک مستقل اور قائم بالذات قوت ھے جس کو فطری خواھشات اور میلانات سے کوئی اندورنی تعلق نہیں' سواے اس بیرونی تعلق کے کہ ان کی مخالفت اور روک تھام کرے - یہ قوت ارادی "ضمیر" کہلاتی ھے اور انسان کا دل ایک "رزم‌گاہ خیر و شر" سمجھا جاتا ھے - یہاں شر کے معنی ھیں انسان کے جبلی میلانات اور "خیر" نام ھے اس قوت ارادی یا ضمیر کا جو اسے نیکی کی طرف کھینچتا ھے - اس نقطۂ نظر کے مطابق سواے خاص خاص لوگوں کے جو غیر معمولی اخلاقی قوت اور روحانیت رکھتے ھیں اور کوئی شخص ان بری خواھشات کو پوری طرح زیر نہیں کر سکتا - البتہ تادیب نفس کے ذریعے ایک حد تک انہیں قابو میں رکھ سکتا ھے' جس طرح معاشری زندگی میں پولیس مجرموں کا خاتمہ نہیں کر سکتی لیکن ان کو

تھوڑا بہت دبائے رکھتی ہے -

فطرت انسانی کی اس تفسیر نے تعلیم اور تادیب کے نظام پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے - اس کی رو سے نہ صرف بالغین کی بلکہ بچوں کی فطرت بھی قدرتاً شر کی طرف مائل ہے اور اس کی اصلاح کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اوائل عمر ہی سے رکاوٹوں' بندشوں اور سزاؤں سے کام لیا جائے اور بچوں کی فطری میلانات اور خواہشات جو خرابی کی جڑ ہیں' ابھرنے نہ دی جائیں - ان کی روح کی نجات اسی میں ہے کہ وہ بے چون و چرا ان تمام قواعد اور احکام کی پابندی کریں جو والدین اور اُستاد ان پر عائد کرتے ہیں خواہ ان کا مطلب اور فائدہ ان کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے - ہر معاملے میں انہیں اپنی ذاتی خواہشات کو دبانا اور روکنا چاہیے کیونکہ خواہش کی راہ پر چلنا شیطان کو اس کے کام میں مدد دینا ہے - انگلستان کے مشہور فلسفی جان لاک (John Locke) کا نظریۂ تعلیم و تادیب بہت کچھ اس خیال کی نمائندگی کرتا ہے - اس کا تعلیمی اصول یہ تھا کہ :—

بچے کی روح کو ہلاکت سے بچانے کے لیے اس کی خودی کو پامال کرو'' -

لیکن صدیوں کے تجربے نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اگر ضبط و تادیب کی بنیاد محض خارجی خوف اور بیرونی بندشوں پر رکھی جائے گی تو اس کے نتائج بہت خراب ہوں گے - یا تو طلبہ میں عمل کا حوصلہ اور ولولہ بالکل نہیں رہے گا اور وہ اپنی قوت ارادی اور جذبات کو برے کیا اچھے کاموں کے لیے بھی استعمال نہ کر سکیں گے - یا وہ

کھلم کھلا ان بندشوں کی مخالفت کریں گے جن کی وجہ سے مدرسے میں استادوں اور شاگردوں میں ہر وقت ایک کشمکش رہے گی جو تعلیم کی کامیابی میں حارج ہوگی' یا انہیں کھلے بندوں مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو ان کی مخالفت دریردہ اور بھی گہری ہو جائے گی یعنی داخلی اور نفسی کشمکش کی کیفیت اختیار کرے گی جو دماغی اور اخلاقی صحت کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ صورت ہے - حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی دماغی اور اخلاقی صحت اور مدرسے کا ضبط و انتظام اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب طلبہ اپنے کام میں دلچسپی لیں' مدرسے کے قانون کو سمجھ کر اس کا احترام کریں' خود اس کے بنانے میں شریک ہوں اور اس کی پابندی کرنے اور کرانے کو اپنا ذاتی فرض تصور کریں - برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) ضبط کے اس مفہوم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

''جب طلبہ ان کاموں میں مشغول ہوتے ہیں جو ان کو خود مرغوب ہیں تو بیرونی ضبط و تادیب کی ضرورت ہی نہیں پڑتی - چند سیدھے سادھے قاعدے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں کافی ہیں مثلاً یہ کہ کوئی بچہ دوسرے بچوں کے کام میں مداخلت نہ کرے' ایک وقت میں ایک سے زیادہ اپریٹس (apparatus) استعمال نہ کرے وغیرہ وغیرہ - وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ قاعدے مناسب اور قرین عقل ہیں - اس لیے ان کی پابندی میں دقت نہیں ہوتی - اس طرح بچے میں ضبط نفس پیدا ہوتا ہے جو دو چیزوں پر مشتمل ہے' ایک تو کسی

حد تک اچھی عادتوں پر دوسرے اس احساس پر جو عملی مثالوں کے ذریعے پیدا ہوتا ہے' کہ بعض اوقات انجام‌کار فائدہ اسی میں ہے کہ آئندہ نفع کے لیے موجودہ خواہش روک لی جائے - لوگوں کو ہمیشہ سے یہ بات معلوم ہے کہ کھیلوں میں اس قسم کا ضبط نفس آسانی سے حاصل ہوتا ہے - لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ تحصیل علم بھی اتنی دلچسپ بنائی جا سکتی ہے کہ اس میں وہی محرکات عمل کارفرما ہوں جو کھیلوں میں............اس کا اصل اصول بہت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی ضبط بیرونی جبر اور دباؤ کے مرادف نہیں بلکہ ان ذہنی عادتوں پر منحصر ہے جن کی وجہ سے بچہ خود بخود برے اور ناپسندیدہ کاموں کے بجائے اچھے اور پسندیدہ کاموں کی طرف راغب ہوتا ہے'' ! -

اس خیال کے خلاف ایک لازمی رد عمل یہ ہوا کہ بعض معلموں اور مفکروں نے اس کے بالکل برعکس نقطۂ نظر اختیار کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ بچہ ابتدائی عمر میں تمام‌تر خیر و خوبی کا مجسمہ ہوتا ہے اور اس میں جو کچھ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ماحول کے اثر اور اپنے ساتھیوں اور بزرگوں کی بری مثال کا نتیجہ ہیں - روسو نے اس خیال کی نمائندگی کی ہے وہ کہتا ہے کہ :-

''ہر چیز جب خالق فطرت کے ہاتھوں سے نکل کر آتی ہے' اچھی ہوتی ہے لیکن انسان کے ہاتھ میں آکر خراب ہو جاتی ہے - ''

On Education— صفحہ ۲۹ -

انھیں خیالات کو شاعرانہ پیرائے میں ورڈز ورتھ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی نظموں میں جا بجا بیان کیا ہے - بالخصوص اس کی مشہور نظم ''اوائل عمر میں حیات ابدی کے نشانات'' ۱ کا موضوع یہی مسئلہ ہے :—

''ہم بچپن میں آسمان سے جو ہمارا گھر ہے' اُترتے ہیں اور ہمارے پیچھے پیچھے روحانی عظمت و جلال کے بادل امڈے چلے آتے ہیں -''

اس نقطۂ نظر کی رو سے انسان میں کوئی فطری قوتیں ایسی نہیں ہوتیں جو اس کو برائی کی طرف لے جا سکیں - اس کی طبیعت کا میلان سراسر خیر کی جانب ہوتا ہے - اگر معاشرے کے خراب اثرات اس پر نہ پڑیں اور تربیت صحیح اصولوں پر کی جائے تو وہ بہت عمدگی اور آسانی سے ایک مفید شہری اور با اخلاق انسان بن جائے گا - اسی سے مدرسے کے ضبط و تادیب کے متعلق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کو اور افراد کو بچوں کی نشو و نما میں کم سے کم مداخلت کرنی چاہیے اور اُنھیں جہاں تک ممکن ہو ان کی فطرت پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اس کے قوانین کے مطابق تربیت پائیں اور ماحول کے خراب اثرات کی وجہ سے ان کی نفسی اور اخلاقی ارتقاء میں رکاوٹ نہ پیدا ہو - جن معلموں نے روسو (Rousseau) وغیرہ کی پیروی میں اس اصول پر عمل کیا انھوں نے حتی الامکان مدرسوں سے سزاؤں بندشوں اور بیرونی قواعد اور ضابطوں کو اُٹھا دیا اور طلبہ کو

---

1 — Ode on the Intimations of Immortality especially in early childhood.

آزادی دے دی کہ وہ ایک وسیع دائرے کے اندر جو چاہے کریں یعنی اپنی فطرت کے مقتضا کے موافق جن مشاغل کو چاہیں اختیار کریں -

یہ خیال بہت دل خوش‌کن معلوم ہوتا ہے اور اکثر نر مزاج معلموں کے دل کو لگتا ہے، اور دنیا کے بہت سے مصلحو اور نوع انسانی کے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے اپنی اصلاح تجاویز کی بنیاد اسی پر رکھی ہے - لیکن واقعات کا لحا کرتے ہوئے یہ خیال بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا وہ خیال انسان بالطبع شر کی طرف مائل ہے . در اصل یہ دونوں نظر تصویر کے دو مختلف رخوں کو دکھاتے ہیں اور جیسا کہ قاعد ہے مبالغے کے ساتھ اپنے اپنے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہیں حقیقت ان دونوں کے وسط میں ہے یعنی ہمیں ایک طرف یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بچے فطرتاً شر کی طرف مائل نہیں اور دوسری طرف یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں بعض ایس جبلتیں ہیں جو غلط راہ پر پڑ کر اخلاقی خرابیوں کی شک اختیار کر سکتی ہیں - بچے کو نہ تو بری جبلتوں کا غا سمجھنا چاہیے جن کے ہاتھ وہ اتنا بے‌بس ہے کہ جب تک ا کو ریاضت اور نفس‌کشی کے ذریعے زیر نہ کرے نیک نہیں ہ سکتا - نہ اس کو ماحول کی قوتوں کے ساتھ اس حد تک وابستہ تصور کرنا چاہیے کہ اس کی اصلاح اور تخریب دونو ان پر منحصر ہیں - حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی حد تک خو اپنی سیرت اور اپنے کردار کا خالق ہے، اور اپنی جبلی قوتو اور ماحول کے وسائل اور اثرات سے کام لے کر اپنی زندگی بنانا اور بگاڑنا اسی کے اختیار میں ہے - موجودہ علم نفسیات

اس مسئلے پر اس طرح روشنی ڈالتا ھے کہ بچے کو اوائل عمر میں اخلاقی اعتبار سے نہ اچھا کہہ سکتے ھیں نہ برا - اس کی ابتدائی حرکات، جو محض اس کی جبلتوں کا سیدھا سادہ اظہار ھیں، کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتیں یعنی کسی اخلاقی معیار پر نہیں پرکھی جاسکتیں - اس کی مخصوص اور قوی جبلتیں بھی مثلاً تجسس، تعمیر، اظہار خودی، نقل وغیرہ اپنی ابتدائی شکل میں اخلاق سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں - اس لحاظ سے ھم کہہ سکتے ھیں کہ سوائے ان غیر طبعی صورتوں کے جب آبائی توارث کے خراب اثرات جسمانی اور دماغی کمزوریوں اور برے میلانات کی شکل میں ظاھر ھوں، بچے اوائل عمر میں خیر و شر سے بری ھوتے ھیں یعنی ھم ان کے عمل پر کوئی اخلاقی حکم نہیں لگا سکتے، نہ ان کو اپنے افعال کا ذمہ‌دار ٹھہرا سکتے ھیں - لیکن یہ ضرور ھے کہ ان لا اخلاقی جبلتوں اور رجحانوں میں خیر و شر دونوں کے امکانات پوشیدہ ھیں اور یہ امر ماحول کے اثرات، تعلیم، تربیت اور خود بچے کی اپنی کوشش پر منحصر ھے کہ یہ آئندہ چل کر کیا رنگ اختیار کریں گے، آیا اخلاق حسنہ کی شکل میں ظاھر ھوں گے یا اخلاقی عیوب کی صورت میں - رسل (Russel) اپنی کتاب میں اس بات کو بہت صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرتا ھے :

''حقیقت یہ ھے کہ بچے فطرتاً نہ ''اچھے'' ھوتے ھیں نہ ''برے'' وہ صرف چند اضطراری افعال اور جبلتیں لے کر پیدا ھوتے ھیں - انھیں کی بنیاد پر، ماحول کے اثر سے عادتیں نشو و نما پاتی ھیں جو اچھی بھی ھو سکتی ھیں

اور بری بھی - ان کا یا اچھا یا برا ھونا زیادہ تر ماؤں اور کھلائیوں کی عقل پر منحصر ھے کیونکہ اوائل عمر میں بچوں کی طبیعت بےحد شکل پذیر ھوتی ھے - اکثر بچوں میں اچھے شہری بننے کی صلاحیت بھی ھوتی ھے اور مجرم بننے کی بھی - علم نفسیات کے مطالعے سے ھمیں معلوم ھوتا ھے کہ ہفتے میں چھ دن بچوں کو زد و کوب کرنے اور ساتویں دن وعظ اور تلقین کرنے کا دستور ان کو نیک بنانے کا صحیح طریقہ نہیں - لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاھیے کہ اخلاقی تربیت کی کوئی صورت ھی نہیں ھے - کسی تندرست بچے کو خوش رکھنا مشکل نہیں اور اگر بچوں کے جسم اور دماغ کی مناسب نگہداشت کی جائے تو وہ بالعموم خوش رہتے ھیں بچپن میں خوش و خرم رہنا بہترین قسم کا انسان بننے کے لیے بالکل لازمی ھے - اگر بچے یہ محسوس کریں گے کہ تعلیم کے ذریعے وہ مفید باتیں سیکھ رہے ھیں تو ان میں کاہلی کی وہ عادت پیدا نہ ھوگی جس کو ڈاکٹر آرنلڈ اخلاقی عیب سمجھتے ھیں - برخلاف اس کے اگر بچے کو جو علم سکھایا جاتا ھے وہ اسے بےکار معلوم ھو اور استاد ظالم اور بےرحم نظر آئے تو اس کی وھی حالت ھوگی جو چیخوف (Tchehov) کی کہانی میں بلی کے بچے کی ھوئی تھی ۱ - تندرست مند بچے

---

۱ - چیخوف نے ایک کہانی میں ایک پروفیسر کا ذکر کیا ھے جو اپنی بلی کے بچے کو مار مار کر چوھوں کا شکار کرنا سکھایا کرتا تھا - نتیجہ یہ ھوا کہ بےچارہ بلی کا بچہ اس فطری فعل سے اتنا ڈرنے لگا کہ جب وہ کسی

تر از خود سیکھنے کی خواہش ہوتی ہے جس کو وہ مثلاً چلنے اور بولنے کی کوشش میں ظاہر کرتا ہے - اسی خواہش کو تعلیم میں قوت محرکہ بنانا چاہیے - (بچوں کی) تعلیم میں اُستاد کی قمچی کے بجاے اس خواہش سے کام لینا ہمارے زمانے کی نہایت اہم تعلیمی اصلاح ہے - " ۱

پس معلوم ہوا کہ اخلاقی تربیت کا صحیح نظریہ قائم کرنے کے لیے ہمیں اُن تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن کے تعامل سے انسانی سیرت اپنا مخصوص رنگ اختیار کرتی ہے - معلم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بچوں کی ابتدائی جبلتوں میں بہت بڑی قوت ہوتی ہے جس کو نظرانداز کرنا سخت غلطی ہے - اگر ان جبلتوں کو تربیت دے کر اس طرح منظم نہ کیا جائے گا کہ وہ علمی اور اخلاقی مقاصد میں معین ہوں تو وہ ہر ہر قدم پر اس کی کوشش میں مزاحم ہوں گی اور اخلاقی تعلیم محض الفاظ تک محدود رہے گی، عمل کی شکل میں ظاہر نہ ہو گی - کیونکہ عمل کی محرک ہمیشہ کوئی ایک جبلت یا کئی جبلتیں ہوتی ہیں - لیکن جبلتوں کی تنظیم بغیر

چوہے کو دیکھتا تو مارے ڈر کے پسینے پسینے ہو جاتا تھا - فاضل پروفیسر نے اس " مشاہدے " سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ بچہ بالکل غبی اور احمق ہے - (اس قصے سے پروفیسر موصوف کی حماقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے - لیکن دنیا میں انسانوں کے لاتعداد بچوں سے ان کے معلموں نے بالکل یہی سلوک کیا ہے اور صدیوں کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی !) -

۱ — On Education صفحہ ۲۹ -

کسی خارجی ماحول کے بغیر نہیں ہوسکتی - اس لیے ان میلان اور ماحول کے اثرات میں باہمی رد عمل کی ضرورت ہے - ہر جبلت بالعموم یہ ظاہر کرتی ہے کہ خاص حالت میں بچے کی طبیعت اور عمل کا میلان ایک خاص ''سمت'' میں ہوگا لیکن یہ بات ماحول کے اثر پر منحصر ہے کہ وہ میلان کس موقع پر کس '' شکل'' میں ظاہر ہوگا - مثلاً اظہار خودی کی جبلت کا تقاضا یہ ہے کہ بچہ اپنی قوتوں سے کام لے کر کسی طرح اپنی شخصیت کا سکہ اپنے ساتھیوں اور ماحول پر بٹھائے - یہ جبلت ہر بچے میں ہوتی ہے' بعض میں بہت قوی بعض میں کمزور - اس کے اظہار کی بےشمار صورتیں ہیں - اگر ماحول کا اثر اور ہم صحبت لوگوں کی مثال خراب ہے تو ممکن ہے بچہ اپنے سے کمزور بچوں کو مارے پیٹے اور اس طرح رعب جمانا چاہے - یا ضد کر کے اپنے سے بڑوں کو اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور کرے یا اور قابل اعتراض حرکات کرے جن سے دوسروں کی توجہ اس کی جانب مبذول ہو - یہ سب اظہار خودی کی ناپسندیدہ شکلیں ہیں اور ان کا تجربہ ہر معلم کو ہوتا رہتا ہے - لیکن اس جبلت کو عمدہ تربیت اور اثرات کے ذریعے بہترین عادات و صفات کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے - جہاں اظہار خودی کی ایک صورت دوسرے انسانوں پر جبر اور ظلم سے غلبہ حاصل کرنا ہے' وہاں اس کا اظہار خدمت کے ذریعے' عالم فطرت کی قوتوں کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کو زیر کرنے کی شکل میں' علمی تحقیقات اور ادب اور آرٹ کی تخلیق میں بھی ہوسکتا ہے - مختلف لوگوں کی طبیعت کے لحاظ سے اظہار خودی کے مختلف طریقے

موزوں ہوتے ہیں اور جس طرح ایک شخص کے جذبۂ خودی کی تسکین مثلاً جنگ و جدال کے مشاغل میں ہوتی ہے، بالکل اسی طرح کوئی دوسرا شخص ایک خوبصورت تصویر بنانے میں، یا پتھر کی ایک ٹھوس اور بے ہنگم ٹکڑے کو ایک حسین مجسمے میں تبدیل کرنے سے یا قومی خدمت، اور مصیبت زدوں، غریبوں مظلوموں کی دادرسی سے، اپنی جبلت کو تسکین دیتا ہے۔ اس اختلاف کا باعث بڑی حد تک طبیعت کا فطری رجحان ہوتا ہے اور کسی حد تک ماحول کا اثر اور تقلید۔ لیکن تربیت اور ماحول کی اصل اہمیت یہ ہے کہ سوائے ان غیر طبعی صورتوں کے جب کوئی شخص نفسی امراض میں مبتلا ہو یا توارث کے بہت قوی اثرات کی وجہ سے اس کی جبلتوں کا اظہار لازمی طور پر غلط طریقہ اختیار کرے، ہر بچے کی جبلتیں ایسے مشاغل اور شوقوں کے ساتھ وابستہ کی جاسکتی ہیں کہ وہ اُن کی اپنی ذات کے لیے اور معاشری مشاغل کے لیے مفید ثابت ہوں۔ مگر معلم کو ہر صورت میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تشکیل سیرت کے ڈرامے میں ہیرو کا پارٹ خود بچے کی اپنی ذات کرتی ہے اور اس کے جبلتیں، اس کا وہ سرمایہ جو توارث جسمانی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اور ماحول کی قوتیں اور مظاہر سب وسائل اور ذرائع ہیں جن کو وہ استعمال کرتا ہے۔ وہ ان کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ اس معنی میں وہ ضرور ان کا محتاج ہے۔ لیکن وہ ان کے ہاتھوں میں بے بس نہیں ہوتا کہ جس طرح کمہار گیلی مٹی کو جس شکل میں چاہے ڈھال سکتا ہے اسی طرح یہ تمام قوتیں اس کو جس سانچے میں چاہیں ڈھالیں۔ اس

کی [illegible] آزادی [illegible] کے یہ معنی ہیں کہ ان قوانین کے اندر رہ کر جو عالم طبعی اور عالم معاشرت میں کارفرما ہیں، اور جن سے رہائی [illegible] کرنا کسی کے لیے [illegible] نہیں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل خود کر سکتا ہے۔

ہم یہاں انعام و سزا کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کر سکتے لیکن چونکہ مدرسوں میں اور معلموں کے تعلیمی کار و بار میں اس کو صدیوں سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے اس لیے مختصر طور پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان کا صحیح منشا کیا ہے اور ان کو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں جب جدید تعلیمی خیالات کا اثر آہستہ آہستہ ہمارے دور افتادہ مدرسوں تک پہنچ رہا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اب تک سزا خصوصاً جسمانی سزا کا جو زور رہا اور کہیں کہیں اب بھی ہے وہ سراسر ناجائز اور خلاف عقل ہے۔ بے سمجھ اُستادوں نے مدتوں یہ سمجھا اور اب بھی ایسے جاہل، عقل کے دشمن اُستاد موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جب کوئی بات بچے کی سمجھ میں نہ آئے یا وہ اسے یاد نہ کرسکے تو اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ اس کو زد و کوب کرکے اس کے دماغ اور حافظے کو تیز کیا جائے۔ خواہ طالب علم کی تعلیمی کمزوری کی وجہ کوئی جسمانی نقص یا صحت کی خرابی ہو یا کوئی فطری دماغی کمزوری یا توجہ کا انتشار، یا گھر کے حالات کی ناسازگاری، یا اُستاد کے طریقۂ تعلیم کی خرابی ان تمام صورتوں کے لیے اس کے اس ایک ہی [illegible] نسخہ تھا، یعنی کسی قسم کی سزا

اور وہ نئی نئی سزائیں ایجاد [illegible] ثبوت اختراع صرف کر دیتا تھا - اب بھی گو سرکاری اور انگریزی مدارس میں جسمانی سزائیں بہت کم ہوگئی ہیں لیکن مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں میں اکثر مولوی اور پنڈت اپنے شاگردوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے انہیں طرح طرح سے جسمانی یا روحانی ایذا پہنچاتے ہیں - سزا کا سب سے ادنیٰ اور سب سے زیادہ قابل اعتراض مفہوم یہ ہے کہ اُستاد ' شاگردوں کی کسی غلطی یا حرکت پر غصے اور انتقام کے جذبات سے بےبس ہوکر اس کو جسمانی تکلیف پہنچاوے - بعض لوگوں نے سزا کی اس خاص صورت کی تائید کی ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ بات فطرت کے موافق ہے کہ انسان فوری غصے سے مغلوب ہوکر سزا دے - اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد سزا دینا ان کے نزدیک جائز نہیں - لیکن ہم اس خیال سے اتفاق نہیں کرسکتے - معلم اور اس کے شاگردوں کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے جس کا قیاس معاشری زندگی کے معمولی تعلقات پر نہیں کرنا چاہیے - اس میں اتنا تحمل اور بردباری ہونی چاہیے کہ وہ اپنے غصے کو ضبط کر سکے ' اور نفسیات اطفال سے اتنی واقفیت ہو کہ وہ اُن کی غلطیوں اور قصوروں کی نفسی توجیہ کرکے یہ معلوم کرے کہ ان کے حرکات کی واقعی ذمہ‌داری کن اسباب پر عائد ہوتی ہے - اس طرح تحلیل نفسی کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ غلط طریقہ استعمال نہیں کرے گا - اور بجائے جسمانی سزا پر زور دینے کے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرے گا جو طلبہ کی تعلیمی یا اخلاقی تربیت میں حارج ہیں اور [illegible] کی وجہ سے ان سے

قابل اعتراض حرکات سرزد ہوتی ہیں ۔

سزا کا اصلی منشا یہ ہے کہ بچے کو کسی طرح یہ محسوس کرایا جائے کہ اس کی کسی خاص حرکت یا فعل کی وجہ سے نہ صرف دوسروں کو تکلیف پہنچی ہے، جس کا ممکن ہے ابھی اسے پورا احساس نہ ہوسکے، بلکہ وہ خود بھی اپنے بعض حقوق اور آسائشوں سے محروم ہوگیا ہے، اور جب کبھی وہ ان حرکات کا اعادہ کرے گا اس کا یہی نتیجہ ہوگا ۔ یہاں قدرتی تادیب کے طریقے سے کام لینے کی گنجائش ہے جس پر روسو اور اسپنسر نے زور دیا ہے ۔ وہ دونوں اس بات کی مخالفت کرتے ہیں کہ استاد بچوں کو جسمانی سزا دیں لیکن قدرتی سزا کے حامی ہیں جس سے وہ تکلیف یا خمیازہ مراد ہے جو بچوں کو اپنی حرکات کی وجہ سے خود بخود بطور قانون قدرت رد عمل کے اٹھانا پڑے ۔ اگر بچہ آگ کو یا کسی بہت گرم چیز کو ہاتھ لگائے گا تو اس کا ہاتھ جل جائے گا اور وہ آئندہ احتیاط کرے گا ۔ اگر وہ کسی دوسرے بچے سے کھلونا چھین لے گا تو مار کھائے گا ۔ اگر بےاحتیاطی سے کھلونا توڑ دے گا تو اسے دوسرا کھلونا نہیں دیا جائے گا ۔ اگر وہ وقت پر ہواخوری کے لیے تیار نہ ہوگا تو باہر جانے سے محروم رہے گا ۔ اگر وہ شرارت سے اپنے کمرے کے شیشے توڑ ڈالے تو بقول روسو (Rousseau) کے رات دن ٹھنڈی ہوا اس کے کمرے میں آنے دو اور اس کی کچھ پروا نہ کرو کہ اس کو زکام ہوجائے گا کیونکہ زکام ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ بےوقوف ہی رہے ۔ اگر وہ تمہیں تکلیف پہنچائے تو اس کی شکایت نہ کرو بلکہ اسے خود بھی وہی تکلیف محسوس کراؤ ۔" اس طریقے میں

بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُستاد اور والدین کے فوری غضب اور مزاجی کیفیت کو اس میں دخل نہیں ہوتا اور بچہ دو تین مرتبہ کے تجربے کے بعد ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ بعض حرکتوں کے ناگوار نتائج ناگزیر ہیں اگر وہ ان کا مرتکب ہوگا تو اسے ضرور تکلیف اٹھانی پڑے گی اور کوئی شخص اس کو اس خمیازے سے نہیں بچا سکے گا - لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی سزائیں ہر جگہ پر کام نہیں دیتیں - بچوں اور نوجوانوں کی زندگی میں بے‌شمار مواقع ایسے پیدا ہوتے ہیں جب انہیں اپنے برے یا قابل اعتراض افعال کی کوئی فوری اور قدرتی سزا نہیں ملتی - مثلاً اگر کوئی بچہ اپنے سے کمزور بچے کو بے‌وجہ مارے یا اس کی کوئی چیز چھین لے تو اُسے اِس زیادتی کا کوئی فوری خمیازہ نہیں اٹھانا پڑے گا جب تک کوئی دوسرا شخص اس میں دخل نہ دے اور ارادتاً اس کو کسی قسم کی سزا نہ دی جائے' خواہ سزا دینے والے والدین ہوں یا اُستاد یا خود طلبہ کی جماعت منتظمہ - علاوہ بریں بعض قدرتی سزائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اثر فوراً ظاہر نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ اپنا عمل کرتا ہے اور بچے کو اپنی حرکت کا پورا خمیازہ بہت مدت کے بعد بھگتنا پڑتا ہے جب اس کی بری عادت راسخ ہوجاتی ہے اور اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہتی - اس کی ایک مشہور مثال ایک قاتل کا قصہ ہے جس نے پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے یہ درخواست کی تھی کہ اسے اپنی بوڑھی ماں سے ایک بات کہنے کی اجازت دی جائے - حاکم نے رحم کھاکر اجازت دے دی - اس نے یہ کیا کہ ماں کے کان سے منہ لگایا گویا سرگوشی کرنا چاہتا ہے اور اپنے دانتوں

سے اس کا کان کاٹ لیا۔ جب لوگوں نے اسے اس پر لعنت ملامت کی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میری ماں بچپن ہی میں تنبیہ اور سرزنش کرتی جب میں اپنے ہمجماعتوں کی پنسلیں اور کاغذ چرایا کرتا تھا تو مجھے یہ دن دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔ یہی حال اور بہت سی خراب عادتوں کا ہے مثلاً شراب‌خوری، بد دیانتی، جھوٹ بولنا۔ ممکن ہے کبھی ان کا نتیجہ جلد ہی ظاہر ہوجائے لیکن اکثر اوقات لوگ مدت تک یہ حرکتیں کرتے ہیں اور اس کی انتہائی سزا ان کو بہت عرصے کے بعد ملتی ہے جب انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔

غرض ہم قدرتی سزاؤں سے فائدہ ضرور اٹھا سکتے ہیں۔ خصوصاً بچپن کے ابتدائی چند سال میں ان کا استعمال مفید ہے۔ لیکن بچوں کی تادیب کو صرف انہیں پر منحصر نہیں رکھ سکتے بلکہ اکثر اس معاملے میں انسانی مداخلت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چھوٹے بچے مختلف قسم کی بندشوں اور بعض مستثنیٰ صورتوں میں جسمانی سزا کے ذریعے ایسے افعال سے روکے جاسکتے ہیں جو ان کے لیے مضر ہیں۔ لیکن جب ان کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اس وقت سزا کا مسئلہ زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اب ان میں عزت نفس اور احساس خودی کے جذبات زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں اور وہ اپنے معاملات میں دوسروں کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے۔ بہت سے قاعدے اور قانون بناکر یا سزاؤں کا ایک مفصل نقشہ تجویز کرکے انہیں شرارتوں اور بری حرکتوں سے باز رکھنا ممکن نہیں۔ بلکہ اگر اس قسم کی سزاؤں پر زیادہ زور دیا

جائے تو اندیشہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں بزرگوں اور استادوں سے بغاوت اور ناراضگی کے جذبات راسخ ہو جائیں گے ۔ جن معلموں نے اپنے شاگردوں کی نفسی کیفیات اور اعمال کا مشاہدہ غور سے کیا ہے وہ اس صورت حال سے بخوبی واقف ہیں ۔ لہذا بچپن کے آخری دور میں اور بلوغ کے زمانے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ طلبہ خود اپنے اعمال اور کردار کے ذمہ دار بنائے جائیں اور ہدایت کا مرکز باہر سے اندر کی جانب منتقل ہوجائے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کی قوت ارادی کی تربیت کرنی چاہیے ۔ تاکہ ان میں ضبط نفس پیدا ہو اور وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کرکے ان سے عمدہ طریقے پر کام لیں اور اپنی زندگی کی تنظیم اس طرح کریں کہ اس پر اخلاقی اصولوں اور اخلاقی معیار عمل کی حکمرانی ہو ۔ یہاں قوت ارادی سے مراد ، جیسا ہم بتا چکے ہیں ، وہ جداگانہ قوت نہیں جو قدیم نفسی عقیدے کے بموجب انسان کی خواہشات اور فطری میلانات کی دشمن ہوتی ہے اور بطور ایک بیرونی محافظ کے روک تھام کرتی رہتی ہے ۔ بلکہ قوت ارادی دراصل خواہشات اور فطری رجحانات کی تربیت و تنظیم سے عبارت ہے جو ہمیں ان کی اخلاقی قدر و قیمت سے آگاہ کرتی ہے اور ان میں سے بعض کو مقدم اور بعض کو موخر قرار دیتی ہے اور جس کی وجہ سے ہم عمرانی اور اخلاقی مقاصد کو اپنی فوری اور نفسانی خواہشات پر ترجیح دیتے ہیں ۔ جب ہم میں شعوری طور پر انتخاب اور ترجیح کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے تو ہم اپنی رہنمائی کا فرض خود ادا کرسکتے ہیں ۔ فورسٹر نے جرمن فوج کو مخاطب کرکے جو الفاظ کہے تھے وہ تعلیم کے

اس مسئلے پر بھی عائد ہوتے ہیں :—

''انسان کی قوت ارادی کی تربیت اور اس کی تہذیب و تنظیم میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب اس کا فرض ہوتا ہے کہ سستی اور بےدلی کے ساتھ کام کرنے کی عادت چھوڑ دے اور اپنی ذاتی اور مزاجی کیفیتوں کو کسی بڑے اجتماعی مقصد کا تابع بنا دے۔'' ۱

حقیقت یہ ہے کہ انسان میں قوت ارادی کی صحیح نشو و نما اور ضبط نفس کا پیدا ہونا اسی وقت ممکن ہے جب اس کی زندگی کسی بڑے مقصد کے ساتھ وابستہ ہوجائے اور وہ اپنی ذات کو اس کی تحصیل و تکمیل میں محو کر دے۔ ناکام زندگی کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کا کوئی مرکز، کوئی معین اور واضح مقصد نہیں ہوتا جس میں وہ دل و جان سے مشغول رہے، جو اس کی قوتوں کو تضیع و انتشار سے محفوظ رکھے۔ ہر معمولی سی تحریص ہر مزاجی کیفیت اس کو ایک راہ سے ہٹا کر دوسری راہ پر ڈال دیتی ہے۔ دنیا میں جو لوگ کسی شعبۂ زندگی میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں ان سب میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو کسی ایک مقصد کے ماتحت مرتب اور مجتمع کرلیتے ہیں اور اس مقصد میں اس درجہ محو ہو جاتے ہیں کہ جو چیز، جو بات، جو کام اس راہ سے ہٹا ہوا

۱—Pinkaviteh ; The Now Education in the Soviet Republic صفحہ ۲۵۔

ہو وہ اُنہیں تضیع اوقات معلوم ہوتا ہے - ان کو تحریصوں سے یا غیر متعلق مشاغل سے' بچانے کے لیے کسی سزا یا بیرونی دباؤ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود محسوس کرتے ہیں کہ فلاں کام اس لیے برا ہے کہ ان کے مقصد اعلیٰ میں حارج ہوتا ہے - اس وقت ان میں ضبط نفس کی شان پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنی تمام حرکات' افعال' کردار میں وہ نظم اور ترتیب قائم کرلیتے ہیں جس کے بغیر نہ قوت عمل پیدا ہوسکتی ہے نہ کامیابی حاصل ہوسکتی ہے - شخصیت کی قدرتی نشو و نما کے دوران میں اس قسم کے کسی مقصد کا تعین تربیت انسانی کا سب سے اہم عنصر ہے اور اس میں معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کے مقاصد کو پست سے بلند اور بلند سے بلندتر کرے اور ان کو اخلاقی اور عمرانی اقدار سے ہم آہنگ بنائے - کیونکہ محض قوت عمل' اور ضبط نفس اور کارکردگی کی صفت تو ہر اس شخص میں پیدا ہوسکتی ہے جو کسی ایک مقصد کو اپنا مطمح نظر بنا کر اس کے لیے کوشش کرے خواہ وہ مقصد اچھا ہو یا برا' معاشری مفاد کے موافق ہو یا مخالف - چنانچہ وہ لوگ جن کو کسی خیال میں اتنا انہماک ہو جاتا ہے کہ وہ جنون کی حد تک پہنچ جائے' اس خیال کی خاطر اپنی ذاتی تکلیفوں کی پرواہ نہیں کرتے اور بعض اوقات فرہاد کی طرح وہ کام کر دکھاتے ہیں جو انسانی قوت سے بالاتر معلوم ہوتا ہے - تاریخ اور افسانے دونوں میں اس قسم کی ہزارہا مثالیں موجود ہیں - لیکن یہ لوگ نہ اپنے آپ کو کوئی مستقل فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ دوسروں کو - ضرورت اس

امر کی ہے کہ ہر نوجوان کے پیش نظر زندگی کا کوئی ایسا مقصد ہو جو اس کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے موزوں اور معاشری مفاد اور بہبود کے لحاظ سے قابل قدر ہو تاکہ وہ اس میں منہمک ہو کر ایک طرف تو اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکے، اپنے آپ کو اپنے کام میں کھو کر پاسکے کہ یہی "معرفت نفس" کا واحد ذریعہ ہے، اور دوسری طرف وہ شخصی اغراض کے تنگ دائرے سے نکل کر اپنی ذات کو وسیع تر عمرانی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرے۔ جب انسان کی نظر میں اس قدر وسعت اور رسائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے محدود ذاتی مقاصد کا رشتہ دائمی اور ابدی مقاصد کے ساتھ جوڑ لیتا ہے جن کی تکمیل میں کائنات کی ساری قوتیں مصروف ہیں اور اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قدرت کے سارے کارخانے میں ایک عظیم الشان ارتقا پذیر مقصد کی کارفرمائی ہے جس میں اسے بھی اپنی استطاعت کے مطابق شرکت کرنی چاہیے تو " ذرۂ صحرا دستگاہ و قطرۂ دریا آشنا " کی منزل آجاتی ہے جہاں مذہبیت کی سچی روح اپنا جلوہ دکھاتی ہے، انسان اخلاق اور انسانیت کے درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ اسے انفرادی اور معاشری اغراض و حقوق کی جنگ خارجی سزاؤں کا خوف اور خارجی جزاؤں کا لالچ بالکل بےمعنی اور حقیر معلوم ہوتا ہے اور وہ برائیوں اور "گناہوں" سے اس لیے نہیں بچتا کہ وہ "ممنوع" ہیں یا ان کے کرنے میں سزا کا خوف ہے، بلکہ اس لیے کہ ان میں پڑنا اس کے نزدیک تضیع اوقات ہے، اس کی اعلیٰ خدا داد قوتوں کی توہین ہے۔ وہ اپنے دل میں کہتا ہے:—

تو باز ساعد شاهیں به استخوان منگر
همائے همت خود را بلند دہ پرواز

اس بحث کا نتیجہ معلم کے لیے یہ نکلتا ھے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے شاگردوں کو اعلیٰ مقاصد سے روشناس کرے اور ان میں ایک ایسا معیار اقدار قائم کر دے کہ وہ اپنے اعمال و افعال کی تدریجی تنظیم کر سکیں - ان کی طبیعت میں اعتدال اور سلامت روی کے قائم رکھنے کے لیے سزا اور انعام کی ضرورت نہ ھو - بلکہ اس کے بجائے ان کے دل میں اپنے پسندیدہ مقاصد کا اس قدر احترام پیدا ھو جائے کہ یہی مقاصد ان کے اخلاقی معلم اور نگراں بن جائیں اور ان کو غلط راستوں پر پڑنے سے روکیں - اگر کبھی مجبوراً استادوں کو یا والدین کو خود اپنے ھاتھ سے سزا دینی بھی پڑے تو اُنھیں یہ چاھیے کہ بچے کے ذھن میں سزا اور قابل اعتراض کام کے درمیان بلا واسطہ اور فوری تعلق قائم کر لیں تاکہ جب کبھی اسے اس کام کرنے کی دوبارہ تحریص ھو تو اس کے ناگوار نتائج کا خیال دل میں فوراً تازہ ھو جائے اور وہ اس سے باز رھے - اچھے معلم کی پہچان یہ ھے کہ وہ سزا کو ذاتی ناراضگی کے اظہار کے طور پر استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کو معاشری قانون اور اجتماعی مرضی کا نتیجہ بنا کر دکھاتا ھے اور اس طرح ایک فرد کے بجائے پورا معاشرہ ضبط و تادیب کا نافذ کرنے والا بن جاتا ھے - لیکن اس کا مطمح نظر ھمیشہ یہی ھونا چاھیے کہ بچوں کے عمل کے محرک اعلیٰ ترین مقاصد ھوں اور ان کے حصول کا خیال ان کے اخلاق و کردار کی رھنمائی کرے -

جس طرح مدرسوں میں سزاؤں کا استعمال حد سے

زیادہ اور غلط طریقے پر کیا جاتا ہے اور اسی طرح انعاموں کا جائز استعمال بھی استادوں کو معلوم نہیں - طلبہ کا جذبۂ مسابقت کو اُبھارنے اور اُنہیں اپنے کام سے ایک قسم کی بالواسطہ دلچسپی دلانے کے لیے اُنہیں مختلف قسم کے انعامات ' زیادہ‌تر مادی انعامات ' دیے جاتے ہیں جن کو وہ بجائے خود باعث امتیاز سمجھتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان میں عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس مصنوعی امتیاز کے حاصل کرنے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دیتے ہیں کسب کمال کی خواہش بنفسہ ان کے دل کو نہیں لگتی - یہ صورت حال ان کی اخلاقی تربیت پر بہت برا اثر ڈالتی ہے کیونکہ ان کی توجہ ضمنی اور غیر ضروری چیزوں میں پڑ کر منتشر ہو جاتی ہے اور ان میں اور ان کے کام میں وہ رشتہ پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے - جب مدرسے میں یہ عادت راسخ ہو جاتی ہے کہ بغیر کسی مادی لالچ کے کسی انعام کی توقع کے پوری محنت اور انہماک سے کام نہ کیا جائے' تو طالب علم عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی اسی چیز کو مد نظر رکھتا ہے اور چونکہ موجودہ تمدن میں تقریباً ہر چیز کی قدر کا اندازہ دولت یا نمود اور شہرت کے معیار پر کیا جاتا ہے' اس لیے وہ ہر کام کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ اس میں مجھے کتنا مالی نفع ہوگا اور کس قدر شہرت حاصل ہوگی - اور اُن کاموں کو کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا جن میں خاموشی' نفس کشی اور بےغرضی کے ساتھ خدمت کرنے کی ضرورت ہے - یہی وجہ ہے (یا کم سے کم یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے) کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی ہے جو ایثار اور خاموشی کے ساتھ قومی خدمت

کریں اور ایسے لوگ بہت ہیں جو نام پیدا کرنے کے لئے شور و غل مچا کر یا کسی نمائشی تحریک میں شریک ہو کر بہت جلد ''لیڈر'' بن جانے کی کوشش کرتے ہیں - اس خرابی کی اصلاح کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ مدرسوں میں انعام کا استعمال اور اس کی نوعیت بدل دی جائے اور معلم بھی اس معاملے میں اپنا طرز عمل بالکل تبدیل کر دیں - موجودہ حالات میں بے چارے معلم کا کام ہی یہ ہے کہ یا تو طلبہ کے قصوروں اور خطاؤں کی تلاش میں رہے اور انھیں سزا دے یا ان کی پست ہمت کو ابھارنے اور انھیں تعلیمی مشاغل میں زبردستی دلچسپی دلانے کے لئے انعام کا یا نمبر حاصل کرنے کا لالچ دے - جب بچے کو مدرسے میں آئے دن یہی تجربہ ہوتا ہے تو وہ بھی اپنے افعال و کردار کی قدر کا اندازہ اس معیار پر نہیں کرتا کہ وہ بذاتہ اچھے ہیں یا نہیں بلکہ سزا کے خوف اور انعام کے لالچ سے کام کرتا ہے اور اسے ہمیشہ دوسروں پر سبقت لے جانے کی فکر رہتی ہے - اس طرح معلم غیر محسوس طریقے پر طلبہ کے معیار قدر کو بہت پست کر دیتا ہے - پروفیسر پنکے وچ (Pinkevitch) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ روس میں جو تعلیم جدید انقلاب کے بعد سے رائج ہے اس میں ہر قسم کے ''نشان امتیاز'' کو ممنوع قرار دیا گیا ہے :—

''مختلف قسم کے نشان امتیاز مثلاً گریڈ ، سرٹیفکٹ ، ڈگریاں وغیرہ دینے سے خراب قسم کی نمائش پسندی پیدا ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے طلبہ محض انعام کی خاطر محنت کرتے ہیں اور انھیں اپنے کام میں قدرتی شغف اور

انہماک پیدا نہیں ہوتا - اس لئے ہم نے ان سب کو بالکل موقوف کر دیا ہے - "[1]

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ بعض انعامات ایسے بھی ہیں جو کسی طرح قابل اعتراض قرار نہیں دیے جاسکتے - اُستادوں کی طرف سے پسندیدگی کا اظہار، مہربانی کا سلوک، ہمت افزائی جس سے طالبہ کو یہ معلوم ہو کہ وہ لوگ جن کی وہ قدر کرتے ہیں، ان سے خوش ہیں - یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے اس اطمینان و مسرت میں جو ادائے فرض سے نصیب ہوتی ہے، اضافہ ہو جاتا ہے - لیکن بہرحال سزا کا خوف، انعام کی تحریص، معلم یا جماعت کی خوشنودی یہ تمام چیزیں صرف ذرائع کے طور پر استعمال کرنی چاہئیں - ان میں سے کسی کو بجائے خود مقصد بنا دینا اخلاقی نشو و نما کا خاتمہ کر دینا ہے - سزا کا منشا محض اسی قدر ہے کہ وہ طالب علم کے ذہن میں برے کاموں اور اس کے برے نتائج کے درمیان ایک تلازم قائم کر دے اور جب تک وہ شعوری طور پر ان سے احتراز کرنا نہ سیکھے ایک عارضی مانع کا کام دیتی رہے - اسی طرح انعام کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طالبہ کو محسوس ہو کہ جب وہ کوئی کام قابلیت سے اور دل لگا کر کرتے ہیں تو سب لوگ اس کی قدر کرتے ہیں - مگر معلم کا منتہائے نظر ہمیشہ یہی ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ طالب علم تہدید و تحریص دونوں سے بالاتر اور بے نیاز ہو جائے اور اسے اپنے کام میں اتنی دلچسپی

---

1 - The New Education in the Soviet Republic صفحہ ۲ -

پیدا ھو جائے کہ اس کی انجام دھی کے لیے اسے کوئی رشوت نہ دینی پڑے۔ جب طالب علم بچپن کے حدود سے گزر کر بلوغ کی منزل میں قدم رکھتا ھے اور اس کے احساس خودی میں استحکام پیدا ھوتا ھے تو جسمانی سزائیں اور مادی انعامات دونوں خلاف مصلحت ھو جاتے ھیں اور ان کا استعمال نفسیات کی تعلیم کے سراسر منافی ھے۔ اس وقت معلم کو طلبہ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالنا چاھیے اور ان کے ساتھ دوستی اور باھمی اعتماد کے تعلقات پیدا کر کے انھیں بہتر اور بلندتر قدروں سے روشناس کرنا چاھیے۔

باب پنجم

معلم کی شخصیت

ہم نے اب تک اخلاقی تربیت کے جن ذرائع سے بحث کی ہے ان سب میں معلم کی شخصیت کی اہمیت اور اس کے اثر کا اعتراف کرنا پڑا ہے - نصاب کی ترتیب اور اس کو معاشری ضروریات کے ساتھ ہم‌آہنگ بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ معلم کو فطرت اطفال اور نظام تمدن دونوں سے واقفیت ہو، وہ ذہین ہو اور معاشری احساس رکھتا ہو - اس کے بعد نصاب کو طلبہ کے سامنے پیش کرنے کا اور اس کو ان کی زندگی کا جزو بنانے کا مسئلہ آتا ہے، جو طریقۂ تعلیم سے متعلق ہے اور اس کا انحصار تمام تر معلم کی ذات پر ہے - گو موجودہ نظریۂ تعلیم کے مطابق ہمارا مقصد اعلیٰ یہی ہے کہ طلبہ میں خود کام کرنے اور اپنی مشکلات آپ حل کرنے کی قابلیت پیدا ہو، لیکن یہ مقصد بغیر معلم کے رہنمائی اور امداد کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہی مدرسے کے ماحول کو اس طرح منظم کرتا ہے اور اس میں ایسے محرکات عمل فراہم کرتا ہے کہ بچوں میں اعتماد ذات، محنت اور حوصلے کی صفات ابھر آتی ہیں - اسی طرح مدرسے میں تادیب و ضبط کے نظام

کو قائم رکھنے کی ذمہ داری بڑی انجام کار اس پر عائد ہوتی ہے۔ یہاں بھی ہمارا منتہائے نظر یہی ہے کہ ہم طلبہ میں حکومت خود اختیاری قائم کریں اور مدرسے کی معاشری زندگی اور اس کے فرائض کی تنظیم کی ذمہ داری انہیں پر ڈال دیں۔ لیکن یہ حالت خود بخود پیدا نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے معلم کو ابتدا میں بہت غور اور کاوش اور تدبیر کی ضرورت ہے اور اس کے قائم ہو جانے کے بعد بھی اسے ہمیشہ بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ نہ معلوم کس وقت اس مشین میں کوئی ایسی خرابی یا رکاوٹ پیدا ہو جائے جس کو طلبہ خود دور نہ کر سکیں اور اس کی دوستانہ امداد اور مشورے یا مداخلت کے محتاج ہوں۔ لہذا موجودہ تعلیمی خیالات کی رو سے معلم کو نظام تعلیم میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ اسے پہلے کی طرح طلبہ کے بجائے خود کام کرنا نہیں پڑتا اور وہ مطالعہ اور محنت کی ذمہ داری حتی الامکان انہیں پر ڈالتا ہے لیکن اس کی تعلیمی، معاشری اور اخلاقی ذمہ داریاں پہلے سے زیادہ اہم اور نازک ہوگئی ہیں اور زیادہ متنوع صفات اور صلاحیتوں کی طالب ہیں۔ موجودہ بحث کو مکمل کرنے کے لیے یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ علاوہ نصاب اور طریقۂ تعلیم وغیرہ کی تنظیم کرنے کے معلم بحیثیت ایک انسان کے اپنے طلبہ کی اخلاقی تربیت میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔

معلم کے پیشے کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو اسے تقریباً اور تمام پیشوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اسے اپنے طلبہ کے دل و دماغ اور روح سے براہ راست سابقہ پڑتا ہے اور ان پر اس کی

شخصیت' اس فلسفہ کے زندگی اس کے طرز عمل کا اثر بلاواسطہ ہوتا ہے - اس کا تعلق بچوں کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے نہیں بلکہ ان کی زندگی کے تمام شعبوں سے ہے اور وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی مجموعی سیرت کو متاثر کرتا رہتا ہے - اگر کسی ڈاکٹر یا انجینیر یا معمار کو اپنے کام کے موضوع سے محبت نہ ہو اور وہ اس کی انجام دہی میں مروت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرے تو اس نقص کی وجہ سے اس کے کام میں کچھ ایسی خرابی واقع نہیں ہوگی - بےشک یہ صفات بجائے خود ہر شخص کے لیے مفید ہیں خواہ اس کا کوئی پیشہ ہو اور اسے انسانی فرائض کی ادائگی میں ہمیشہ ان کی ضرورت پڑتی ہے - لیکن ان کے نہ ہونے میں جو کچھ برائی ہے خود اس کی ذات کے لیے ہے اس کے کام یا فن کے لئے نہیں - بہ خلاف اس کے معلم کو ذی روح افراد سے سابقہ پڑتا ہے جو اپنے ماحول کے اثرات کو ہر وقت قبول کرتے رہتے ہیں - اور اس ماحول میں معلم کی ذات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے - کیونکہ ایک تو معاشرہ خود اسے طلبہ کے مقابلے میں برتر حیثیت دیتا ہے اور اسے ان کی نظر میں بہت عزت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے - دوسرے زیادہ قابل' زیادہ تجربہ کار اور پختہ کار ہونے کی وجہ سے معلم ان پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے اور اس قوت سے کام لے سکتا ہے جو نفسیات کی اصطلاح میں "تاثیر تفوق"[1] کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے -

ہم عہد شباب کی بعض خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے

---

1. Prestige Suggestion

یہ بتا چکے ہیں کہ نوجوانوں کو تحکم اور دباؤ بہت ناگوار ہوتا ہے - اور اگر کوئی شخص ان سے کوئی کام کرانا چاہے تو فوراً اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں - لیکن اس عمر میں وہ شخصیت کے قدرتی اثر کو بہت جلد اور بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں - اگر انہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ کوئی شخص ان پر کسی لحاظ سے مثلاً قابلیت یا تہذیب یا مرتبے میں فوقیت رکھتا ہے اور اسے ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی بھی ہے تو وہ عقیدت اور وفاداری کے ساتھ اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں - یہی زمانہ ہے جب وہ اپنی تاثیر تفوق سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر اس میں تسخیر اور تالیف قلوب کا اتنا مادہ ہے کہ طلبہ اسے بزرگ مانیں اور اس کی ہمدردی اور نیک نیتی کے معترف ہوں تو مدرسے کے انتظامی معاملات اور ضبط و تادیب کے مسائل بہت کچھ حل ہو جاتے ہیں کیونکہ جب وہ اس کو اپنی جماعت کا سرگروہ تسلیم کرلیتے ہیں تو اس کی ناراضی ان کے لیے بہت بڑی سزا اور اس کی خوشنودی بہت بڑا انعام ہو جاتی ہے - اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اُستاد کو اپنے مزاج، طرز عمل اور عادات کے معاملے میں ہر وقت محتاط رہنے کی ضرورت ہے - کیونکہ اس کی تمام حرکات و سکنات، اس کے اصول زندگی، اس کا اخلاق سب اس کے شاگردوں کی طبیعت پر اثر ڈالتے رہتے ہیں - جس طرح یہ اس کا فرض منصبی ہے کہ وہ نفسیات اطفال اور جدید تعلیمی تحریکوں کا مطالعہ کرے اور اپنے علم اور استعداد کو بڑھاتا رہے اس طرح اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو پاکیزہ اور مہذب بنائے - اپنی شخصیت

کی تربیت کرے اور اپنی ذات کو ان تمام خوبیوں کا زندہ نمونہ بناکر دکھائے جن کی وہ تلقین کرتا ہے - اس صورت میں طلبہ پر اس کا اخلاقی اثر بہت قوی اور دیرپا ہوگا - البتہ اس میں یہ احتیاط شرط ہے کہ اس کی اپنی شخصیت طلبہ پر اس درجہ غالب نہ آجائے کہ وہ ان کے ارتقاے نفس میں حارج ہو - کیونکہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اکثر والدین اور اُستاد جن کی طبیعت میں، تحکم اور تسلط کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے بچوں کو زبردستی اپنے عقائد اور خیالات کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور انہیں آزادانہ نشو و نما کا موقع نہیں دیتے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے اکثر طبیعت اور ارادے کے کمزور، اور ہمت اور حوصلے سے عاری ہوتے ہیں وہ ہر بات میں اپنے بزرگوں کے محتاج رہتے ہیں اور اپنی قوتوں سے کام لینا نہیں سیکھتے ان کی مثال ان چھوٹے چھوٹے کمزور پودوں کی سی ہے جو کسی بڑے درخت کے نیچے اگتے ہیں اور بڑھنے نہیں پاتے - اس شرط کے ساتھ ہم معلم کے ذاتی اثر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا تجزیہ کرکے یہ معلوم کریں گے کہ یہ کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے -

معلم کئی طرح سے طلبہ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالتا ہے - ان میں بچپن کے زمانے میں تقلید کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ اپنے دوستوں، بزرگوں، ہم جماعتوں غرض ان سب لوگوں کی جن سے ان کو سابقہ پڑتا ہے نقل اتارتے ہیں خصوصاً اپنے اُستادوں کی ہر بات میں تقلید کرتے ہیں - ان کی بات چیت کا طریقہ، ان کا لباس، ان کی عادتیں غرض کوئی چیز اس تقلید کے اثر سے خالی نہیں رہتی - اُستادوں

کو چاہیے کہ فطرت اطفال کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے ذاتی نمونے اور مثال کے ذریعے انھیں آداب مجلس، تہذیب و شائستگی اور عمدہ معاشری عادات کی تعلیم دیں - کیونکہ سیر بھر عمل، من بھر زبانی تعلیم کے برابر ہے - خصوصاً ابتدائی چند سال میں زبانی تعلیم کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے - اس وقت عملی مثال ہی کارگر ہوسکتی ہے کیونکہ اکثر بچے بہت سی باتیں بغیر پوری طرح سمجھے ہوئے محض عضلات کی تقلیدی حرکت کے ذریعے سیکھ لیتے ہیں بچوں کی تربیت کی پہلی منزل بھی بلاواسطہ تقلید کی منزل ہے - اگر معلم کا اور گھر کے لوگوں کا ذاتی نمونہ اچھا ہے تو اس کے اثر سے بچوں میں بہت سی ایسی عادتیں پیدا ہوسکتی ہیں جو اگر اخلاق کا جزو نہیں تو اخلاقی سیرت کی تعمیر میں بنیاد کا کام ضرور دیتی ہیں - لوگوں کے ساتھ خلق مدارات سے پیش آنا، لڑائی جھگڑے سے دور رہنا ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد کرنا؛ اپنا کام محنت اور استقلال کے ساتھ انجام دینا، وقت کی پابندی صفائی کا اہتمام یہ تمام صفات ایسی ہیں جو تقلید اور مشق سے عادتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں - اگر مدرسے میں طلبہ اپنے اُستادوں اور ساتھیوں میں یہ عادتیں پائیں گے تو وہ ان کی دیکھا دیکھی خود بھی ایسا ہی کرنے لگیں گے - بےشک جب طالب علم سن شعور کو پہنچتا ہے تو اسے بہت سی عادات اور رسوم و روایات اور اصولوں کے عقلی وجوہ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اوائل عمر میں تربیت کا ایک معقول حصہ تقلید کے ذریعے انجام پاسکتا ہے -

نفسیات کی اصلاح میں تقلید سے مراد مشابہت پیدا کرنے کا وہ عمل ہے جس کا تعلق زیادہ تر جسمانی حرکات اور عادات سے ہوتا ہے اور اس کے ذریعے بچہ بہت سے کام سیکھ لیتا ہے جن کا اثر بالواسطہ اس کی طبیعت اور مزاج پر پڑتا ہے لیکن اس کے علاوہ دو نفسی کیفیتیں ایسی ہیں جن کے ذریعے انسان براہ راست دوسروں کے خیالات اور جذبات سے متاثر ہوتا ہے - یہ نفسیات کی اصطلاح میں ہمدردی اور تاثیرِ خیال کہلاتی ہیں - کسی شخص سے ہمدردی کا احساس ہمارے دل میں وہی جذبات پیدا کر دیتا ہے جو اس کے دل میں ہوں - اس کی مثالیں ہر وقت ہمارے مشاہدے میں آتی رہتی ہیں کسی عزیز دوست کو ملول دیکھ کر ہم پر خود بھی رنج کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے " انسردہ دل انسردہ کند انجمنے را " بشرطیکہ اہل انجمن کو انسردہ دل سے کچھ ہمدردی بھی ہو - اگر ہم کسی خوش مزاج دوست کے پاس یا ایسے دوستوں کے حلقے میں چلے جائیں تو ہمارا غم غلط ہو جاتا ہے اور طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے - اسی لیے کہا گیا ہے کہ جذبات متعدی ہوتے ہیں اور گویا اڑ کر ایک دوسرے کو لگ جاتے ہیں -

اس سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کے جذبات کا اثر خود بخود ہماری طبیعت پر ہوتا ہے - اس کی ضرورت نہیں کہ ہم کوشش کر کے یا عقلی دلائل کے ذریعے اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کریں - معلم مدرسے میں اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اور طالبہ کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے تعلقات پیدا کر کے ان کے جذبات کو متاثر کر سکتا ہے - اگر اس کے جذبات موقع کے

مناسب ہوں گے، اگر وہ رنج و غم، رضامندی اور ناراضی، غصے اور رحم کا اظہار موزوں طریقے پر کرے گا تو اس کے شاگرد اس سے ضرور متاثر ہوں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جذبہ سچا اور خالص ہو، تصنع اور مبالغے سے پاک ہو کیونکہ بچے بناوٹ اور ظاہرداری کو بہت جلد پہچان لیتے ہیں اور اس شخص کی طرف سے بدظن ہو جاتے ہیں جس کے جذبات میں خلوص اور قول اور فعل میں مناسبت نہ ہو۔ جذبات کی تربیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اچھے لوگوں سے عقیدت اور احترام پیدا کیا جائے۔ عمدہ چیزوں کی طرف رغبت اور خراب چیزوں سے نفرت دلائی جائے۔ بچوں میں یہ ذوق پیدا کر دیا جائے کہ خوبصورت اشیا اور مناظر ان کے دل کو لبھائیں اور بد صورت چیزیں بری معلوم ہوں۔ جذبۂ عقیدت اور حسنِ ذوق بچوں کے دل میں آسانی کے ساتھ نشو و نما پاسکتا ہے اگر معلم کے اپنے جذبات سچے اور شائستہ ہوں اور اس کا مذاق پاکیزہ ہو، کیونکہ بچے ان جذبات کو اکثر غیر شعوری طور پر قبول کرلیتے ہیں اور انسانوں کی جانب ان کا فطری رد عمل بھی وہی ہو جاتا ہے جو اُستاد کا ہے۔ معلم کا فرض یہ ہے کہ ان کا ہمدردی کا جذبہ اس قدر وسیع کر دے کہ وہ ان کے تمام ماحول پر محیط ہو جائے کیونکہ ہم حقیقی معنی میں کسی چیز یا شخص کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک اس کے ساتھ ہمیں اس درجہ ہمدردی نہ ہو کہ ہم گویا اس کے دل میں اُتر جائیں اور اس کے جذبات کو اپنا بنالیں ہم کسی خوبصورت نظم یا تصویر سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اندر وہی کیفیت جو شاعر یا

محسوس کے دل میں تری پیدا نہ کر لیں - کسی کے دکھ درد کو
پوری طرح محسوس نہیں کرسکتے جب تک ہمدردی کے وسیلے
سے گویا وہی مصیبت خود ہم پر نہ گزر جائے -

چھوٹے بچوں کے مدرسے میں معلم کو اس کا بھی خیال
رکھنا چاہیے کہ ان کی محبت اور ہمدردی انسانوں تک
محدود نہ رہے بلکہ انہیں بےزبان جانوروں اور پودوں سے بھی
لگاؤ پیدا ہو جائے - مدارس جدید میں مختلف پالتو
جانوروں کے پالنے کی تاکید کی جاتی ہے اور ان کی نگہداشت
کی ذمہ‌داری بچوں پر ہوتی ہے - اسی طرح وہ باغبانی کرتے
ہیں، اپنی اپنی کیاریوں میں پھولوں کے درخت اور ترکاریاں
وغیرہ بوتے ہیں اور ان کی نشو و نما کا مطالعہ کرتے ہیں
اس کے سلسلے میں جن جن کاموں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی
پانی دینا، کھاد ڈالنا، گوڈائی کرنا وہ خود ہی انجام دیتے
ہیں اس کا مقصد محض یہی نہیں ہوتا کہ بچے پودوں اور
جانوروں کی عادتوں کا مطالعہ کریں اور اس طرح مفید
معلومات حاصل کریں بلکہ اس ذریعے سے وہ عالم نباتات اور
عالم حیوانات سے مانوس ہو جاتے ہیں - بعض لوگ جن
میں احساس جمال زیادہ لطیف اور نازک ہوتا ہے اور جن کو
زندگی کی لہر نہ صرف حیوانات میں بلکہ تمام عالم فطرت
میں نظر آتی ہے پھولوں اور پودوں اور قدرتی مناظر کو بھی
اپنے آغوش محبت میں لے لیتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ مثلاً
بہت سے فطرت پرست شاعروں کو خوبصورت مناظر کے نظارے سے
دلی اطمینان اور سکون نصیب ہوتا ہے اور اخلاقی سبق حاصل
ہوتے ہیں - ورڈزورتھ (Wordsworth) نے کہا ہے کہ :—

''ھرے بھرے جنگل کا ایک ذرا سا اثر ھمیں انسان اور نیکی بدی کے متعلق ایسے حقائق سکھا سکتا ھے جو دنیا کے تمام دانشمندوں سے ممکن نہیں'' -

اسی طرح سعدی نے اہل نظر کو آگاہ کیا ھے :—

برگ درختان سبز در نظر ھوشیار
ھر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن فطرت کی یہ سبق آموزی ھر شخص کے لیے عام نہیں - وہ انہیں کے لیے مخصوص ھے جن کے دل میں ھمدردی کا اتھاہ سمندر موج زن ھے - ھر معلم کو بچوں میں بھی ھمدردی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاھیے - اس کے ساتھ ساتھ معلم کو اپنی ذاتی مثال اور مدرسے کی تعلیمی اور معاشرتی مشاغل کی تنظیم کے ذریعے طلبہ میں باھمی ھمدردی پیدا کرنی چاھیے جو اشتراک عمل اور امداد باھمی کی بنیاد ھے - اگر اس کے ساتھ مدرسے اور بیرونی دنیا میں ربط اور تعلقات بھی قائم ھوں تو یہی ھمدردی وسیع تر انسانی ھمدردی کی شکل اختیار کر لیتی ھے لیکن اس کے لیے ضروری ھے کہ معلم خود بھی کوشش کرے کہ طلبہ کی ھمدردی میں وسعت پیدا کرے اور وہ کسی خاص جماعت یا طبقے تک محدود نہ رھے بلکہ انہیں یہ محسوس ھونے لگے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی غم زدہ انسان ھے وہ ھمارا دوست اور عزیز ھے - جہاں کہیں لوگ کسی عمدہ انسانی مقصد کے لیے جد و جہد کر رھے ھیں وہ ھمارے رفیق کار ھیں -

آج کل تمام تمدنی ممالک میں تفریق و اختلاف کا بازار گرم ھے - خصوصاً مزدوروں اور سرمایہ داروں میں بڑی سخت

جنگ چھڑی ہوئی ہے اور مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی - اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ہر قسم کے لوگوں کی ہمدردی کا دائرہ اس قدر محدود ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی جماعت کے اغراض و مقاصد کو سمجھ سکتے ہیں اور ان سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن دوسری جماعتوں کے مقاصد کو نہیں سمجھ سکتے - بعض دولت مندوں کو مزدوروں کے طبقے سے ایک قسم کی نظری ہمدردی ہے لیکن وہ بھی ان کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھتے اور انہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ لوگ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور اپنے انسانی حقوق کی حمایت کے لیے جنگ کر رہے ہیں - اس نفسی کیفیت اور کشمکش کا نقشہ بہت سے لوگوں نے اپنی علمی تصانیف اور افسانوں میں کھینچا ہے لیکن غالباً سب سے سچی اور جیتی جاگتی تصویر امریکا کے مشہور افسانہ نویس اپٹن سنکلیر (Upton Sinclaire) نے اپنے معرکۃالآرا ناول Oil (تیل) میں دکھائی ہے - جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے اس کا کچھ اندازہ پریم چند کے ناولوں چوگان ہستی اور گوشۂ عافیت کے مطالعے سے ہو سکتا ہے - اس صورت حال کی اصلاح اسی طرح ممکن ہے کہ مدرسوں کے تمام طلبہ میں عالم گیر اتحاد کا احساس، مشترک انسانی اغراض کا احترام اور ہمدردی کا وسیع ترین جذبہ پیدا ہو جائے - اور جب وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچیں تو وہاں جرأت اور دیانت‌داری کے ساتھ ان تمام نزاعی مسائل کا مطالعہ کریں جن کی وجہ سے مختلف جماعتوں میں آپس میں یہ جھگڑے پڑے ہوئے ہیں - تعلیم کے اعلیٰ مرکزوں میں

آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کی ممانعت کرنا ' تعلیم کو فرسودہ اور دور از کار معاملات اور مسائل تک محدود رکھنا اور تمام زندہ مسائل کی طرف سے بےاعتنائی برتنا ' یہ باتیں نہ صرف روح تعلیم کے منافی ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ان بےانصافیوں اور زیادتیوں کے تدارک کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی جو ہمارے معاشری اور سیاسی نظام میں رائج ہو گئی ہیں - بدقسمتی سے تقریباً دنیا کے تمام ملکوں میں اعلیٰ تعلیم پر یہی تنگ نظری اور قدامت پسندی حاوی ہے - جاپان اور اٹلی میں حکومت نے علی الاعلان ممانعت کر دی ہے کہ ''خطرناک خیالات'' یونیورسٹی کی چاردیواری کے اندر داخل نہ ہونے پائیں - دوسرے ملکوں میں اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ پیچیدہ اور مصلحت آمیز طریقے اختیار کیے جاتے ہیں لیکن مطلب سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ تعلیم گاہوں کے ذریعے ایسے خیالات کی اشاعت نہ ہونے پائے جو بعض زبردست اقتصادی اور سیاسی جماعتوں کے اغراض اور مفاد کے منافی ہوں - بقول حالی :—

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی
سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

یہ بحث بظاہر معلم اور اخلاقی تربیت کے عنوان سے بے تعلق معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اخلاقی تربیت کا جو مفہوم پیش کیا ہے اس کے لحاظ سے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ طلبہ میں وسیع‌ترین انسانی ہمدردی پیدا کی جائے اور اس مقصد کی راہ میں جو جہالت اور تنگ نظری اور خود غرضی حائل ہے اس کو دور کر کے دیانت‌داری اور جرأت

کے ساتھ ان انسانی اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیا جائے جو موجودہ تمدن کی بنیاد ہیں - اگر معلم خود تنگ نظر اور قدامت پسند ہوگا اور ہر اہم معاملے پر بحث کرنے میں تامل کرے گا یا بیرونی اثرات اس کی آزادی میں حائل ہوں گے تو تربیت کا اہم‌ترین مقصد فوت ہو جائے گا -

ہمدردی سے ملتی جلتی دوسری نفسی کیفیت جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے تاثیر خیال ہے، جس کی وجہ سے ہم میں وہ خیالات اور تصورات راہ پاتے ہیں جو اثر آفریں شخص کے ذہن میں ہوتے ہیں - یہاں بھی اس کی ضرورت نہیں کہ جو شخص دوسرے کے خیالات کا اثر قبول کرے وہ عقل کی رو سے بھی ان کا قائل ہو جائے - اثر آفرین شخص کا خلوص اور اس کے عقائد کی پختگی خود بخود ہمارے اندر ان خیالات کو پیدا کر دیتی ہے - اس کی مثالیں ہمیں ہر وقت اپنے چاروں طرف نظر آتی ہیں - اس کی ایک انتہائی صورت مسمریزم (Mesmerism) کے عمل میں پائی جاتی ہے جب معمول عارضی طور پر اپنی قوت ارادی کو بالکل کھو بیٹھتا ہے اور عامل کے ہر خیال کو اپنا خیال سمجھ لیتا ہے - بےشک یہ تاثیر خیال کی انتہائی شکل ہے لیکن اس کو خرق عادت نہیں سمجھنا چاہیے - یہ ایک ایسی نفسی کیفیت کی انتہائی ترقی یافتہ صورت ہے جو ہم میں سے ہر ایک پر بارہا طاری ہوتی ہے - ہم بالعموم ان لوگوں کی باتوں اور خیالات کو آسانی سے مان لیتے ہیں جو علم یا دولت یا قوت یا کسی اور حیثیت سے ہم پر فوقیت رکھتے ہیں - یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی ہر بات اور خیال کو اپنے خیال

پر ترجیح دیں لیکن اس خاص علم یا فن یا شعبۂ زندگی میں جہاں ہم ان کی فوقیت کے قائل ہیں ہم بعض اوقات اپنے ذاتی عقیدے اور رائے کے خلاف بھی ان کی رائے پر عمل کرتے ہیں - البتہ جس شعبے میں ہم دوسرے لوگوں سے زیادہ علم یا تجربہ یا مہارت رکھتے ہیں وہاں ان کی رائے کو نظر انداز کر کے اپنی رائے پر قائم رہتے ہیں - مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا عالم لباس یا خوراک یا تھیٹر کے متعلق ایک جاہل کی رائے کو صحیح سمجھ لیتا ہے بشرطیکہ اس کو یہ خیال ہو کہ یہ شخص اس خاص معاملے میں زیادہ واقفیت رکھتا ہے - لیکن اگر یہی شخص اس عالم کے سامنے کسی علمی معاملے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے جو اس کی رائے سے مختلف ہو تو وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا بلکہ اس کا مضحکہ اڑائے گا - یہ نفسی کیفیت نہ صرف افراد پر طاری ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ جماعتوں اور شہروں اور ملکوں پر طاری ہو جاتی ہے - اور اس کی وجہ سے عجیب و غریب خبریں اور افواہیں مشہور ہو جاتی ہیں جنہیں لوگ بے سوچے سمجھے مان لیتے ہیں مثلاً بعض شہروں میں کبھی کبھی تین چار سال کے بعد یہ خبر اڑ جاتی ہے کہ شہر میں "لال خورے" آئے ہوئے ہیں اور وہ بچوں کو پکڑ لیتے ہیں اور ان کی "مومیائی" نکال کر لے جاتے ہیں - ہم نے دیکھا ہے کہ اچھے خاصے سمجھ دار اور باخبر لوگ اس بات کو یقین کر لیتے ہیں اور پریشان ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ پولیس جو نائیر خیال کیا تخیل ہی سے محفوظ سمجھی جاتی ہے باقاعدہ تحقیقات شروع کر دیتی ہے - حالانکہ اُن لوگوں نے نہ کبھی

''لال خوروں'' کو دیکھا ہے نہ ''مومیائی'' کو، بلکہ ان میں سے اکثر تو اِن الفاظ کے مفہوم سے بھی ناواقف ہیں - اِس کی وجہ یہ ہوتی ہے کو بالکل ناواقف اور خالی الذہن ہونے کی وجہ سے وہ اس قسم کی افواہ کو بغیر سوچے سمجھے بغیر تصدیق کیے قبول کر لیتے ہیں اور چونکہ یہ خبریں بہت جلد ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے شخص تک پہنچ جاتی ہیں اِس لیے ان میں ذرا سی دیر میں وہ قوت اور زور پیدا ہو جاتا ہے جو بہت سے لوگوں کی ہم خیالی کا نتیجہ ہے - اِس طرح جماعت کی تاثیر خیال افراد کو متاثر کر دیتی ہے - اس کی ایک اور مشہور مثال وہ افواہ ہے جو جنگ عظیم کے زمانے میں انگلستان کے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ اسی ہزار روسی سپاہی آئے ہیں تاکہ جرمنی کے خلاف انگریزوں کی مدد کریں ۱ - اتنی بڑی تعداد کا دفعتاً ملک میں پہنچ جانا بالکل خلاف قیاس تھا - اس کے متعلق کوئی سرکاری اطلاع یا بیان شائع نہیں ہوا تھا - لیکن ملک میں خوف اور پریشانی کا دور دورہ تھا - لوگ کسی ''غیبی امداد'' کے خواہاں تھے اور خواہش سے خیال کو قوت پہنچتی ہے - یہ خبر خدا جانے کہاں سے اُٹھی اور آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی لوگوں کو اس کا اس درجہ یقین ہو گیا کہ بہت سے معتبر اور ثقہ لوگوں نے یہ بیان دیا کہ ہم نے

۱ — اس واقعے کا ذکر علاوہ اور لوگوں کے لندن یونیورسٹی کے پروفیسر تعلیمات ڈاکٹر نن (Nunn) نے اپنی کتاب Education—its Data and First Principles میں کیا ہے -

اپنی آنکھ سے روسی فوج کے دستوں کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خاص حالتوں میں تاثیر خیال کا امکان بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور اس کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے ان خیالات کا تجزیہ کیا ہے جو تاثیر خیال کے لیے سازگار ہوتے ہیں۔ ا ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ تاثیر خیال کا اظہار اس وقت بہت زیادہ ہوتا ہے جب ہم عامل یا اثر آفریں شخص کی عالمیت یا قوت یا وجاہت کے قائل ہوں۔ اور کسی خاص معاملے میں ہماری یعنی معمول کی واقفیت اور علم یا تو بہت ناقص ہو یا اچھی طرح مربوط اور منظم نہ ہو اور ہم اس کو کسی نئے خیال کی تنقید کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ اگر عامل اپنے عقیدے اور خیال میں پختگی کا اظہار کرے اور اس خاص معاملے میں اپنی رائے کو بہت وثوق کے ساتھ ظاہر کرے تو ہم اسے بغیر عقلی تنقید اور غور و فکر کے تسلیم کرلیں گے۔ اس اظہار کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے خیال کو الفاظ میں بیان کرے۔ وہ اپنے عام انداز اور افعال سے بھی ایک خیال کو ظاہر کر سکتا ہے اور معمول پر اثر ڈال سکتا ہے۔ لیکن جن معاملات کے متعلق ہمارا اپنا علم یقینی

ا۔ "تاثیر خیال" (Suggestion) کی نفسیات کا باقاعدہ مطالعہ گزشتہ چند سال ہی میں کیا گیا ہے۔ خالص علمی اور اصطلاحی تصانیف سے قطع نظر کر کے اس نفسی پہلو کو فرانسیسی عالم لے بون (Le Bon) نے اپنی تصنیف "Psychology of the Crowd" میں اور تعلیمی پہلو کو پروفیسر کیٹنگ (Keatinge) نے "Suggestion in Education" میں اچھی طرح پیش کیا ہے۔

اور باقاعدہ طور پر مرتب ہوتا ہے ان کے بارے میں ہم دوسروں کی تاثیر خیال سے متاثر نہیں ہوتے -

تاثیر خیال کے لیے ہم نے جن صورتوں کو سازگار قرار دیا ہے وہ سب معلم اور شاگرد کے رشتے میں موجود ہیں - معلم عام طور پر جسمانی اور دماغی اعتبار سے اپنے شاگردوں پر فوقیت رکھتا ہے اور ان سے زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے اور اس کی منصبی حیثیت کی وجہ سے ان کے دل میں اس کی وقعت ہوتی ہے - برخلاف اس کے اکثر معاملات میں بچوں کی اپنی معلومات محدود ہوتی ہے اور اس طرح مربوط اور منظم نہیں ہوتی کہ ایک مدلل عقیدے کی شکل اختیار کرلے اور وہ اس کی مدد سے ہر نئے خیال اور نئے عقیدے کی تنقید کر سکیں - اس حالت میں استاد اپنی تاثیر خیال کی صلاحیت کو بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیے یا نہیں - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر استاد ایسا کریں گے تو طالبہ کی ذہنی اور اخلاقی آزادی میں خلل پڑے گا اور وہ مختلف مسائل کے متعلق اپنی ذاتی رائے قائم نہیں کریں گے بلکہ محض انفعالی طریقے پر اس کے خیالات کو قبول کر لیں گے - اس لیے ان لوگوں کے خیال میں استاد کو تاثیر خیال سے کام نہ لینا چاہیے - بیشک اگر کوئی معلم اس قوت کا " یا اپنی کسی قوت کا بھی " بےجا استعمال کرے اور اس سے طالبہ کی ذہنی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہو تو اس کا نتیجہ خراب ہوگا - لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر معلم چاہے بھی تو اس تاثیر کو پوری طرح نہیں روک سکتا - جہاں کہیں لوگ

مل جل کر رہتے ہیں ان کے خیالات اور عقائد، ان کی راے،
ان کے فلسفۂ زندگی کا اثر غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے
پر پڑتا ہے خصوصاً جب اس جماعت میں مختلف عمر اور
قابلیت اور تجربے کے لوگ ہیں۔ اس لئے سوال محض
یہ رہ جاتا ہے کہ معلم اس اثر کو بغیر احتیاط اور انتظام کے
طلبہ پر پڑنے دے یا اس بات کو محسوس کر کے کہ اس کی
شخصیت ناثر خیال کے ذریعے طلبہ کی شخصیت کو متاثر
کر رہی ہے۔ وہ اس سے فائدہ اٹھائے اور اس اثر کو ان
کی تربیت کا ایک مفید عنصر بنائے۔ پہلی صورت میں
استاد کا اثر ممکن ہے اچھا پڑے ممکن ہے برا۔ اسے اس عمل
پر قابو کیا اس کی طرف توجہ تک نہیں ہوگی۔ لیکن دوسری
صورت میں اسے ہمیشہ یہ احساس رہے گا کہ اس کے خیالات و
جذبات اسی کی ذات تک محدود نہیں بلکہ ان کا عکس
طلبہ کی طبیعت میں جھلکتا ہے۔ جب وہ کسی بات کے
متعلق خلوص کے ساتھ پسندیدگی یا نفرت یا جوش یا
بددلی کا اظہار کرتا ہے تو یہ سب غیر محسوس طریقے
پر اس سے متاثر ہوتے ہیں، اس لیے اس کا فرض ہے
کہ ہر وقت اپنے خیالات، اپنی راے، اپنے احساسات کا محاسبہ
کرتا رہے تاکہ ان پر بالقصد اچھا اثر ڈالے۔ لہذا استاد کو یہ
حق دینا چاہیے کہ وہ احتیاط کے ساتھ اس قوت کا استعمال
کرے اور اپنے بہتر علم، وسیع اور پختہ تر خیالات کو طلبہ کے
سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ ان سے شعوری استفادہ بھی
حاصل کریں اور غیر شعوری طور پر بھی متاثر ہوں۔

اسی صورت میں آزادی خیال میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ

ہوگا بلکہ جس طرح ہر انسان اپنے ماحول کے مختلف اثرات سے مستفید ہوتا ہے اسی طرح طالب علم اپنے اُستاد کا اثر قبول کرے گا ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اُستاد ان خیالات کو جبر اور تحکم کے ساتھ ان پر عائد نہ کرے کیونکہ اس کا اثر اکثر اوقات اُلٹا ہوتا ہے ۔ طلبہ میں اُستاد کی مخالفت اور نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اس کی ہر تجویز ، ہر مشورے کے برعکس عمل کرتے ہیں ۔ کیونکہ تاثیر خیال کے عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی خیال جبراً عائد نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ معمول کی طبیعت میں بہت آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر اثر کرتا ہے ۔ اکثر اُستاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو ادعائی انداز سے اپنے شاگردوں کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کی نقلیں کریں گے حالانکہ ان کے ادعا اور تحکم کی وجہ سے تاثیر خیال کی ساحرانہ کیفیت بالکل جاتی رہتی ہے ۔

ادب ، تاریخ اور فنون لطیفہ کی تعلیم اور فلسفۂ زندگی کی ترتیب میں اُستاد اس قابلیت سے بہت کام لے سکتا ہے کیونکہ ان چیزوں میں عقلی دلائل کی گنجائش کم اور ذاتی اثر ڈالنے کا موقع زیادہ ہوتا ہے ۔ جب ادب کا معلم کسی عمدہ نظم کو پڑھ کر جھومنے لگتا ہے یا جوش و خروش کے ساتھ کسی مستند ادیب کی تعریف کرتا ہے تو اس کے شاگردوں کے ادبی ذوق پر اس کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے اسی طرح جب کوئی طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ معلم کسی خاص تاریخی شخصیت کا بہت احترام کرتا ہے اور اس کا ذکر کرتے وقت اس کے انداز بیان ، اس کے چہرے بشرے ، غرض اس کی ہر ادا سے خلوص اور

عقیدت کا اظہار ہوتا ہے تو وہ بھی خود بخود اس کا احترام کرنے لگتا ہے علاوہ اس درسی تعلیم کے معلم کا سب سے اہم اور مشکل فرض یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کو زندگی کے صحیح اصولوں اور قدروں سے روشناس کرے - اس مقصد کے حصول میں زبانی تعلیم و تلقین کو بہت کم دخل ہے - نفسی زندگی کی تشکیل اور فلسفۂ حیات کی ترتیب میں سب سے زیادہ اثر عملی مثالوں کا ہوتا ہے خواہ وہ گزشتہ زمانے کے مشاہیر کی ہوں جن سے طالب علم ادب اور تاریخ کے ذریعے روشناس ہوتا ہے یا اس کے اپنے بزرگوں استادوں اور دور حاضرہ کی بڑی بڑی شخصیتوں کی زندہ مثالیں ہوں جن سے اس کو بالواسطہ یا بلا واسطہ سابقہ پڑتا ہے - وہ معلم جس کا اخلاقی اصولوں اور قدروں پر پختہ ایمان ہے' جو اس ایمان کا محض زبانی اقرار نہیں کرتا بلکہ اپنے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام میں' ہر بات اور ہر خیال میں اس کا عملی اظہار کرتا ہے' جس کی عادتیں ریاکاری اور تصنع سے پاک ہیں' جو ہر کام کو محنت اور دیانتداری سے کرتا ہے' جو ہر وقت دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی امداد کرنے کو تیار ہے' ایسا معلم غیر محسوس طریقے پر اپنی زندہ مثال کے ذریعے طلبہ کو ایک بہتر اور بلند تر معیار زندگی سے آشنا کرتا ہے اور ان کی خراب عادتوں اور ادنیٰ میلانات کو دور کر کے ایک اعلیٰ اخلاقی سیرت کا مالک بنا دیتا ہے - اب ہم اس تمام تفصیلی بحث کے نتائج پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈال کر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کے لیے ہمارے پاس کیا ذرائع ہیں اور ان سب کو استعمال کر کے ہم کن مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں - ہم چاہتے ہیں کہ مدرسے

کو اخلاقی تربیت کا گہوارہ بنائیں - اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس تمام عناصر کی نئے سرے سے تنظیم کریں - یہ عناصر کیا کیا ہیں؟ اول' مدرسے کی روزمرہ کی زندگی بحیثیت ایک معاشری ادارے کے - دوم' طلبہ کے کام کرنے اور مطالعہ کرنے اور استادوں کے تعلیم دینے کے طریقے - سوم' نصاب علوم - چہارم' مدرسے کا نظام ضبط و تادیب اور اس کی عام فضا - پنجم' معلموں کی جماعت - ہم ان سب سے اس طرح کام لینا چاہتے ہیں کہ طلبہ میں عمرانی معاملات کی سمجھ ان کو انجام دینے کی قابلیت اور عمرانی اور اخلاقی مقاصد سے دلی لگاؤ پیدا ہو - ہم نے جو نقطۂ نظر مندرجۂ بالا صفحات میں پیش کیا ہے اس کی رو سے مدرسے کو ایک حقیقی اخلاقی ماحول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک معاشری جماعت میں تبدیل کر دیا جائے جس میں انھیں اصولوں کی کارفرمائی ہو اور وہی طریقہ ہائے عمل مروج ہوں جو بہترین انسانی معاشروں میں پائے جاتے ہیں - اس قسم کے محرکات عمل مہیا کیے جائیں جو بہترین انسانی کاموں کا باعث ہوتے ہیں یعنی تجسس اور تعمیر کا شوق' خدمت کا ولولہ' تکمیل شخصیت اور اظہار خودی کی خواہش وغیرہ اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ نصاب کے مضامین کی ترتیب اور ان کا انتخاب اس لحاظ سے کیا جائے کہ طلبہ کو اس ماحول سے پوری طرح واقفیت پیدا ہو جس میں انہیں اپنی زندگی بسر کرنا ہے اور اپنے فرائض ادا کرنے ہیں - اس نصاب کی تعلیم میں یعنی اس سارے علمی مواد کو کتابوں اور استادوں کے دماغ سے منتقل کر کے طلبہ کے ذاتی تجربے اور علم کا حقیقی

جزو بنانے کے لیے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہییں کہ طلبہ کو عمل اور فعالیت کا موقع ملے، ان کے تعمیر و تخلیق اور خدمت اور اظہار خودی کے رجحانات کی تسکین ہو، انھیں مل جل کر کام کرنے کی عادت پڑے اور وہ اعتماد ذات احساس اور ذمہ داری کے ساتھ علم حاصل کریں اور اس سے کام لینا سیکھیں۔ ان صفات اور عادات کو آئندہ معاشری زندگی میں کارآمد بنانے کے لیے مدرسے کی حکومت اور نظام ضبط و تادیب میں بھی اس کی اجتماعی روح کا اظہار ہونا چاہیے یعنی طلبہ کو موقع دینا چاہیے کہ وہ خود اپنے مشاغل کی تنظیم کریں، اپنے معاشری معاملات کا فیصلہ کریں اور ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے خود قوانین بنائیں اور جماعتی تاثیر اور تادیب کے ذریعے ان کی پابندی کرائیں۔ مطلب یہ ہے کہ مدرسے کے درسی اور معاشری مشاغل کی بنیاد یکساں اصولوں پر رکھی جائے تاکہ ایک طرف طلبہ میں تحصیل علم کے شغل میں ذمہ داری، اجتہاد اور اعتماد نفس کی صفات پیدا ہوں اور دوسری طرف غیر درسی مشاغل کی ترتیب اور معاشری معاملات کی تنظیم میں بھی ان صفات سے کام لے سکیں جو حرکت، انقلاب اور جمہوریت کے اس دور میں انفرادی اور اجتماعی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ تعلیم میں اسی انقلاب عظیم کو پیدا کرنا معلموں کی جماعت کا کام ہے جو ایک طرف ان تمام وسائل کو استعمال کر کے طلبہ کے لیے ایک اخلاقی ماحول اور اخلاقی محرکات عمل مہیا کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنی شخصیت کے اثر سے ان میں براہ راست اخلاقی عادتوں اور اخلاقی اصولوں اور قوانین کا

احترام پیدا کرتے ہیں۔ نو عمر بچے اور نوجوان ان کی مثال کی تقلید کرتے ہیں اور ہمدردی اور تائید خیال کی نفسی کیفیات کے ذریعے ان کی حرکات و سکنات اور ان کے جذبات اور خیالات کو اپنا بنا لیتے ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر ان میں اس فلسفۂ زندگی اور معیار عمل کی روشنی سرایت کر جاتی ہے جو معلموں کی شخصیت میں کارفرما ہے بشرطیکہ معلم نے اس پیشے کو مجبور ہو کر اور بد دلی سے محض روزی کمانے کے خیال سے اختیار نہ کیا ہو بلکہ وہ خود کو معاشرت کا اخلاقی نمائندہ اور بہترین عمرانی اقدار کا حامل سمجھے اور انہیں اپنے شاگردوں تک منتقل کرنے کو اپنا فرض منصبی خیال کرے۔

باب ششم

اخلاقی سیرت کی تعمیر

ہم نے گزشتہ ابواب میں اخلاق اور اخلاقی تربیت کے مفہوم سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مدرسے میں کون کون سے وسائل ایسے ہیں جو اخلاقی تربیت کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں - اس باب میں ہم اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہم اپنی تربیت کے ذریعے افراد میں کیا صفات اور خصوصیات پیدا کرنا چاہتے ہیں - ضمناً ان صفات کا ذکر گزشتہ بحثوں میں آچکا ہے اور ہم نے کتاب کے پہلے حصے میں یہ بتایا ہے کہ جمہوری معاشرے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کس قسم کی سیرت کی ضرورت ہے - یہاں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان اہم‌ترین انسانی خصائص سے بحث کرنا چاہتے ہیں - جس کا کسی نہ کسی حد تک اخلاقی سیرت میں شامل ہونا ضروری ہے - ان کی تشریح میں ہمیں اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا یعنی ارتقائے نفس کے اعتبار سے کن صفات کی نشو و نما ضروری ہے اور معاشری اور تمدنی حالات بالخصوص اپنے ملک کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان صفات

کی ترتیب کس تناسب سے کرنی چاہیے اور ان کی اضافی قدر و قیمت کیا ہونی چاہیے - ہمیں اپنے ذہن میں دوبارہ اس نفسی حقیقت کو تازہ کر لینا چاہیے کہ انسان کی سیرت اس کے اعمال و کردار سب ان جبلی رجحانوں پر منحصر ہیں جو اس کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں - انسان کا نفسی ارتقاء ایک مسلسل عمل ہے جو ابتدائی غیر مربوط حرکات اور فطری جبلتوں کے سادہ اظہار سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ ماحول کے مختلف اثرات کے ماتحت عادتوں اور طبیعت کی خصوصیتوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے - ہمارے تمام اخلاقی اصول، ہماری عقل اور ہمارا علم اسی بنیاد پر قائم ہے - اسی لیے معلم کے واسطے جو ذہن اور سیرت کی تربیت کرنا چاہتا ہے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ان نفسی رجحانات کا بغور مطالعہ کرے جو عمر کی مختلف منزلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور بچوں اور نوجوانوں کے مشاغل اور اعمال کے محرک ہوتے ہیں - اگر وہ ان کے تمام درسی اور غیر درسی مشاغل کی تنظیم اسی طرح کرے گا کہ ان میں ان نفسی رجحانات کو اظہار کا موقع ملے اور ان میں ربط و ترتیب قائم ہو تو طالبہ جو کچھ حاصل کریں گے، خواہ اس کا تعلق علمی قابلیت سے ہو یا اخلاقی صفات اور عادات سے، وہ ان کی شخصیت کا جزو ہو جائے گا کیونکہ ان کے مشاغل کی محرک خود ان کی ذات ہوگی - برخلاف اس کے اگر ہم مدرسے میں طالبہ کے فطری شوقوں اور رجحانوں کی طرف توجہ نہ کریں گے اور ان کو نظرانداز کر کے خارجی محرکات مثلاً استاد کا خوف یا انعام کے لالچ یا باہمی رشک و مسابقت کے جذبے کے

کام لیں گے تو ان کی تعلیم محض سطحی ہوگی اور ان کے اعمال اور سیرت پر کوئی دیرپا اثر نہ ڈالے گی - اس لیے علم النفس کا یہ تقاضا ہے کہ معلم بہت غور سے بچوں کے ازادانہ اعمال و مشاغل کا مطالعہ کرے کیونکہ ان کے جبلی رجحانات کا اظہار سب سے زیادہ خوبی اور وضاحت کے ساتھ ان کے کھیل کود اور ان کے کاموں میں ہوتا ہے جنھیں وہ اپنی پسند سے کرتے ہیں - یہ مشاغل نفسیات کے نقطۂ نظر سے بجائے خود اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنی انہیں "علامات" کے طور پر حاصل ہے اس لیے کہ ان کے معنی اور منشا پر غور کرنے سے طالبہ کی نفسی زندگی کے متعلق بہت مفید معلومات حاصل ہوتی ہے - معلم کو چاہیے کہ ان معلومات کی روشنی میں بچوں کے تعلیمی ماحول کو اس طرح منظم کرے کہ ان کے جبلی رجحانات پسندیدہ حالتوں میں تبدیل ہو جائیں اور عمدہ سیرت کی بنیاد بن جائیں - اسی جملے کے ان ابتدائی الفاظ کو " بچوں کے ماحول کو اس طرح منظم کرے " ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے - کیونکہ موجودہ نظریۂ تعلیم کا اصل اصول یہ ہے کہ ہم براہ راست اپنے عقائد اور جذبات اور معلومات بچوں میں منتقل نہیں کر سکتے اور نہ ان میں بلاواسطہ وہ عادات اور صفات پیدا کر سکتے ہیں جو معاشری زندگی کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری ہیں - اُن عادات و صفات کی تعلیم میں ماحول کی وساطت لازم ہے یعنی تعلیم پانے والوں کے لیے ایسے حالات اور مشاغل مہیا کیے جائیں جن کی مدد سے وہ عملی طور پر ان معلومات اور صفات کو حاصل کر سکیں - اسی وجہ سے ہم نے بار بار اس بات پر زور

دیا ہے کہ اخلاقی تربیت میں لفظی اور زبانی تعلیم کے بجائے
ایسے حالات اور مواقع پیدا کیے جائیں بالفاظ دیگر ایسا
ماحول مقرر کیا جائے جس میں زندگی بسر کرنے سے اخلاقی
سیرت کی تعمیر ہو سکے - اس امر پر ہم کتاب کے ابتدائی
حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں - اب ہم اس
مسئلے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اخلاقی سیرت کی
تعمیر و تکمیل میں ہمیں کن صفات کو شعوری طور پر اپنے
سامنے رکھنا چاہیے اور اپنی بحث کی بنیاد زمانۂ حال کے
دو جدید مفکرین پروفیسر ڈیوئی اور برٹرنڈ رسل پر رکھتے ہیں -

پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اخلاقی سیرت کے تین اہم
اور لازمی اجزا قرار دیے ہیں۱ :—

اول قوت عمل یا کارکردگی کی صلاحیت - ہم اکثر گفتگو
میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی سیرت بہت مضبوط ہے یا
بہت پختہ ہے - اس سے ہماری یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں
یہ قابلیت ہے کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو اس کے
انجام دینے میں استقلال، محنت، جرأت اور حوصلے سے کام
لیتا ہے - یہ اعلیٰ صفات میں جو بحیثیت مجموعی ہماری
سیرت کے اس رخ کو ظاہر کرتی ہیں جو ہمیں مشکلات پر قابو
پانے میں مدد دیتا ہے اور مایوسیوں اور شکستوں کا مقابلہ کر کے
آخرکار کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے - ظاہر ہے کہ جس
شخص کی طبیعت میں یہ عنصر نہ ہوگا وہ اپنے ارادوں کو عمل

۱ اس کی تفصیلی بحث انہوں نے Democracy and Education
میں مختصر بحث School and Society میں کی ہے -

میں نہیں لا سکتا عام اس سے کہ وہ ارادے اچھے ہیں یا برے۔ ہر ارادے اور عمل کے درمیان بالعموم ایک طویل منزل حائل ہوتی ہے جس میں انسان کو کاوش اور جد و جہد سے کام لینا پڑتا ہے وسائل کی تنظیم کر کے اور مادی اور نفسی حالات کو قابو میں لا کر اپنے ماحول کو اپنا مددگار بنانا پڑتا ہے جو شخص صرف نیک ارادوں کی پونجی لے کر زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہم اس کی نیک نیتی کی ایک حد تک تعریف کر سکتے ہیں لیکن ہمیں یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اس صورت حال کی ایک بہت عمدہ مثال ٹالسٹائے (Tolstoy) کے ایک مشہور افسانے میں ملتی ہے جس کو رسل (Russel) نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ وہ ایک روسی خاتون کا قصہ بیان کرتا ہے جس نے تھیٹر میں ایک نہایت المناک ڈراما دیکھا تھا۔ دسمبر کا زمانہ تھا اور آدھی رات کا وقت۔ کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ یہ خاتون اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ ڈرامے کو دیکھ کر وہ اس قدر متاثر ہوئی تھی اور اس پر اس درجہ رقت طاری تھی کہ وہ راستے بھر قصے کے ہیرو کی خیالی مصیبتوں کو یاد کرکے روتی رہی۔ لیکن نہ اس میں اتنا تخیل تھا نہ قوت عمل کہ اپنے اس گاڑی بان کا خیال کرتی جو سردی میں باہر بیٹھا ہوا گاڑی چلا رہا تھا اور گھر تک پہنچنے سے پہلے ٹھٹھر کر مر گیا۔ اس کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک کاموں کے لئے محض نیک دلی اور رقت قلب نہیں بلکہ تخیل کی وسعت، حالات سے واقفیت اور عمل کی صلاحیت بھی درکار ہے تاکہ جذبات کو عمل کا

جامہ پہنایا جائے یہ صفات سب لوگوں میں یکساں نہیں ہوتیں - کسی میں زیادہ ہوتی ہیں کسی میں کم - لیکن ہر تندرست اور صحیح دماغ رکھنے والے بچے میں فطرتاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ کر کے دکھائے' کسی طرح اپنے عمل کا سکہ اپنے ماحول پر جمائے - یہ وہی خواہش ہے جو چھوٹے بچوں کے کھیلوں میں ان کی تعمیر و تخریب میں ظاہر ہوتی ہے - اس تقاضائے عمل کی حقیقت کو سمجھنا' اس کو ایسے مشاغل میں استعمال کرنا جو تعلیم و تربیت کے مقاصد میں معین ہوں' اس کو حسب توقع ابھارنا اور راہ پر لگانا تاکہ بچے میں مفید عادتیں پیدا ہوں' یہ مدرسہ اور معلم کا فرض ہے -

لیکن یہ ظاہر ہے کہ محض قوت عمل حسن سیرت کی ضامن نہیں ہوسکتی کیونکہ قوت ایک وسیلہ ہے جو اچھے برے دونوں طرح کے مقاصد کے لیے استعمال ہوسکتا ہے - ہمیں بےشمار مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں افراد اور جماعتوں نے اپنی قوت کو ایسے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے جو معاشری مفاد کے خلاف تھے اور اس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں - اس لیے قوت عمل کو قابل قدر اخلاقی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشری نقطۂ نظر سے مفید کاموں میں صرف ہو - اس کے لیے دو اور صفات کا ہونا لازمی ہے یعنی قوت فیصلہ اور ذکاوت احساس -

انسانی سیرت کا عقلی یا ذہنی پہلو اس وقت مکمل ہوگا جب انسان کی قوت فیصلہ کی تربیت کی جائے - یہ

قوت محض علم تک محدود نہیں بلکہ عقل اور اس کے استعمال کی صلاحیت پر منحصر ہے - جب ہمارا علم مربوط اور منظم ہو، جب وہ ذہن میں روشنی پیدا کرے، عملی مقاصد میں مدد دے، جب اس کی بدولت ہم میں معاملات کی سمجھ، احساس تناسب، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی پیدا ہو جائے اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم فیصلے کی قوت رکھتے ہیں - اس کی تشریح ایک مثال سے ہو سکتی ہے - ایک طالب علم تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے حالات پڑھتا ہے اور اس کے ذریعے بہت سی معلومات حاصل کرتا ہے - اگر اس کا نتیجہ محض یہ ہو کہ اسے بہت سے نام اور تاریخی واقعات یاد ہو جائیں جن کو وہ مثلاً امتحان کے وقت بیان کرسکے تو اس کی معلومات بےجان رہے گی اور اس سے اس کی قوت فیصلہ کی تربیت میں مدد نہ ملے گی - بر خلاف اس کے اگر تاریخ کے مطالعے سے اس میں انسانی معاشرے کی ارتقاء کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوجائے اگر وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کرے کہ موجودہ تمدن نے کس طرح رفتہ رفتہ ابتدائی مدارج سے ترقی کی ہے اور اس میں انسانوں کی متعدد کوششوں کو کس درجہ دخل ہے، اگر وہ اس علم کو اپنے عہد کی زندگی کے سمجھنے اور اس کے فرائض کو ادا کرنے میں استعمال کرسکے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس میں تاریخ کے مطالعے سے قوت فیصلہ پیدا ہو گئی ہے یعنی اب وہ تاریخی واقفیت کو مدنی مسائل اور انسانی معاملات کا فیصلہ کرنے میں استعمال کرسکتا ہے - یہی حال اور تمام علوم کا ہے - جب ان کے مطالعے سے انسان کے طرزِ عمل پر

اثر پڑتا ہے اور اس میں معاملہ فہمی کا مادہ ہو جاتا ہے تو وہ اس کی عقل اور قوت فیصلہ کی تربیت میں معین ہوتے ہیں ۔ لہذا اس قوت کی نشو و نما میں صرف نصاب تعلیم کی اصلاح کو دخل ہے بلکہ اس کا انحصار بڑی حد تک طریقۂ تعلیم و تحصیل پر بھی ہے ۔

تیسری صفت جو عمدہ سیرت کا جزو ہے جذبات سے تعلق رکھتی ہے ۔ اگر کسی شخص میں قوت عمل اور قوت فیصلہ دونوں موجود ہوں مگر وہ ذکاوت احساس سے محروم ہو تو وہ معاشرے کا مفید رکن نہیں بن سکتا ۔ لوگ اپنی عقل اور علم کو نہایت قابلیت کے ساتھ صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور چونکہ ان میں قوت عمل ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں ۔ تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاہوں کی مثالیں ملتی ہیں اور خود ہم میں سے ہر ایک کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کو معاشری اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں، جن کو اخلاق کے اصول بالکل مجرد اور دور از کار معلوم ہوتے ہیں، جن میں روح انسانی کی بلند تر آرزوؤں کی مطلق حس نہیں ۔ وہ کنویں کے مینڈک کی طرح اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے ۔ موجودہ صنعت و حرفت کے تمدن میں ایسی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں ۔ اس کی ایک نہایت زبردست مثال، سنکلیر (Sinclaire) نے اپنے ناول، میں جس کا اوپر ذکر آچکا ہے ورنن روسکو (Vernon

---

Oil ۔

(Roscoe) کی شخصیت میں دکھائی ہے جس کا مقصد حیات یہی تھا کہ وہ زمین سے مٹی کا تیل نکال کر اپنی دولت میں اضافہ کرے اور اس راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہوں ان کو بلا تامل ہر امکانی ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کرے - اس مقصد کے حصول کی دھن میں اس کے نزدیک انصاف، دیانتداری، مروت، انسانیت یہ سب محض بےمعنی الفاظ تھے، اور ظلم، بےدردی، رشوت، بددیانتی ہر چیز جائز تھی - اگر اس کا کوئی نصب‌العین تھا تو محض یہ کہ اس کا کام نہایت خوبی اور انتظام کے ساتھ چلتا رہے اور اس میں سے ہر قسم کے اسراف کو دور کردیا جائے - ظاہر ہے کہ اگر کسی جماعت میں تمام افراد ایسے ہی ہوں گے تو اس کا سارا کام بند ہو جائے گا - "ہر شخص کا ہاتھ دوسروں کی مخالفت میں اٹھا رہے گا" اور کسی شخص کو سوائے اپنی ذاتی اغراض کے کسی چیز سے دلچسپی نہ ہوگی - لہذا معلم کا، اور مدرسے کی تعلیم کا، مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ کے جذبات کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں ذکاوت احساس پیدا ہو، وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوں - جب انہیں کسی اہم معاشری تحریک یا اخلاقی مسئلے سے سابقہ پڑے تو وہ اس کی طرف دل سے توجہ کریں اور اس پر محض اپنے شخصی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے غور کریں - ہر کام میں اس بات کو مدنظر رکھیں کہ اس کا رد عمل دوسروں پر کیا ہوگا، اس میں ان کی حق تلفی تو نہ ہوگی، ان کے جائز جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگے گی - جب انسان کے نفس میں ذکاوت احساس کی بدولت

ہمدردی، اور فراخ دلی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر تمدنی اغراض و مقاصد سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا شخصی نصب العین اجتماعی نصب العین سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے - اس میں اخلاق کی وہ امتیازی شان پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں بےجا فرق نہ کرے اور اپنی بھلائی اور بہتری اُن مشاغل میں تلاش کرے جن کا نتیجہ معاشری لحاظ سے قابل قدر ہو - انسانی ہمدردی کی وسعت اور گہرائی کے متعلق جو کچھ کہا جا چکا ہے وہ اس موقع پر بھی صادق آتا ہے -

اب ہم برٹرنڈ رسل کے خیالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے انسانی سیرت کے اہم ترین فضائل کیا قرار دیے ہیں - وہ کہتا ہے کہ یہ صفات ایسی نہیں ہونی چاہئیں جو بعض لوگوں کے لیے موزوں ہوں اور بعض کے لیے نہ ہوں - ہمیں ان عام صفات کی تلاش ہے جو ہر تربیت یافتہ انسان کے لیے مفید اور ضروری ہیں - وہ اس نقطۂ نظر کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہے :—

"کچھ صفات ایسی ہیں جو سب انسانوں کے لیے نہیں بعض کے لیے مفید ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو سب کے لیے ضروری اور مطلوب ہیں - بیشک ہمیں صناعتوں کی ضرورت ہے، سائنس دانوں کی ضرورت ہے، بڑے بڑے مدبروں کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہل چلانے

والے، آٹا پیسنے والے اور نان‌بائی بھی درکار ہیں - وہ صفات جن کی بدولت انسان کسی خاص شعبۂ عمل میں امتیاز حاصل کرتا ہے عموماً ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا سب کے لیے عام ہو جانا کچھ اچھا نہیں - شیلے (Shelley) ایک شاعر، کے دن بھر کے کام کو اس طرح بیان کرتا ہے :—

' وہ نور کے تڑکے سے چھٹپٹے وقت تک اس نظارے سے لطف اٹھاتا ہے، کہ سورج کی کرنوں کی جوت سے ساری فضا جگمگا رہی ہے، اور اس کی تہ میں سبز کائی کے اندر شہد کی مکھیاں کھیلتی پھرتی ہیں - اس کی بلا جانے یہ کون ہیں، کیا ہیں !

یہ عادت ایک شاعر کے لیے ضرور قابل تعریف ہے - لیکن کسی اور شخص مثلاً چٹھی رساں کے لیے نہیں - لہذا ہم ایسی تعلیم نہیں دے سکتے جو ہر شخص میں شاعرانہ طبیعت کی نشو و نما کرے - مگر بعض صفات عام طور پر مفید اور پسندیدہ ہیں اور ہم یہاں صرف انہیں سے بحث کریں گے - ہمارے خیال میں چار صفات ایسی ہیں جو مل کر بہترین سیرت کی بنیاد بن سکتی ہیں :—

(۱) قوت، (۲) جرأت، (۳) ذکاوت احساس، (۴) ذہانت، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ فہرست مکمل ہے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ چاروں چیزیں موجود ہوں تو بہت کافی ہیں - اور مجھے یہ بھی پوری طرح یقین ہے کہ اگر بچوں کی دماغی جسمانی اور جذباتی تربیت میں غور اور

احتیاط سے کام لیا جائے تو یہ صفات بہت عام ہوسکتی ہیں - "

اس کے بعد رسل (Russel) نے ان چاروں صفات سے یکے بعد دیگرے بحث کر کے بتایا ہے کہ ان کا مفہوم اس کے ذہن میں کیا ہے اور یہ کس طرح انسانی سیرت کی تکمیل کرتی ہیں - پہلی دو صفات یعنی قوت اور جرأت ایک حد تک ڈیوئی کے یہاں " قوت عمل " میں شامل ہیں - لیکن رسل ان دونوں میں امتیاز کرتا ہے - قوت کا تعلق ' اس کے خیال میں زیادہتر جسم سے ہے - اگر بچے کی جسمانی صحت اچھی ہے اور اس کے بدن میں طاقت ہے تو اس کو تکلیفیں مقابلتاً کم محسوس ہوں گی - اور وہ زندگی سے زیادہ لطف‌اندوز ہوگا - وہ اپنی ذات میں اتنا منہمک نہیں ہوگا کہ اپنے جسم کے سوا دنیا کی اور تمام چیزیں اس کو بےمعنی اور بےلطف معلوم ہوں - اسے گرد و پیش کے واقعات اور اشخاص اور خارجی چیزوں سے دلچسپی ہوگی اور وہ محنت سے جی نہیں چرائے گا - وہ دوسروں کی خوش حالی کو دیکھ کر حسد نہیں کرے گا کیونکہ حسد کمزوری اور بیماری کی نشانی ہے - وہ عام طور پر خوش اور بشاش رہے گا اور اپنے اوپر افسردگی اور بے دلی کو طاری نہیں ہونے دے گا - رسل اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض صورتوں میں قوت کے نتائج برے بھی ہوتے ہیں اور بعض مستثنیٰ حالتوں میں لوگوں نے اس کے بغیر بھی بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں - لیکن بحیثیت مجموعی ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ قوت سیرت کا ایک لازمی عنصر ہے اور جو نظام تعلیم قوت پیدا کرنے پر زور نہیں دیتا وہ اپنے مقصود میں کامیاب

نہیں ہوسکتی - خصوصاً موجودہ زمانے میں جب زندگی پر مسابقت اور جد و جہد کا قانون حاوی ہے -

دوسری صفت ہے جرأت' یعنی خوف پر غالب آنے کی قوت - ہمیں نہ صرف اپنی ظاہری حرکات اور افعال کو خوف سے پاک رکھنا چاہیے بلکہ اپنے خیالات اور جذبات میں بھی اس کو راہ نہ دینی چاہیے - بچوں کے لیے یہ تعلیم' جس پر مثلاً انگریزوں کی تربیت مبنی ہے' کافی نہیں کہ وہ خوف کو ظاہر نہ کریں - کیونکہ اگر خودداری یا دوسروں کی شرم اور لحاظ کی وجہ سے وہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے ان ظاہری حرکات کو روکیں گے جن سے خوف کا اظہار ہوتا ہے اور جو عام طور پر معیوب سمجھی جاتی ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوف دماغ کے غیر شعوری حصے میں پہنچ کر ان کے اطمینان اور سکون قلب کو غارت کر دے گا اور زندگی بھر نئے نئے بھیس بدل کر عجیب و غریب شکلوں میں ظاہر ہوتا رہے گا - اس مسئلے پر ماہرین تحلیل نفسی (Psychoanalysts) نے اپنی تحقیقات کے ذریعے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خوف بلکہ ہر قوی جبلت کو دبا دینے سے کیا کیا خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں - علاوہ اس کے جسمانی خوف پر غالب آنے کی کوشش میں اکثر رائے عامہ کا یا دوستوں کی ناراضگی اور لعن طعن کا نیا خوف پیدا ہو جاتا ہے جو سیرت کی اعلیٰ تربیت میں خارج ہوتا ہے کیونکہ آئندہ عمر میں انسان اپنے ہر کام میں' اسی خوف ملامت کو اپنا راہبر بناتا ہے - ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اخلاقی سیرت کے تدریجی ارتقاء میں یہ محرک عمل

بھی ایک وقت میں مفید ثابت ہوتا ہے لیکن سیرت کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب انسان ملامت کے خوف اور دوسروں کی رضاجوئی دونوں پر غالب آ جائے - لہذا سوال یہ ہے کہ سچی جرأت طلبہ میں کس طرح پیدا کی جائے ؟

اس جرأت کو پیدا کرنے میں صحت اور قوت دونوں کو دخل ہے - وہ اس وقت مستحکم ہوتی ہے جب انسان کو پر خطر موقعے پیش آئیں اور وہ دل کو مضبوط کرکے دانش مندی سے کام لے کر ان موقعوں پر کامیابی حاصل کرے - اس قسم کی جرأت کی ایک نہایت عمدہ مثال ایک انگریز افسانہ نویس " سیپر " (Sapper) نے اپنے ہیرو " بل ڈاگ ڈرمنڈ " (Bull Dog Drummond) کے کردار میں دکھائی ہے - اس میں غیر معمولی جسمانی قوت ہے جو اس کے دل کو قوی رکھتی ہے، اور جنگ عظیم کے ہولناک تجربات کی بدولت یہ قابلیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ نہایت اطمینان کے ساتھ، اپنے ہوش و حواس کو مجتمع کر کے کر سکتا ہے - بلکہ خطرہ اس کے حواس اور اس کے ذہن کو اور زیادہ تیز کر دیتا ہے - یہ جرأت در اصل جسمانی جرأت ہے جس میں ذہنی تربیت کے شریک ہوجانے سے کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہوگیا ہے - لیکن ہمیں ایسے عام جذبۂ جرأت کی نشو و نما کرنی ہے جس کی بدولت انسان زندگی کی تمام مشکلات کو مردانہوار برداشت کرے، خواہ وہ خارجی ہوں اور جسمانی دلیری کی طالب ہوں، خواہ داخلی جن کے مقابلے کے لیے ضبط نفس درکار ہے - اس جذبے کی تربیت کے لیے انسان میں دو گہری نفسی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے یعنی

ایک تو خودداری یا عزت نفس کا احساس اور دوسرے ذاتی اغراض سے قطع نظر کر کے زندگی سے بلفسہ دلچسپی رکھنے اور اس کا غیر شخصی نظر سے مطالعہ کرنے کی صلاحیت - عزت نفس کا احساس انھیں لوگوں میں ہوسکتا ھے جن کی زندگی کا مرکز خود ان کی ذات کے اندر ہو، اس معنی میں نہیں کہ وہ تنگ نظر یا خود غرض یا نفس پرست ہوں بلکہ اس معنی میں کہ ان کے خیالات اور مقاصد اور رائیں ان کے اپنے تجربے اور فکر کا نتیجہ ہوں اور وہ یہ سمجھیں کہ بحیثیت انسان کے ان کو آزادی فکر و عمل کا حق حاصل ھے جس سے کوئی شخص انہیں محروم نہیں کر سکتا - برخلاف اس کے جن لوگوں کے خیالات اور جذبات اور افعال محض دوسروں کی تقلید پر مبنی ہوتے ہیں، جو ہر وقت دوسروں کی تحسین کے خواہاں رہتے ہیں ان میں حقیقی جرأت پیدا نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کہیں ایسا کام نہ کر بیٹھیں جس کی وجہ سے دوسرے لوگ انہیں برا کہیں یا حقیر سمجھیں - اس کمزوری کی وجہ سے اکثر لوگ فیشن کے، یا عوام کے توہمات اور مہمل رسم و رواج کے غلام ہوجاتے ہیں اور جوہر انسانیت کی بے حرمتی کرتے ہیں یا ان میں جھوٹا انکسار اور ریاکاری پیدا ہو جاتی ھے اور عزت نفس جو تمام فعالی نیکیوں کی بنیاد ھے جاتی رہتی ھے - لہذا تعلیم کے ذریعے طلبہ میں عزت نفس کے احساس کو اُبھارنے اور مستحکم کرنے کی ضرورت ھے - دوسری شرط جو اعلیٰ قسم کی جرأت پیدا ہونے کے لئے ضروری ھے وہ یہ ھے کہ انسان میں زندگی کو غیر شخصی نظر سے دیکھنے کی صلاحیت ہو -

جس شخص کی تمام امیدیں اور اندیشے اپنی ہی ذات سے
ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، وہ اطمینان قلب کے ساتھ کسی خطرے
کا خصوصاً موت کا سامنا نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے نزدیک
اپنی موت گویا تمام دنیا کا خاتمہ ہے - وہ نہیں سمجھ
سکتا کہ کائنات میں بہت سی قوتیں، اور اجتماعی اور
اخلاقی نظام ایسے ہیں جو فرد کی زندگی سے اہم تر،
بلندتر اور بے نیاز ہیں اس لیے اپنی ذات کو غیر معمولی
اہمیت دینا ایک مضحکہ خیز حرکت ہے - اسے یہ
احساس ہونا ہے کہ حیات انسانی کی بقا اور ترقی اسی
جیسے انسانوں کے عمل پر منحصر ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک
آدمی کی زندگی کا چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ جائے
لیکن اس کا نام کسی زبردست ادبی یا اخلاقی یا معاشری
کارنامے کی بدولت ہمیشہ روشن رہے اور اسے زندۂ جاوید بنا
دے - بہر حال جب تک انسان اپنی محدود ذات کی طرف
سے بےتعلقی کی یہ شان پیدا نہ کرے اس میں حقیقی اخلاقی
جرأت کا پیدا ہونا ممکن نہیں - لیکن اس انداز طبیعت کو
پیدا کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان نفس کشی اور ترک
دنیا اختیار کرے اور بےسبب پابندیں اپنانے کو تزکیۂ نفس
کا ذریعہ قرار دے - دنیا کے تمام مذاہب اور ملکوں میں
ایسے لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے اس رہبانی
فلسفۂ زندگی کو اختیار کیا ہے اور وہ نفی حیات کے ذریعے
اپنی نجات کی کوشش کرتے ہیں بجائے اس کے کہ اپنی
فطری خواہشوں اور قوتوں کی توسیع و تربیت کر کے ان کو
اخلاقی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کریں - ہم نے

ارتقائے شخصیت کا جو نقطۂ نظر اس کتاب میں پیش کیا ہے وہ "نفی حیات" کے سراسر خلاف ہے اور اس کی رو سے اخلاقی تربیت کا نقطۂ آغاز یہی فطری خواہشات اور جبلتیں ہیں جن کو ہم اپنے ماحول کے اثر اور تجربے کے ذریعے زیادہ وسیع اور منظم بناتے ہیں اور بلندتر مقاصد سے وابستہ کرتے ہیں - اس لیے غیر شخصی انداز طبیعت پیدا کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم بچوں میں مختلف قسم کے قابل قدر مقاصد سے دلچسپی پیدا کریں اور ان کو ان کی ذات کے محدود دائرے سے نکال کر ان علوم و فنون اور مشاغل سے روشناس کریں جن میں منہمک ہو کر وہ حقیقی معرفت نفس حاصل کریں اور ان کی خودی اس درجہ وسیع ہو جائے کہ وہ خارجی دنیا کے بہترین عناصر کو اپنے اندر سموت لے - رسل نے بتایا ہے کہ وہ بہترین اور قابل قدر عناصر کیا ہیں جو انسان کی خودی کو وسعت بخشتے ہیں :—

> "فطرت انسانی میں بعض چیزیں ایسی ودیعت کی گئی ہیں جو بغیر کوشش کے ہمیں خودی کی تنگ چاردیواری سے باہر لے جاتی ہیں - ان میں سب سے زیادہ عام محبت کا جذبہ ہے خصوصاً والدین کی محبت جو بعض لوگوں میں ایسی وسیع شکل اختیار کر لیتی ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو اپنی آغوش شفقت میں لے لیتی ہے - اسی قسم کی دوسری چیز علم ہے - ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مشہور عالم فلکیات گلیلیو (Galileo) کو نوع انسانی سے کوئی خاص محبت تھی لیکن اس نے

اپنی زندگی یقیناً ایک ایسے مقصد کی خاطر بسر کی
جس کو موت بھی تمام نہ کر سکی - اس طرح ایک
تیسری چیز آرٹ ہے بلکہ دراصل یہ کہنا چاہیے کہ
جس حد تک انسان اپنے جسم کے علاوہ خارجی چیزوں
سے دلچسپی رکھتا ہے اسی حد تک اس کی زندگی
غیر شخصی ہوتی جاتی ہے - گو بظاہر یہ بات عجیب
معلوم ہوتی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس شخص کو
بہت سی چیزوں سے قلبی تعلق اور دلچسپی ہوتی
ہے اسے زندگی کو خیرباد کہتے وقت اس قدر تکلیف
نہیں ہوتی جتنی اس بیچارے شکی دائم المرض آدمی
کو جس کی دلچسپی اور توجہ ہمیشہ اپنی ہی بیماریوں
اور تکلیفوں تک محدود رہی ہو - لہذا جرأت کی تکمیل
اس آدمی کی شخصیت میں ہوتی ہے جو بہت سی
دلچسپیاں رکھتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی
" خودی" دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے نہ اس وجہ سے
کہ وہ خود کو حقیر جانتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ
بہت سی ایسی چیزوں کی قدر و احترام کرتا ہے جو اس
کی ذات کے ماورا ہیں - یہ بات صرف اسی صورت میں
ممکن ہے جب انسان کی جبلتوں کو آزادی حاصل ہو
اور اس کی ذہانت پوری طرح کام کرتی ہو - ان دونوں
کے اتحاد سے جو ہمہ گیر وسعت نظر پیدا ہوتی ہے اس سے
نہ تو تارک الدنیا راہب آشنا ہوتا ہے نہ نفس پرست
عیاش - اس طبیعت کے آدمی کے لئے اپنی موت ایک
بہت معمولی سا واقعہ ہے - یہ جرأت حقیقی اور ثبوتی

ہوتی ہے اور اس کی بنیاد جبلت پر قائم ہوتی ہے ۔ یہ محض منفی جرأت نہیں جو فطری جذبات کو دبانے سے پیدا ہو۔ اس قسم کی ذہنی جرأت کو میں سیرت انسانی کی تکمیل کے لیے ایک بہت اہم عنصر سمجھتا ہوں'' ۔ ۱

سیرت انسانی کی تیسری صفت رسل (Russel) کے نزدیک ذکاوت احساس ہے یعنی انسان کا جذبات کے معاملے میں سریع الحس ہونا تاکہ ماحول کے مختلف محرکات اس میں مناسب جذبات پیدا کریں ۔ جس شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گرد و پیش کی اچھی اور بری، خوش گوار اور ناگوار چیزوں سے مناسب طریقے سے متاثر ہو سکے وہ معاشری اور اخلاقی زندگی میں کامیابی کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ عمل کے محرک ہمیشہ جذبات ہی ہوتے ہیں یا کم از کم عمل کو مستقل اور مسلسل بنانے کے لیے وہ قوت محرکہ درکار ہے جو جذبات میں پوشیدہ ہوتی ہے ۔ نفسیات نے انسانی عمل کے تین عناصر بتائے ہیں یعنی ادراک (Cognition) جذبہ (Emotion) اور فعل (Conation) ۔ ان میں سے ادراک اور فعل دونوں میں تغیر اور تبدیلی ممکن ہے لیکن انسان کے مستقل جذبات ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور انہیں سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو اسے باوجود مشکلات کے ثابت قدم رکھتی ہے ۔ بہر حال جذبات اور ان کی تربیت کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اگر کسی شخص میں معاشری حالات اور ضروریات کو دیکھ کر یا ان کا خیال کر

---

۱ On Education صفحہ ۵۴-۵۵ ۔

کے مناسب جذبات کا جوش پیدا نہ ہوا تو وہ خود کو عمرانی مقاصد کے ساتھ کیسے متحد کر سکتا ہے؟ اس احساس کی تربیت میں کئی چیزیں شریک ہوتی ہیں - شروع میں بچے کی تحسین طلبی کی خواہش اپنا اثر کرتی ہے - وہ دوسروں کی خوشنودی اور تعریف کا خواہاں ہوتا ہے اور ان کی ملامت سے بچنا چاہتا ہے - اکثر لوگوں میں یہ محرک عمل تمام عمر باقی رہتا ہے - جہاں تک اس کی بدولت لوگوں میں خوش گوار تعلقات قائم ہوں اور خود غرضی کی روک تھام ہو اس کے مفید ہونے میں شبہہ نہیں لیکن جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں رائے عامہ کو عمل کا معیار اعلیٰ قرار نہیں دینا چاہئے - اس صفت کا دوسرا لازمی جزو ہمدردی ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں محض ایک جبلت ہے جو انسانوں اور دیگر حیوانات میں مشترک ہے - اس وقت اس کا تعلق دل سے زیادہ جسمانی کیفیت سے ہوتا ہے اور اس میں اور تقلید اور اثر پذیری میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے - ایک چھوٹا بچہ کسی دوسرے بچے کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگتا ہے - ذرا بڑی عمر میں شاید ہر شخص کو دیکھ کر یہ کیفیت پیدا نہ ہو لیکن اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے جذبات سے متاثر ہونا عام اور قدرتی بات ہے - اس ہمدردی کی تعدیل اور توسیع کے لئے رسل (Russel) کے خیال میں دو چیزوں کی ضرورت ہے - ایک تو یہ کہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو کہ انسان علاوہ اپنے قریبی دوستوں اور عزیزوں کے اور انسانوں کے دکھ درد سے بھی متاثر ہو سکے - اس کی تفصیل پہلے کی جا چکی ہے - دوسرے یہ کہ ہمدردی کا جذبہ اس وقت بھی بیدار ہو جب ہم کسی

دکھ یا مصیبت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں بلکہ کسی اور ذریعے سے ہمیں اس کا علم ہو - اس وسعت اور احساس کے پیدا کرنے کے لیے تخیل کی تربیت ہونی چاہیے تاکہ ہمیں افسانوں اور تاریخوں، سرکاری رپورٹوں اور اعداد و شمار میں بھی وہی تصویر دکھائی دے جو واقعات کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر نظر آتی ہے تاکہ ہمارا ہمدردی کا جذبہ صرف اسی وقت مشتعل نہ ہو، جب مثلاً کسی جنگ میں خود ہمارا کوئی عزیز یا دوست زخمی ہو - بلکہ جب کبھی ہمیں معلوم ہو کہ قوموں کی ایک خونریز جنگ میں لاکھوں آدمی مارے گئے ہیں اور زخمی ہوئے ہیں تو ہمارا دل دکھے اور ہم یہ محسوس کریں کہ سب لوگ کسی نہ کسی کے دوست اور عزیز ہوں گے - ہمدردی اپنی پوری وسعت اس وقت حاصل کرتی ہے جب ایک شخص کے دل میں سارے جہاں کا درد جمع ہو جائے - رسل کے نزدیک یہ بات ناممکن نہیں ہے اور وہ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ :—

"اگرچہ سائنس نے ہماری قوتوں میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ ہم دور دراز کے ممالک کے لوگوں کی زندگی پر اثر ڈال سکتے ہیں - لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری ہمدردی میں اتنی وسعت پیدا نہیں ہوئی -" ۱

ایک سائنس داں جو اپنے معمل یا کارخانے میں بیٹھ کر کیمیا کے تجربے کرتا ہے اور کوئی خوفناک بم کا گولہ یا زہریلی گیس ایجاد کرتا ہے تو وہ گویا تمام دنیا کے امن و امان کو

۱- On Education صفحہ ۵۷ -

متزلزل کرتا ہے - ایک بڑا تاجر جو اپنا منافع بڑھانے کے لیے اپنی منڈیوں میں غلے کی فروخت اور بر آمد کو روک دیتا ہے وہ نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کو فاقہ کشی میں مبتلا کرسکتا ہے - اس کا تدارک کرنے کے لیے تعلیم کا فرض یہ ہے کہ طلبہ میں تخیل اور ہمدردی پیدا کرے تاکہ وہ دوسروں کی حالت کو صحیح طریقے پر محسوس کریں اور اس ظلم اور بےانصافی کا خاتمہ ہو جو زیادہ تر عدم احساس کی وجہ سے رائج ہے - یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ذکی الحس ہونے سے محض یہی فائدہ نہیں کہ انسان دوسروں کے دکھ میں شریک ہو اور عمرانی فرائض کو ادا کرے بلکہ تہذیب نفس اور ذوق جمال کی تربیت میں بھی اس کو بڑا دخل ہے - خوبصورت چیزوں سے وہی لوگ محظوظ ہو سکتے ہیں جن میں احساس کی نزاکت ہو، جو لطیف نکتوں کو سمجھ سکیں، اور رنگ و بو اور شکل کے باریک فرقوں میں امتیاز کرسکیں جن کے دل میں مصور کی رنگ آمیزی، شاعر کی جادو بیانی، مغنی کی نغمہ طرازی مضراب بن کر ذوق حسن کے تاروں کو چھیڑ دے - یہ ذوق اس شخص میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک ایک چابک دست مصور کی تصویر، اور رنگ کے چند دھبوں میں جو کاغذ پر پڑ جائیں کوئی فرق نہ ہو، جو طبلے کی تھاپ اور ہتھوڑے کی چوٹ کو ایک ہی چیز سمجھے؟ بے شک اس حسن شناسی کے لیے فنی امور سے واقفیت ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ احساس کی ذکاوت اور جذبات کی لطافت درکار ہے -

رسل نے ذہانت یا عقل کو انسانی سیرت کی چوتھی

لازمی صفت قرار دیا ہے - عقل میں وہ دو چیزیں شامل کرتا ہے - ایک تو وہ علم جو ہم حاصل کر چکے ہیں جو گویا ہماری ملکیت بن گیا ہے - دوسرے وہ قابل قدر صلاحیت جس کے ذریعے سے ہم نیا علم حاصل کر سکتے ہیں - ان دونوں میں بہت قریبی تعلق ہے - کیونکہ جلد سیکھنے کی صلاحیت جو "ذہانت" کہلاتی ہے ایک حد تک ہمارے سابق علم پر منحصر ہے - جاہل آدمی کو کوئی نئی بات سکھانی بہت مشکل ہے - وہ آسانی سے اپنی ذہنی عادتوں اور اپنے خیالات کو تبدیل نہیں کرتا - اس میں عقیدہ تنقید اور تجسس کی جگہ لے لیتا ہے اور وہ نئی باتوں کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیتا ہے جو سائنس کی ترقی کی بدولت عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہیں - بر خلاف اس کے جس شخص کی تعلیم صحیح اصولوں پر مبنی ہوتی ہے، یعنی وہ جو علم حاصل کرتا ہے وہ اس کی ذہنی تربیت میں معین ہوتا ہے اور اس میں مزید علم حاصل کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے، اس کی ذہنی نشو و نما ہمیشہ جاری رہتی ہے - مفید اور مکمل زندگی بسر کرنے کے لئے یہ قابلیت اس درجہ اہم اور لازم ہے کہ بعض تعلیمی مفکرین نے اس کو تعلیم کا منتہا اور اخلاق کی بنیاد قرار دیا ہے - لہذا انسانی سیرت کی تشکیل میں عقل کا فرض اولین یہ ہے کہ ترقی، نشو و نما، اجتہاد، نئی باتوں کو سیکھنے کی صلاحیت برقرار رکھے، اور فرد کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے ارتقاء پذیر ماحول میں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے - برگسان (Bergson) وغیرہ نے ارتقاے تخلیقی کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے لحاظ سے بھی حیات انسانی میں عقل کا مفہوم

وہی ہے جس کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے۔

عقل کی جبلی بنیاد تجسس ہے جو انسانی طبیعت کے لوازمات میں سے ہے۔ حیوانوں میں اور چھوٹے بچوں میں اس کا اظہار بہت افراط اور شدت سے ہوتا ہے اور وہ ان کے اکثر اعمال و افعال کی محرک ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے موجودہ تعلیمی اور معاشرتی حالات ایسے ہیں کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے عموماً اس کا شوق تجسس کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص عمر کو پہنچ کر، جو مختلف افراد میں مختلف ہوتی ہے، اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ وہ نئی چیزوں اور نئے خیالات سے دلچسپی پیدا کر سکے۔ اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح سخت اور بے لوچ ہو جاتا ہے۔ اس میں یہ عادت جو سن کہولت کی مخصوص صفت ہے، پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کی باگ "پرانے زمانے" کی طرف موڑ دیتا ہے، اسی کی تعریف کیا کرتا ہے اور نئی تحقیقات، نئے نظریوں بلکہ نئے لوگوں سے بھی گھبراتا ہے اور ان سے کچھ سیکھنے کی خواہش نہیں کرتا۔ جب جذبۂ تجسس بالکل مردہ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ذہانت کا بحیثیت ایک قوت محرکہ کے خاتمہ ہو گیا ہے اور انسان میں نشو و نما کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جیسا رسل نے بتایا ہے، ممکن ہے تجسس کی شدت اور ہمہ گیری میں کمی آجائے لیکن اس کی نوعیت بہتر ہو جائے۔ یعنی ایک پختہ عمر کے انسان کو بچوں کی طرح جزئیات کے متعلق تجسس نہ ہو بلکہ کلیات سے دلچسپی پیدا ہو جائے اور وہ صرف ایسے

امور اور مسائل کی تحقیق و تفتیش کرے جو علمی اہمیت
رکھتے ہوں - تجسس کا یہ ارتقاء فطرت انسانی کے مقتضا کے
عین مطابق ہے اور ہمیں اس میں مدد دینا چاہیے تاکہ
تجسس کی قوت ایسے کاموں میں صرف ہو جن کی اہمیت
مستقل اور دائرہ وسیع ہے - لیکن اس ارتقا کے لیے شرط یہ
ہے کہ طالبہ میں قوت مشاہدہ ' محنت اور مستقل مزاجی
کی عادتیں پیدا کی جائیں اور ان کا یہ عقیدہ ہو کہ علم کی
تحصیل کی کوئی حد نہیں - ورنہ ان عادتوں کے بغیر تجسس
کا اظہار نہایت ناقص اور بےکار طریقوں پر ہوگا یعنی اِدھر اُدھر
کی فضول باتیں سننے کا شوق ' دوسروں کے بھید معلوم کرنے کی
خواہش ' غیر متعلق چیزوں کا کھوج جن سے انہیں کوئی
مستقل فائدہ نہیں ہو سکتا - عقلی تربیت کا ایک اور اہم
جزو رسل کے نزدیک وسعت نظر ہے جس کی بدولت ہم نئے
حقائق اور نئی تجاویز پر غور کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں اور
اپنے پرانے اور پسندیدہ عقائد پر محض اسی وجہ سے اصرار اور
ضد نہیں کرتے کہ ہم انہیں عرصے سے مانتے چلے آئے ہیں - اس
وسعت نظر اور ذہنی دیانت کے لیے بھی جرأت اتنی ہی
ضروری ہے جس قدر جسمانی بہادری کے لیے کیونکہ اس
کے بغیر ہم معاشرے کے رسم و رواج اور خیالات کی طرف سے
بے پروا ہو کر اپنی ذاتی رائے اور عقیدے پر عمل نہیں کر سکتے -
کمزوروں اور سہولت پسندوں کے لیے سیدھا راستہ یہی ہے کہ وہ
آنکھیں بند کر کے انہیں خیالات اور عقائد کی پابندی کریں جو
ان کے گرد و پیش عام طور پر رائج ہیں لیکن جن لوگوں میں
اخلاقی جرأت اور عزت نفس ہوتی ہے وہ اپنی عقل کی مدد

سے دنیا کے مسائل اور معاملات کے متعلق دیانت‌داری اور آزادی کے ساتھ راے قائم کرتے ھیں جو عوام کی راے سے مختلف ھوتی ھے - ان کو ھر طرح کی مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ھے لیکن وہ اپنی آزادی کی خاطر ان سب کو خوشی سے برداشت کرتے ھیں - بقول رسل (Russel) کے :—

"ذھنی آزادی کی زندگی اس قدر آرام‌دہ ' مرنجاں مرنج اور پر امن نہیں ھو سکتی جتنی وہ زندگی جو مروجہ عقائد کی پابندی کے حصار میں محفوظ ھو - صرف عقیدے ھی کی پناہ میں انسان کو وہ آرام و اطمینان نصیب ھوتا ھے جو کسی شخص کو ایک روشن آتش‌دان کے پاس بیٹھ کر حاصل ھوتا ھے جب کمرے کے باھر سردی کا زور ھو -"

اس بحث میں رسل (Russel) نے یہ مسئلہ بھی چھیڑا ھے کہ انفرادی زندگی کو کس حد تک اجتماعی زندگی کی پابندیوں سے آزاد ھونا چاھیے ھم اس مسئلے پر اپنی راے کا اظہار کر چکے ھیں اس لیے یہاں اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں - رسل (Russel) نے اس کے متعلق یہ راے ظاھر کی ھے کہ عام طور پر ھر شخص کو دوسروں کے ساتھ مل جل کر اور ان کی رضاجوئی کا خیال رکھ کر کام کرنا چاھیے ورنہ لوگوں کے برتاؤ اور ادب معاشرت میں شائستگی پیدا نہ ھوگی اور جماعتوں کا قیام بہت مشکل ھو جائے گا - اس طرح دوسروں کے جذبات سے متاثر ھونا اور ان کو قبول کرنا مفید ھے بشرطیکہ جذبات کسی عقلمند شخص کی طرف سے کسی کم عقل شخص کی طرف منتقل ھوں - لیکن جہاں ایک بڑا دائرۂ عمل ایسا ھے جس میں اجتماعی اثرات کی حکمرانی ھے وہاں ھر شخص کے لیے

ایک چھوٹا سا دائرہ ایسا بھی ہونا چاہیے جہاں اجتماعی اثرات کو بہت کم دخل ہو یا نہ ہو، اور یہ اس کی مخصوص قابلیت کا میدان ہے۔ یعنی جس خاص علم یا فن یا شعبۂ عمل میں کسی شخص کو خاص مہارت ہو وہاں اس کو ذاتی غور و فکر اور آزادی رائے سے کام لینا چاہیے، اور اگر اس دائرے کے اندر کوئی ایسا معاملہ یا مسئلہ ہو جس میں اس کی رائے، رائے عامہ کی مخالف ہو، تو اس کو جرأت کے ساتھ کھلم کھلا ظاہر کر دینا چاہیے۔ باقی مسائل میں، بالخصوص علمی اور فنی مسائل میں ہمیں ماہرین خصوصی کی رہنمائی قبول کرنی چاہیے۔

ان چاروں صفات کے مفہوم اور شرائط سے بحث کرنے کے بعد رسل اس معاشرے کا ایک تخیلی نقشہ کھینچتا ہے جو اس قسم کی تعلیم پا کر پیدا ہوگا اور جس کے افراد میں کسی نہ کسی حد تک یہ صفات پائی جائیں گی:—

"موجودہ معاشرے سے کس قدر مختلف ہوگی انسانوں کی وہ جماعت جس کے ہر مرد اور عورت میں قوت، جرأت، ذکاوت احساس اور ذہانت کی صفات اس حد تک موجود ہوں گی جس حد تک تعلیم ان کو پیدا کر سکتی ہے! بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جو خوشی سے محروم ہوں۔ اس زمانے میں رنج اور بے اطمینانی کے سب سے بڑے اسباب بیماری، مفلسی اور صنفی زندگی کی ناقابل اطمینان حالات ہیں۔ یہ سب چیزیں مقابلتاً بہت کم ہو جائیں گی۔ صحت اور تندرستی بہت عام ہو سکتی ہے۔ بڑھاپے کی آمد کو

مدت تک ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد بڑی مفلسی کا قائم رہنا محض لوگوں کی متعدد حماقت کا ثبوت ہے۔ احساس کی بیداری سے لوگوں میں عام افلاس کو دور کرنے کی خواہش پیدا ہوگی، عقل ان کو راستہ دکھائے گی اور جرأت انہیں اس راستے پر ثابت قدم رکھے گی۔ کم ہمت لوگ بالعموم تکلیف برداشت کر لیتے ہیں لیکن اس کو رفع کرنے کے لئے کوئی غیر معمولی کوشش کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے........ بے خوف عورتوں کی ایک نسل تمام دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے کیونکہ ان کی اولاد بڑی جری اور بے خوف ہوگی اور ان کی فطرت مسخ نہ ہونے پائے گی یہ لوگ راست باز، صاف گو، فراخ دل، محبت شعار اور آزاد ہوں گے۔ اُن کی جد و جہد ظالم اور مصائب کے اس بوجھ کو اُتار کر پھینک دے گی جس کو ہم محض اپنی سستی یا کم ہمتی یا بے رحمی یا حماقت کی وجہ سے برداشت کرتے ہیں۔ تعلیم کی خرابی ہی نے ہم میں یہ بری عادتیں پیدا کی ہیں اور اسی کی اصلاح کر کے ہم اچھی عادتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ تعلیم نئی زندگی کی کنجی ہے۔"[1]

مکمل انسانی سیرت کے متعلق ان دونوں فاضل مفکروں کے خیالات کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بڑی حد

۱— On Education صفحہ ٦٥-٦٦۔

تک اتفاق رائے ہے اور اگرچہ دونوں کے خیالات کی فلسفیانہ بنیاد الگ الگ ہے لیکن دونوں کو اخلاقی تربیت اور سیرت کے اس مفہوم سے اختلاف ہے جو صدیوں تک نہ صرف عملاً رائج رہا ہے بلکہ علمی نظریوں پر بھی مسلط رہا ہے - دونوں عقل و علم اور اخلاق کے قریبی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں اور اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ عقل اور اخلاقی سیرت سے کوئی لازمی تعلق نہیں - فلسفۂ تعلیم اور تنظیم مدارس کے لیے اس جدید نقطۂ نظر کی بہت بڑی اہمیت ہے - کیونکہ ' جیسا ہم بتا چکے ہیں ' مدرسوں میں عام طور پر علمی مشاغل اور اخلاقی تربیت میں حد فاصل قائم ہو گئی ہے - ان کی درسی زندگی اس طرح مرتب نہیں کی گئی کہ اس میں طلبہ کے کردار پر بالارادہ اثر ڈالا جائے اور ان کی اخلاقی سیرت مستحکم کرنے کا اہتمام ہو - یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ عملی طور پر تو معلم اپنا تمام وقت اور توجہ درسی علوم کے سکھانے میں صرف کرتے ہیں اور زبان سے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ " اخلاق " یا " نیکی " کے سوا اور تمام چیزیں ہیچ ہیں - جدید نظریۂ تعلیم نے عقل اور اخلاق کے درمیان ایک لازمی رشتہ قائم کر دیا ہے - عقل اور ذہانت کے متعلق ان دونوں مفکرین کے نقطۂ نظر میں جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اتنا فرق ضرور ہے کہ ڈیوئی (Dewey) اس کے عملی استعمال پر زیادہ زور دیتا ہے اور اس طرح طلبہ میں قوت فیصلہ کی تربیت کرنا چاہتا ہے جو تحصیل مقاصد میں معاملہ فہمی میں ' مشکلات سے عہدہ برآ ہونے میں مدد دے - رسل (Russel) کو زیادہ فکر یہ ہے کہ طلبہ کی ایسی ذہنی تربیت

کی جائے جو ان میں جذبۂ تجسس کے ساتھ وسعت نظر پیدا
کرے، وہ نئے حقائق اور نئے نظریوں پر غور کرنے کے لیے تیار
رہیں اور ان میں عقلی نشو و نما کی صلاحیت باقی رہے ۔
اس طرح دونوں کے نزدیک صلاحیت عمل شخصیت کی تکمیل
کے لیے ضروری ہے ۔ ڈیوئی اس کو قوت یا کارکردگی کے نام سے
موسوم کرتا ہے، رسل اس کو قوت حیات کہتا ہے ۔ ڈیوئی کے
نزدیک قوت اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان اپنے
مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور جب تک اس میں
استقلال، حوصلہ اور محنت کی صفات نہ ہوں گی، جو
قوت کے مفہوم کا جزو ہیں، وہ اپنے جذبات اور خیالات کو عمل
میں نہ لا سکے گا ۔ رسل بھی جسمانی قوت اور صحت کو لازم
سمجھتا ہے لیکن وہ اس سے یہ کام لینا چاہتا ہے کہ طلبہ
میں مسرت حیات کا احساس بیدار ہو اور وہ اپنی خودی کی
قید سے نکل کر دنیا کی خوبصورت چیزوں اور مظاہر میں
دلچسپی لینا سیکھیں اور ان جسمانی اور دماغی خرابیوں سے
محفوظ رہیں جو کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ۔ مثلاً
ضد، بدمزاجی، افسردگی، بیماری وغیرہ ۔ رسل جرأت کو
ایک مستقل اور علاحدہ صفت قرار دیتا ہے کیونکہ وہ محسوس
کرتا ہے کہ دنیا میں بیشتر خرابیاں خوف کا نتیجہ
ہیں اور جب تک لوگوں کا جسمانی اور ذہنی خوف رفع
نہ ہوگا نہ انھیں اپنی ذاتی زندگی میں کامیابی نصیب ہوگی،
نہ وہ اپنے معاشرتی فرائض کو عمدگی کے ساتھ ادا کر سکیں گے ۔
ڈیوئی نے بھی جرأت کو قوت عمل کا لازمہ قرار دیا ہے اور اپنی
تصانیف میں جا بجا اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس

کی تربیت پر زور دیا ہے۔ اس طرح دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نوجوانوں میں جذبات کی صحیح تربیت نہایت ضروری ہے تاکہ ان میں ہمدردی اور دوسروں کی امداد کرنے کی خواہش پیدا ہو کہ اس کے بغیر اجتماعی زندگی کا قیام ناممکن ہے ہم دونوں موجودہ زمانے کے حالات اور تعلقات کا خیال کرتے ہوئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمدردی کے اس جذبے کو جس قدر ممکن ہو وسیع کیا جائے تاکہ اس کے دائرے میں علاوہ ان لوگوں کے جن سے ہمارا براہ راست تعلق ہے وہ لوگ بھی شامل ہو جائیں جن پر کسی نہ کسی طرح بالواسطہ ہمارے افعال و اعمال کا اثر پڑتا ہے۔ اور سائنس اور صنعت و حرفت کے اس دور میں کون شخص ایسا ہے جس کی زندگی دنیا کے اور سب لوگوں کے ساتھ بےشمار رشتوں میں مربوط نہ ہو؟

انسانی سیرت کے اس نصب العین کو جس کے خد و خال ان ماہرین تعلیم نے دکھائے ہیں، ہم اپنے ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ کرتے ہوئے کہاں تک قبول کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان صفات کا تعلق کسی خاص ملک یا قوم سے نہیں بلکہ یہ ہر انسان اور ہر جماعت کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ہم اپنے سیاسی اور معاشری حالات کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری قوم کو خاص طور پر یہ صفات درکار ہیں۔ اور ہماری تہذیب اور فلسفۂ زندگی میں، جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل ہے، ان کی اہمیت مسلم ہے۔ البتہ ان کی ترتیب و تناسب اور اضافی قدر و قیمت ہمارے یہاں کسی قدر مختلف ہوگی۔

ہم سب سے پہلے جذبات کی تربیت کو لیتے ہیں جس سے ہمارا یہ منشا ہے کہ طالب علم میں ایسا اجتماعی احساس پیدا کیا جائے کہ وہ معاشرتی اور تمدنی حالات سے مناسب طریقے پر متاثر ہو۔ یعنی اُس میں وسیع ترین معنی میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ آج کل جو سیاسی حالات ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے اس جذبے کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہماری بیشتر سیاسی مشکلات اور معاشری خرابیاں اسی اجتماعی احساس کی کمزوری کی وجہ سے ہیں۔ نہ مدرسے کی تعلیم ہمدردی کے اِس جذبے کی تربیت کرتی ہے، نہ خانگی اور معاشرتی اثرات اِس کی نشو و نما میں مدد دیتے ہیں۔ اِس ہمدردی کو وسیع کرنے اور عملی جامہ پہنانے کے ایسے تخیل کی، یعنی علم اور جذبات میں ربط پیدا کرنے کی، ضرورت ہے لیکن یہ تخیل ہی مفقود ہے۔ مدرسے کے نصاب میں اجتماعی مسائل اور مضامین کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھی۔ اس لیے طلبہ کو اپنے تہذیب، تمدن اور معاشری ضروریات سے وہ واقفیت جو ہمدردی کی بنیاد ہے نہیں ہوتی، یا ہوتی بھی ہے تو اِس قدر سطحی اور سرسری کہ اُن کے دل و دماغ پر اِس کا کوئی گہرا یا دیرپا اثر نہیں پڑتا اور اُن کی قوت متخیلہ اِس کو قوی احساس اور جذبات میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ لہٰذا جہاں تک اخلاقی تربیت کا تعلق ہے ہماری تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ طلبہ میں اِس رشتے کا احساس پیدا کرے جو فرد اور جماعت کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور مختلف

خیالات اور مقاصد رکھنے والے گروہوں کو ایک متحدہ معاشرے یا قوم میں تبدیل کرتا ہے ۔ لیکن یہ احساس محض انفعالی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ جذبات کے جوش اور حرارت کی بدولت اس میں حرکت اور قوت عمل پیدا ہو جانی چاہیے ۔ ہماری مذہبی تعلیم اور ہمارے تہذیب و تمدن میں اس احساس پر انتہائی زور دیا گیا ہے اور قدیم ہندوستانی معاشرے کی بنیاد سراسر اسی یکجہتی اور باہمی وابستگی احساس پر قائم تھی جس کا کچھ اندازہ اب بھی کہیں کہیں دیہاتی کی زندگی شیرازہ بندی کو دیکھ کر ہو سکتا ہے ۔

اب رہا علم، تو اس کو ہمارے مذاہب نے جو رتبہ دیا ہے وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم صدیوں تک مذہبی گروہوں کا مخصوص مشغلہ رہ چکی ہے یہاں تک کہ اس پر مذہبی رنگ غالب آگیا، اور اس کے مقاصد اس کی حدود، اس کا نصاب یہ سب چیزیں مذہبی عقائد کی پابند ہو گئیں ۔ موجودہ زمانے میں ہمارے ملک کی علمی اور تعلیمی ترقی کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے اور ہمارا علمی معیار بہت گرا ہوا ہے ۔ اس امر کو تسلیم کرنے میں ہمیں باک نہیں ہونا چاہیے خواہ اس کے وجوہ ہم کچھ قرار دیں ۔ لہذا یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ علم یا ذہنی تربیت جس کو رسل ذہانت کہتا ہے ہمارے لیے بیحد ضروری ہے ۔ سائنس اور صنعت و حرفت کی بےاندازہ ترقی نے زندگی کے نظام کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے کہ اس میں کامیابی کے ساتھ حصہ لینے کے لیے ہر فرد کی ذہنی تربیت لازم ہو گئی ہے ۔ یوں تو انسان معاشرتی

ارتقاء کی ہر منزل میں ذہنی تربیت کا محتاج رہا ہے لیکن قدیم زمانے میں وہ اپنے ماحول سے براہ راست بہت کچھ ذہنی اور عملی تربیت حاصل کر لیتا تھا اور یہ اس کو بہت سے کاموں میں مدد دیتی تھی - لیکن اب اس ضمنی تعلیم پر قناعت کرنا ممکن نہیں بلکہ تعلیمی اداروں کا ایک وسیع اور باقاعدہ نظام مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے ہر شہری کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے عام مدنی اور شخصی فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر سکے - ہمیں ہر ہر قدم پر ایسے مسائل پیش آتے ہیں جن کا کوئی مسلمہ حل موجود نہیں - ہر روز ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جن میں مروجہ طریقے کام نہیں دیتے - بلکہ تربیت یافتہ عقل اور قوت فیصلہ کی ضرورت پڑتی ہے - کچھ زمانے کے بعد یہ بات اور زیادہ عام ہو جائے گی - ہر شخص کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ اپنی راے دہندگی کے حق کو کس طرح استعمال کرے، کس شخص یا کس پارٹی کے حق میں اپنا فیصلہ دے - اس کو یہ جاننے کی ضرورت ہو گی کہ ان پارٹیوں کے کیا کیا اصول ہیں اور ان میں کس بنا پر اختلافات ہیں، اور اگر ان میں سے کسی کی تجاویز کو عمل میں لایا جائے تو اس سے ملک کی حالت پر کیا اثر پڑے گا - اس سے یہ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو ان باتوں کا مفصل علم ہونا چاہیے یعنی ہر شخص کے لیے سیاست داں بننا ضروری ہے - لیکن یہ امر بدیہی ہے کہ عام سیاسی مسائل سے تھوڑی بہت واقفیت ہر شخص کے لیے لازمی ہے تاکہ وہ ان کے متعلق معقول راے دے سکے اور ایک جمہوری ریاست میں کوئی شہری اس فرض

کی ادائگی سے پہلوتہی نہیں کر سکتا - اسی طرح زندگی کے کسی شعبے میں بھی ذہنی تربیت کے بغیر کام نہیں چل سکتا - مثلاً ہر نوجوان کو پیشے کے انتخاب کے مسئلے سے سابقہ پڑتا ہے - اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ طبقے کو جو الجھنیں اس مسئلے میں پیش آتی ہیں انہیں دور کریں تو ہمیں طلبہ کی عقلی تربیت میں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ وہ ملک کے اقتصادی امکانات اور وسائل معاش سے واقف ہوں تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ذاتی مفاد اور قومی فلاح کے لیے مناسب طریقے پر استعمال کر سکیں - اسی طرح ہمیں جو بےشمار اصلاحی مسائل درپیش ہیں ان سب کو خاطر خواہ حل کرنے کے لیے علوم کی اشاعت اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے - بیماری کا انسداد ' صفائی اور حفظان صحت کا انتظام ' افلاس کا رفع کرنا ' جماعتی اختلافات اور فرقہ بندیوں کی اصلاح ' یہ سب کام اسی وقت انجام پاسکتے ہیں جب شہریوں کی معقول ذہنی تربیت کے وسائل مہیا کیے جائیں - اسی کی بدولت ان میں ایسی قوت اجتہاد پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ ترقی کی راہیں نکالیں اور جس طرح دوسری قوموں نے علم کے ذریعے فطرت کی قوتوں کو تسخیر کر کے بےاندازہ قوت اور عظمت حاصل کی ہے اسی طرح وہ بھی سائنس کی تحقیقات اور ایجادات کی مدد سے اور اپنے ملک کے قدرتی وسائل کو کام میں لاکر ' اپنی قومی اور اجتماعی حیثیت کو بڑھائیں اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں جگہ پائیں - خواہ ہم انسانی سیرت کی تربیت کے متعلق کوئی نظریہ بھی اختیار کریں ہمیں عقلی اور ذہنی تربیت کی اہمیت تسلیم کیے بغیر

چارہ نہیں - اب ہم اپنے مدرسوں کی حالت پر نظر ڈالیں تو بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے معلموں کو عقلی اور عملی تربیت کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور وہ اپنی ساری کوشش اسی میں صرف کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اور ضروری چیزوں سے غافل ہو گئے ہیں - لیکن جیسا ہم کتاب کے دوسرے حصے میں بتا چکے ہیں انہوں نے نہ عقلی تربیت کا مفہوم صحیح سمجھا ہے نہ اس کے لیے مناسب ذرائع اختیار کیے ہیں اور موجودہ صورت حال کی اصلاح ان طریقوں پر ہونی ضروری ہے جن کی تفصیل ہم کر چکے ہیں -

تیسری صفت یعنی قوت عمل میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہیں اور انسان کو اپنے ارادوں اور مقاصد کو پورا کرنے میں مدد دیتی ہیں - مغربی قوموں کے مقابلے میں ہندوستانیوں میں قوت عمل کی بہت کمی ہے، خواہ ہم قومی سیرت پر غور کریں خواہ افراد کی سیرت پر - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو فلسفۂ زندگی رائج رہا ہے وہ فکر اور سکون، عزلت اور گوشہ‌نشینی کو زندگی کے جد و جہد اور کشمکش میں شریک ہونے پر ترجیح دیتا تھا - ہندو فلسفے میں ترک دنیا کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے - مسلمانوں میں بھی مذہباً تو نہیں لیکن ملکی حالات اور معاشرتی اختلاط کے اثر سے قناعت اور تقدیر پرستی بہت بڑھ گئی ہے - ان چیزوں کی وجہ سے ہندوستانیوں میں بعض قابل قدر صفات بھی پیدا ہوئیں اور وہ ایک حد تک اس مہلک مقابلے اور رقابت سے محفوظ رہے جو گزشتہ سو برس سے نہایت شدت کے ساتھ مغربی

تہذیب و تمدن پر مسلط ہے - لیکن ان امور میں جن میں فعالی حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے ہندوستانی عموماً ناکام رہے اور مجموعی طور پر یہ افسوسناک نتیجہ نکلا کہ چین اور بعض اور ایشیائی ممالک کی طرح ہمارا ملک بھی ترقی کے دور میں مغربی ملکوں سے پیچھے رہ گیا - تعلیم کا فرض ہے کہ وہ قومی سیرت کی اس کمزوری کی اصلاح کرے اور ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے طلبہ میں ہمت، استقلال، مستعدی اور محنت کی عادتیں نشو و نما پائیں تاکہ وہ دنیا کی نظروں میں اپنی شخصی عزت اور قومی وقار دونوں کو قائم رکھ سکیں -

جرأت کو خواہ ہم ڈیوئی کی طرح قوت عمل کا جزو قرار دیں یا رسل کی طرح ایک مستقل اخلاقی قدر مانیں بہر صورت اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے - شخصی اور قومی سیرت کی تکمیل کے لیے زندگی کے ہر پہلو میں جرأت کی ضرورت ہے - یعنی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی جرأت کی تربیت ہماری تعلیم کا ایک لازمی جزو ہونا چاہیے - جسمانی جرأت گو بجائے خود اعلیٰ ترین جرأت نہیں لیکن اس کا ایک لازمہ ضرور ہے کیونکہ جو شخص ہر قسم کی جسمانی تکلیف سے ڈرتا ہے وہ ہرگز ایسا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا، جس میں دوسروں کی ناراضگی کا اندیشہ ہو، ہرگز ایسے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا جو رائے عامہ کے خلاف ہوں - ہندوستانی طلبہ میں مدرسے کے مشاغل، معاشری زندگی کی تنظیم، اور کھیلوں اور ورزشوں کے ذریعے جسمانی تکالیف برداشت کرنے کی عادت پیدا کرنی چاہیے اور انہیں ایسے کٹھن اور مشکل کاموں میں لگانا چاہیے جن سے ان کے

حوصلے اور ہمت میں اضافہ ہو - قدیم سپارٹا کے مدبرین، انگریز فلسفی جان لاک اور مشرق کے اکثر مفکرین جسم کو مضبوط کرنے اور اس کو قابو میں لانے کے لیے جو ریاضتیں تجویز کرتے ہیں وہ یقیناً ایک حد تک ضروری ہیں - لیکن اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ جسمانی آسائش اور آرام کی خواہش کو مارنا یا دبانا چاہیے - یہ خیال موجودہ نفسیات اور اخلاقیات دونوں کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے - لیکن ہم راحت جسمانی کو مقصود بالذات نہیں بنانا چاہتے کہ انسان بالکل نفس پرست اور آرام طلب ہو جائے، سوائے اپنے عیش کے، دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہ رکھے یا ان تمام باتوں سے احتراز کرے جن میں کسی قسم کی جسمانی تکلیف کا اندیشہ ہو - ہم جسم کو روح کا آلہ بنانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان مقاصد کی تحصیل میں معین ہو جنہیں ہم عقلاً اور اخلاقاً مناسب سمجھتے ہیں - اسی وجہ سے آج کل ماہرین تعلیم ایسی جسمانی تربیت پر زور دے رہے ہیں جس کی بدولت بچوں اور نوجوانوں کو اپنے قوائے جسمانی پر پورا قابو حاصل ہو جائے اور ان میں جھجک اور بزدلی قائم نہ رہے - ہمارے خیال میں اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ تعلیم کا مطمح نظر بالکل تبدیل کر دیا جائے اور وہ بجائے "سفید پوش ٹولا" پیدا کرنے کے، جو کسی قسم کی محنت سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، ایسے مستعد مزدور یعنی آمادۂ عمل افراد پیدا کرے جو کمر ہمت باندھ کر ہر قسم کے مفید اور دولت آفرین کام کرنے کے لیے تیار رہیں -

اخلاقی اور ذہنی جرأت سے ہماری مراد ہے اپنے اصولوں اور

عقیدوں پر پختگی کے ساتھ قائم رہنا، ان کو دوسروں کی
خوشنودی کی خاطر تبدیل نہ کرنا، جب ضرورت ہو اپنی رائے
بےدھڑک ظاہر کر دینا، اور حق گوئی کی خاطر ہر قسم کی
سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا۔ جب تک ہم اس بات
کے لیے آمادہ نہ ہوں گے کہ بقول شیکسپیئر :

"سچی بات کو جو ہمارے دل کے اندر ہے ڈنکے کی چوٹ
کہہ دیں" نہ معاشرے کے خیالات کی اصلاح ہوگی نہ وہ قدامت
پرستی کے پنجے سے چھوٹے گا۔ ہماری قوم میں بدقسمتی سے
اس ذہنی جرأت کی بہت کمی ہے اور ایسے لوگ بہت تھوڑے
ہیں جنہیں زبان خلق کا خوف نہ ہو اور اپنے سچے خیالات اور
عقائد کو ظاہر کرنے سے نہ جھجھکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت
سی معاشری اور اخلاقی خرابیاں جن کو لوگ اپنے دل میں
برا سمجھتے ہیں بدستور قائم ہیں۔ حال میں زیادہ تر سیاسی
اثرات کی وجہ سے لوگوں نے پہلے کی نسبت زیادہ دلیری کے ساتھ ان
خرابیوں کے خلاف جنگ شروع کی ہے۔ لیکن محض اتنی بات
کافی نہیں۔ جب تک ہمارے روزمرہ کے تعلقات اور کار و بار میں
اس روش کا اظہار نہ ہوگا اور لوگ آزادی کے ساتھ تنقید کرنا
اور خندہ پیشانی سے اس کو برداشت کرنا نہ سیکھیں گے ہم
یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذہنی یا اخلاقی جرأت ہماری سیرت کا
جزو ہو گئی ہے۔ ہماری تہذیب کی قدامت کی بدولت ہمارے
یہاں رسوم و روایات کا بار اس قدر زیادہ ہوگیا ہے کہ اکثر لوگوں
کی زندگی، قول اور فعل دونوں کے اعتبار سے، محض رسمی
اور تقلیدی ہو کر رہ گئی ہے اور وہ کہیں بھی اس آزادی
کا اظہار نہیں کرتے جو فطرت انسانی کا سب سے قیمتی عطیہ ہے۔

سیاست، معاشرت، اقتصاد، مذہب غرض ہر شعبۂ زندگی میں ارباب غرض جن کے ہاتھ میں عوام کی باگ ہے یہی چاہتے ہیں ان میں غور و فکر کی عادت نہ پیدا ہو اور وہ آنکھیں بند کیے ہوئے مقررہ راستوں پر چلتے رہیں - تعلیم کا انقلابی فرض یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو ان بزرگوں کے احکام کی تنقید کرنا سکھائے اور ان میں اتنی ہمت پیدا کرے کہ وہ خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنی عقل کے فتوے پر عمل کریں -

اخلاقی جرأت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کا تعلق دوسروں سے نہیں بلکہ خود ہماری ذات سے ہے اور جس کی ضرورت غالباً اُس حالت میں بھی ہوتی اگر بجائے معاشری زندگی بسر کرنے کے بالکل تنہائی کی زندگی بسر کرتے - اکثر لوگوں میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرسکیں - وہ جانتے ہیں کہ ان کی فلاں بات غلط ہے یا فلاں کام خلاف عقل و انصاف ہے لیکن وہ گویا اپنے ہی نفس سے اس درجہ مرعوب اور خوف زدہ ہوتے ہیں کہ انہیں یہ ہمت نہیں پڑتی کہ اپنی غلطی کو صاف صاف تسلیم کریں - ایسے لوگ نفس کے بندے بن کر رہ جاتے ہیں وہ اس چیز کو وضعداری سمجھتے ہیں کہ جو بات ایک دفعہ کہ بیٹھیں اس پر ازلی قانون کی طرح اڑے رہیں کیونکہ ان کے خیال میں رائے یا عمل کی تبدیلی سبکی اور ذلت کا باعث ہے - اس میں شک نہیں کہ دوسروں کے سامنے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم فلاں مسئلے میں غلطی پر تھے یا ہم سے فلاں معاملے میں خطا ہوئی - لیکن ہم ہرگز ایسے شخص کی سیرت کا احترام نہیں کر سکتے جو اپنی عزت کو بلکہ عزت کے ایک غلط تصور

کو صداقت پر ترجیح دے ۔ دنیا میں کوئی شخص اتنا بلند مرتبہ نہیں کہ اس کے لیے صداقت کے سامنے سر جھکانا ذلت کا باعث ہو ۔ دنیاوی وجاہت اور مرتبے کے لحاظ سے نہیں بلکہ سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے جو بزرگ‌ترین ہستیاں گزری ہیں ان سب میں یہ صفت مشترک تھی کہ انھوں نے کبھی اپنی ذاتی عزت کو صداقت سے بڑھ کر نہیں جانا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں کیا ۔ جمہوریت اور انفرادی آزادی کے زمانے میں کس شخص کو خاص کر ان لوگوں کو جو اپنے ہم‌جنسوں کی سرکردگی اور رہنمائی کرتے ہیں اس قسم کی اخلاقی جرأت کے بغیر چارہ نہیں ۔ کسی پالیسی یا پروگرام کو وقت اور حالات کے مقتضا کے مطابق چلانے کے لیے دماغی قابلیت اور اخلاقی جرأت دونوں درکار ہیں ۔ اگر کوئی مدبر یا سیاسی لیڈر اس قدر ذہین اور دانشمند ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات کو دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسے کیا طریقہ عمل اختیار کرنا چاہیے لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ دوسروں کی رائے یا اپنی سابقہ رائے کی مخالفت کر سکے تو ملک کو اس کی دماغی قابلیت سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ؟ اسی طرح اخلاقی جرأت بھی بجائے خود کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی جب تک انسان میں اتنی قابلیت نہ ہو کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کر کے فیصلہ کرسکے کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے ۔ لہذا تعلیم کا فرض یہ ہے کہ جہاں طلبہ میں زمانہ شناسی کا ملکہ پیدا کرے اور انہیں آزادی کے ساتھ اپنے عقائد کا اظہار اور ان پر عمل کرنا سکھائے وہاں صداقت کے سامنے سر جھکانے کا

سبق بھی دے تاکہ وہ بے تامل اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیا کریں - اس سبق کو اس خوبی اور استحکام کے ساتھ عملی اور نظری طور پر ان کے ذہن نشین کرنا چاہیے کہ اُن کی زندگی اور فلسفۂ زندگی کا جزو بن جائے -

اگر ہم ان صفات کے وسیع ترین معنی لیں تو ان میں وہ سب باتیں آجاتی ہیں جو ہم اپنے طلبہ کی سیرت میں پیدا کرنا چاہتے ہیں - لیکن الفاظ کو محض ذاتی رائے کی بنا پر اس قدر وسعت دینا مناسب نہیں کیونکہ ہر شخص کا مفہوم ذہنی مختلف ہوتا ہے اور اس وجہ سے ان کے مفہوم کے متعلق اتفاق رائے بہت مشکل ہو جائے گا اس لیے اس بحث کے خاتمے پر بہت اختصار کے ساتھ ہم اتنا اور بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی طلبہ کی سیرت کی تربیت میں تین امور کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے - تربیت جذبات کے ضمن میں ہم نے ہمدردی کی صفت پر بہت زور دیا ہے - لیکن اپنے ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں ہمدردی کے ساتھ ساتھ ایک اور جذبے کی تربیت کرنی چاہیے جس کا تعلق عقل اور جذبات دونوں سے ہے یعنی رواداری، دوسروں کے رائے اور خیالات اور جذبات کا اتنا ہی احترام کرنا جیسا ہم اپنے خیالات اور جذبات کا کرتے ہیں - رواداری کی ایک قسم تو وہ ہے جو آج کل کے تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا ہو رہی ہے، یعنی چونکہ اکثر معاملات میں وہ خود کوئی پختہ اصول و عقائد نہیں رکھتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک کسی اصول یا عقیدے کی کوئی خاص اہمیت نہیں، سبھی ایک سے ہیں - یہ حقیقی

رواداری نہیں - اس کو بےپروائی کہنا زیادہ مناسب ہوگا -
بعض لوگوں نے اس ذہنی روش کو جو تشکیک پر مبنی ہے
بہت وقعت دی ہے اور وہ اس کو روشن خیالی اور ذہنی
آزادی سمجھتے ہیں - لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کی
بےپروائی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے نقص پر دلالت کرتی ہے
اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے کوئی خاص معیار اخلاق
یا نظام اقدار قائم نہیں کیا اور اس کی زندگی کسی زبردست
اصول یا مقصد کے ساتھ وابستہ نہیں ہے - ہم جس رواداری
کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے منافی نہیں بلکہ
اس کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم
زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے خیالات اور عقائد رکھتے
ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں لیکن اصولاً اور عملاً دوسروں کے
اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مختلف
خیالات اور عقائد رکھیں - ہم اپنی رائے کا اظہار جوش اور
خلوص کے ساتھ کرتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنا ہم رائے
بنا لیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم بردباری اور خندہ پیشانی
سے اپنے مخالفوں کی رائے سننے کے لیے تیار رہیں اور اس
اختلاف رائے کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں کسی قسم
کی ناگواری پیدا نہیں ہوتی - مبادلۂ خیال، بحث و مباحثہ،
اختلاف رائے، علمی اور عقلی ترقی کی جان ہیں بشرطیکہ
ہمدردی اور رواداری کی فضا موجود ہو - ہمارے ملک کی
حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہے کہ ذرا سے اختلاف خیال کی وجہ
سے آپس کے لڑائی جھگڑے کا دروازہ کھل جاتا ہے جس میں
قومی عزت اور قوت کا خون ہوتا ہے - اختلاف خیال تو دور

کرنا تو نہ ممکن ہے نہ قرین مصلحت، اس لئے ہمیں رواداری کی صفت پیدا کرنی چاہیے تاکہ ذہنی اور معاشری زندگی میں امن و امان قائم رہے اور ترقی کی صورت نکلے۔

جس طرح رواداری کے بغیر ذہنی آزادی اور جرأت سے ناگوار نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے، اسی طرح لوگوں میں قوت عمل محنت، جد و جہد اور حوصلہ مندی کی نشو و نما بھی اندیشے سے خالی نہیں اگر اس کے ساتھ ہی امن پسندی، قناعت، اور مشاہدۂ نفس کی تربیت نہ کی جائے جو ہندوستانی تہذیب کی خصوصیات رہی ہیں۔ بے شک فوری ضروریات کی وجہ سے ہمیں فعالیت پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ لیکن ان کی خاطر ہم ان مستقل اور ابدی قدروں کو قربان نہیں کر سکتے جن کی آغوش میں پرورش پاکر انسانیت اوج کمال تک پہنچتی ہے۔ جو تعلیم اور تہذیب افراد میں رشک اور مسابقت کے جذبات کو فروغ دیتی ہے، اور دنیاوی جاہ و قوت کے لئے مجنونانہ جد و جہد کو ضروری سمجھتی ہے وہ انسانیت کے مرتبے کو بہت پست کر دیتی ہے۔ انسانی سیرت میں توازن اور سکون کی ضرورت ہے تاکہ انسان اپنی خودی کا اظہار محض خارجی اشیا کی طلب اور جستجو میں نہ کرے بلکہ ان خزانوں کو بھی ٹٹولے جو اس کی ذات میں پنہاں ہیں اور ان سے مستفید اور لطف اندوز ہو۔ حضرت اسلام، علی مرتضیٰ کے ایک شعر کا کسی شخص نے اردو ترجمہ کیا ہے جس میں انسان کی نفسی گہرائیوں اور روحانی خزانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:—

تیری دوا تجھ میں ہے تجھ کو خبر نہیں

تیرا مرض تجھی سے ہے تجھ کو نظر نہیں
جرم صغیر سمجھے ہے تو اپنے آپ کو
پوشیدہ تجھ میں عالم اکبر مگر نہیں

اِس " جرم صغیر " یعنی انسان کی ذات میں عالم اکبر کو تلاش کرنا اور اس کو پالینا تعلیم اور تہذیب کا منتہائے کمال ہے - لیکن جو لوگ ہر وقت خارجی مقاصد اور مادی منافع کی طلب میں مصروف رہتے ہیں انہیں اپنی تہذیب نفس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی - ادب اور فنون لطیفہ سے محظوظ ہونا ' فطرت کے خوبصورت مناظر سے لطف اور سکون قلب حاصل کرنا ' کبھی کبھی دنیاوی مکروہات اور جد و جہد سے پیچھا چھڑا کر اپنے نفس کی گہرائیوں کا مشاہدہ کرنا اور اپنی زندگی کا جائزہ لینا ' یہ تمام باتیں بھی انسانی شخصیت کی تکمیل کے لیے اسی طرح ضروری ہیں جس طرح قوت یا دولت کے لیے جد و جہد کرنا - جہاں حیات انسانی کے ارتقاء کے لیے عقل کی ضرورت ہے وہاں اس اعلیٰ تر قوت وجدان کی تربیت بھی لازم ہے جس پر مشرق کے ارباب فکر ہمیشہ سے اور مغرب میں برگسان اور اس کے ہمخیال آج کل زور دے رہے ہیں ' جس کے واسطے سے انسان کائنات اور خالق کائنات کی معرفت حاصل کرتا ہے - ہندوستان میں تعلیم کا جو نظریہ یا فلسفہ مرتب کیا جائے اس میں یہ پہلو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی ہندوستانی تہذیب کی امتیازی خصوصیت ہے -

مذہب اور مذہبیت کو نہ ڈیوئی نے واضح طور پر سیرت کے عناصر میں شمار کیا ہے نہ رسل نے - لیکن ہم ہندوستانی

اپنی سیرت کی تشکیل میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے ملک میں ہمیشہ سے تہذیب اور مذہب کا گہرا اور قریبی تعلق چلا آتا ہے - لہذا تعلیم کو ' جو افراد کے لیے تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے اور انہیں اس کا حامل بناتی ہے ' مذہب کی اہمیت کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے - یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہماری جدید تاریخ کے صفحات ان فتنوں اور خون ریزیوں کے بیان سے آلودہ ہیں جن کی ذمہ داری بظاہر مذہب یا اختلاف مذاہب پر عائد ہوتی ہے اور اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ جن کی نظر سطح سے گزر کر تہ تک نہیں پہنچتی ہے سرے سے مذہب ہی سے بددل ہوگئے ہیں اور انہیں اس المناک صورت حال کا علاج یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کو قطعاً ترک کر دیا جائے - لیکن ان کا خیال ایک بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس میں شکست پسندی کا رنگ جھلکتا ہے - حقیقت امر یہ ہے کہ مذہب کوئی خارجی لباس نہیں کہ اسے جب چاہیں پہن لیں جب چاہیں اُتار پھینکیں - جاپان کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں سے ایک کمیشن یورپ بھیجا گیا تھا کہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کر کے رپورٹ پیش کرے کہ جاپانی قوم کے لیے کون سا مذہب سب سے زیادہ موزوں ہوگا - اگر یہ قصہ صحیح ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ عجیب و غریب حرکت کی تھی ان کو مذہب کے مفہوم اور منشا سے مطلق واقفیت نہیں - مذہب محض چند رسوم اور عبادات کا نام نہیں جنہیں انسان سیکھ لے اور ادا کردیا کرے - وہ انسان کی روحانی فطرت کا مظہر ہے - اس

کی نہایت گہری اور شدید نفسی ضروریات کو پورا کرتا ہے، اس کی نظر کو عارضی اور وقتی چیزوں سے ہٹا کر دائمی اور ابدی حقائق سے روشناس کرتا ہے اور اس کے اور خالق کائنات کے درمیان وہ تعلق قائم کرتا ہے جو اس کی شخصیت کی تکمیل کے لیے لازمی ہے - اگر مذہب ایک بے معنی لفظ ہو، اگر روح اور خدا کا تصور انسانی دماغ کے توہمات کا نتیجہ ہو اور انسان بھی مثل اور کیمیاوی مرکبات کے محض کیمیاوی اور طبعی مادوں اور قوتوں کا مجموعہ ہو تو انسانی زندگی کی حقیقی اور ابدی اہمیت باقی نہیں رہتی - یہ ممکن ہے کہ بعض اشخاص باوجود لامذہب ہونے کے اپنے معاشری احساس اور عقل کی بدولت اعلیٰ تمدنی اور اخلاقی اصولوں کی پیروی کریں لیکن عام لوگوں کے لیے اس بات کا امکان بہت کم ہے - کیونکہ عقل اور اخلاق کے اصول خشک اور مجرد ہوتے ہیں ان میں وہ کشش اور تاثیر نہیں جو مذہبی عقائد میں ہوتی ہے - علاوہ بریں مذہب کا دائرہ اخلاق کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے اور اس میں ایسے تجربات اور مسائل بھی آجاتے ہیں جن کا موضوع افراد کے باہمی تعلقات نہیں ہیں بلکہ ہر فرد کی اپنی روحانی زندگی ہے - جو شخص مذہب کے اثر سے بالکل محروم رہتا ہے اس کے شخصی ارتقا کا یہ پہلو بالکل معطل رہے گا -

ظاہر ہے کہ مذہب ان چیزوں میں سے ہے جو سکھائی نہیں جاسکتیں - جہاں تک سرکاری مدرسوں کا تعلق ہے ان کے لیے یہ بات نہ تو ممکن ہے نہ مناسب ہے، کہ وہ اپنے طلبہ کے لیے ہر مذہب کے عقائد و عبادات کی تعلیم کا انتظام کریں - یہ فرض طلبہ کے والدین اور مذہبی جماعتوں پر عائد ہوتا ہے

کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے مخصوص عقائد کی تعلیم دیں - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدرسہ مذہبی تربیت کے فرض سے بالکل سبکدوش سمجھا جائے - مذہبیت کا جذبہ ایک عام احساس ہے جو مختلف مذاہب میں مشترک ہے - اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں - مثلاً ایک سچے مذہبی آدمی کو روحانی قدروں کا احساس ہوتا ہے اور یہ یقین کہ انسان کی شخصیت ' دنیاوی زندگی کا چراغ گل ہو جانے ' سے فنا نہیں ہوتی بلکہ روحانی ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہتی ہے ' اس کے دل میں زندگی کا گہرا احترام ہوتا ہے خواہ اس کا جلوہ انسانوں میں نظر آئے یا حیوانوں میں یا مناظر فطرت میں ' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ زندگی وہ عطیۂ الٰہی ہے جس کا بدل دنیا کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی - اسی وجہ سے اس کے دل میں رواداری اور ہمدردی کا وہ حقیقی جذبہ ہوتا ہے جو اتحاد اغراض مقاصد پر نہیں بلکہ احساس نوعی پر مبنی ہے - مگر جہاں وہ انسانی شخصیت کی عزت کرتا ہے وہاں یہ بھی جانتا ہے کائنات کے مقابلے میں انسان کی ہستی بہت چھوٹی ہے اور اس کی علمی ترقی اور تسخیر فطرت کے زبردست کارناموں کے باوجود اس کا علم اور قوت بہت محدود ہے - یہ خیال اس کے دل میں سچا عجز اور انکسار پیدا کرتا ہے جس کی تقاضت یہ ہے کہ اس کے قوائے عمل کو معطل نہیں کر دیتا بلکہ اس کو جد و جہد کی دعوت دیتا ہے ' نیوٹن (Newton) جیسے زبردست سائنس داں کا یہ قول کہ اس کے علم کی مثال سائنس کے بحر زخار کے سامنے ایسی ہے جیسے کوئی بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے

کہاں رہا ہو، حقیقی مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ تعلیم کو مذہب کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے اور مذہبی جذبے کی تربیت میں حصہ لینا چاہیے تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معلم کو طلبہ میں قدروں کا احساس احترام حیات، رواداری و ہمدردی، عزت نفس، اور حقیقی انکسار کے جذبے پیدا کرنے چاہییں۔ یہاں مذہبی تربیت کے انتظام اور طریقوں سے بحث کرنے کا موقع نہیں اور نہ اس کی گنجائش ہے۔ لیکن ہم اب تک جن تعلیمی اصولوں سے بحث کرچکے ہیں ان پر غور کرنے سے اس کے متعلق بھی بعض اہم نتائج نکل سکتے ہیں مثلاً یہ کہ مذہبی تربیت کے لیے سب سے زیادہ اہم اور اثر آفریں عنصر معلم کی شخصیت ہے جو براہ راست طلبہ کی شخصیت اور نظام اقدار کی تشکیل کرتی ہے۔ اور اس کے بعد مدرسوں میں معاشری اور اخلاقی زندگی کی تنظیم، مختلف مذاہب کے خیالات کا بےتعصبانہ مطالعہ، طلبہ کے دل میں عالم فطرت کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا کرنا، فنون لطیفہ کے ذریعے ان کے وجدان کو نشو و نما دینا، ان کے لیے اپنے بنی نوع کی خدمت کے مواقع فراہم کرنا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو مناسب طریقے پر استعمال کیا جائے تو وہ مذہبی تربیت میں معین ہو سکتی ہیں۔

موجودہ ہندوستانی تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ مذہب سے بالکل بےتعلق ہوگئی ہے اور طلبہ میں مذہبی روح کو پیدا نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے عوام کو کبھی اس سے سچی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ خواہ وہ بظاہر مذہب کی طرف سے

بےپرواہ ہوں اور اِس کے احکام پر عمل نہ کریں لیکن اُن کے قلب کی گہرائیوں میں مذہب کا احترام موجود ہے اور وہ کسی ایسے نظام تعلیم کی دل سے قدر نہیں کرسکتے جو اُن کو محض حصول معاش میں مدد دے اور اس سے زیادہ اِس کا کوئی مصرف نہ ہو - ممکن ہے بادی النظر میں یہ رائے صحیح نہ معلوم ہو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل والدین باوجود ہر قسم کی مالی دقتوں کے اپنی اولاد کو یہی مغربی تعلیم دلا رہے ہیں اور اِس کے لیے اپنی ذات پر ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ وہ اس تعلیم سے مطمئن ہیں - وہ اس کو واسطہ یا ذریعہ سمجھتے ہیں کوئی قدر مستقل نہیں مانتے - اس کے مقابلے میں ان کے دل میں اس پرانے نظام تعلیم کی زیادہ قدر ہے جو بہت تنگ اور محدود تھا لیکن کم سے کم اس میں مذہبی تربیت پر زور دیا جاتا تھا - چنانچہ ابتدا میں تنگ خیال مذہبی پیشواؤں نے مغربی تعلیم کو بالکل ہی ناجائز قرار دے دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ضروریات زمانہ سے مجبور ہوکر لوگوں نے اس کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ اب وہ اُس کے حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہیں - لیکن جب تک اِس تعلیم کا رشتہ مذہب کے ساتھ نہ جوڑا جائے گا اس کا اثر سطحی اور محدود ہوگا یعنی زیادہ سے زیادہ اس سے علم اور واقفیت میں اضافہ ہوگا، تمدنی زندگی کے ظاہری پہلو کی تھوڑی بہت اصلاح ہوگی لیکن ہمارے جذبات اور عقائد کی دنیا اور ہماری شخصی اور قومی تہذیب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہوسکتا اور زندگی کے اہم اور اعلی مقاصد کے حصول میں یہ

ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتی ۔ لہذا ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہے کہ وہ اس پورے مسئلے پر احتیاط کے ساتھ غور کریں اور ایسے ذرائع اختیار کریں کہ مغربی تعلیم کے قابل قدر عناصر، یعنی سائنس اور صنعت و حرفت اور معاشری علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ان مذہبی قدروں کا احترام بھی پیدا ہو جو مذہبی تہذیب کی روح رواں سمجھی جاتی ہیں ۔ ہندوستانیوں کے فرقہ وارانہ اختلافات نے نہ صرف ان کی قومی عزت اور سیاسی وقار کو خاک میں ملا دیا ہے بلکہ خود مذہب کے رخ روشن کو گرد آلودہ کر دیا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں بہت سے سمجھدار اور تعلیم یافتہ لوگوں کا دل اس کی طرف سے پھیر دیا ہے ۔ لیکن ہمارا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ ان اختلافات کی اصلی وجہ مذہب نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی اغراض ہیں جن کو بعض بےہمت اور خودپرست لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مذہبی رنگ دے دیا ہے اور وہ عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے اپنا کام نکالتے ہیں ۔ یہ بیچارے اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے اور آسانی سے ان لوگوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں ۔ وہ اپنے نزدیک مذہب کی حمایت میں جانی اور مالی نقصان اٹھاتے ہیں جس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کو مذہب سے دلی محبت ہے خواہ وہ اس کا اظہار اپنی غایت ناشناسی کی وجہ سے غلط طریقے پر کریں ۔ اس صورت حال کی اصلاح کی ذمہ داری صرف معلموں ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ملک کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کرے ۔ یہ کام آسان نہیں ہے

کیونکہ اس میں انہیں ہر قسم کے ارباب غرض کے خلاف، جنگ کرنی پڑے گی، عوام کے توہمات اور تعصبات کو رفع کرنا ہوگا اور مخالفتوں کے اصلی اسباب کو دور کرنے کے طریقے سوچنے پڑیں گے - ان سیاسی اور اقتصادی اختلافات کی اہمیت کو گھٹا کر دکھانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا - ہمیں صاف صاف اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مختلف فرقوں کے مطالبات کو ہم آہنگ کرنا ایک بہت کٹھن کام ہے جس کے لیے نہ صرف قانونی فیصلے اور آئینی تصفیے کی ضرورت ہے بلکہ لوگوں کی ذہنیت کو بدلنا ہے اور انہیں یہ احساس دلانا ہے کہ ان کے باہمی اختلافات چھوٹے اور عارضی ہیں اور ان عظیم‌الشان مقاصد کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے جو سب فرقوں میں مشترک ہیں - اور ان عارضی اختلافات کی خاطر مستقل مفاد اور مقاصد کو قربان کر دینا دانشمندی کے خلاف ہے - اگر مدرسے کی تعلیم نوجوان طلبہ میں ہمدردی، رواداری اور احترام حیات کے جذبات پیدا کرے، جو مذہبی سیرت کے اہم اجزا ہیں، تو وہ ان اختلافی مسائل کے حل کرنے میں بھی معقولیت، شائستگی اور حسن مراعات کو ہاتھ سے نہ دیں گے، بحث و مباحثے میں وہ تلخی اور ناگواری پیدا نہیں ہوگی جو ہماری موجودہ سیاسی زندگی کا جزو لازم ہو گئی ہے - اس طریقے پر مذہبی تعلیم دینے سے نہ صرف مذہب کے دامن سے یہ شرمناک دھبا دھل جائے گا، بلکہ یہ تعلیم ہمارے ملکی اور سیاسی معاملات کے سلجھانے میں بھی بہت مدد دے گی اور لوگوں میں فصل پیدا کرنے کے بجائے وصل کا جاں‌فزا پیغام سنائے گی -

اصول تعلیم

مفصل فہرست مطالب

(باعتبار حروف تہجی)

ن

فہرست کتب

(مصنفوں اور کتابوں کی فہرست جن کے حوالے
اس کتاب میں دیے گئے ہیں - صفحوں
کے نمبر مقابل میں درج ہیں)

فہرست مصطلحات

ذیل میں اُن اصطلاحوں کی فہرست دی جاتی ہے جو کتاب میں استعمال کی گئی ہیں۔ بہت اصطلاحوں کے متعلق اتفاق رائے نہیں ہے اس لئے کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آسان اور قابل فہم منتخب کی جائیں :—

Concentration of Studies — اجتماع مطالعہ

Social Efficiency — اجتماعی افادہ

Impressions — ارتسامات

Tests — آزمائشیں

Communist — اشتمالی

Utilitarian — افادی، افادیت پسند

Values — اقدار

Passive — انفعالی

Individuality — انفرادیت

Transfer of Training — انتقال قوت اکتسابی

Informal Education — بے ضابطہ تعلیم

stige Suggestion — تاثیر تشویق

gestion — تاثیر خیال

choanalysis — تحلیل نفسی

ticism — تشکیک

alization of Education — تعلیم کی معاشری تنظیم

inuation Education — تعلیم مزید

tive — تخلیقی

harsis — تنقیہ

inct — جبلت

elation of Studies — ربط مضامین نصاب

ulse — رجحان

nal — صوری

Civics مدنیات
Motives محرکات
Occupations مشاغل
Pragmatism مصرف پسندی
Project Method منصوبی طریقہ
Faculty Psychology نفسیات انشعابی
Structural Psychology نفسیات ترکیبی
Federal Government وفاقی حکومت
Heuristic Method طریقۂ دریافت
Amateur عطائی
Will-to-power عزم للقوۃ
Scientific Method علمی طریقہ
Social عمرانی، معاشری
Idealism عین پسندی
Active, Activity فعالی، فعالیت
Efficiency کارکردگی
Dynamic متحرک، حرکی
Environment ماحول